سیدنا عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ

تاریخ کی روشنی میں

حکیم محمود احمد ظفر

Marfat.com

سیدنا عمر بن عبدالعزیز

تاریخ کی روشنی میں

حکیم محمود احمد ظفر

تخلیقات

علی پلازہ، 3 مزنگ روڈ، لاہور، فون نمبر: 042-7238014
Web Site: http://www.takhleeqat.com
E-mail: takhleeqat@yahoo.com

Marfat.com

جملہ حقوق محفوظ ہیں

نام کتاب: سیدنا عمر بن عبدالعزیزؒ تاریخ کی روشنی میں

ناشر: تخلیقات' لاہور

اہتمام: لیاقت علی

تاریخ اشاعت: 2005ء

ٹائٹل: آغا نثار

پرنٹر: اُجالا' پرنٹرز' لاہور

کمپوزنگ: عزیز کمپوزنگ سنٹر' لاہور

ضخامت: 288 صفحات

قیمت: 150 روپے

Marfat.com

انتساب

خلیفہ ثانی امیر المومنین

سیدنا عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ

کے نام

جن کی اولاد میں

سیدنا عمر بن عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہ

جیسے جلیل القدر حکمران پیدا ہوئے

Marfat.com

فہرست مضامین

پیش لفظ	11
عمر بن عبدالعزیزؒ	17
خاندان قریش	17
قریش کی شاخیں	18
بنوامیہ	20
بنوامیہ اور تجارت	21
بنوامیہ مخالفت اور موافقت کے روپ میں	22
نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور بنوامیہ	25
بنو ہاشم کا قبول اسلام	27
بنوامیہ کا قبول اسلام	29
بنوامیہ اور بنو ہاشم کا تقابلی جائزہ	36
سیاسی نظام میں بنوامیہ کا مقام	37
عہد صدیقی اور بنوامیہ	41
عہد فاروقی اور بنوامیہ	44
عہد عثمانی اور بنوامیہ	45
مروان بن الحکمؓ	45
فاروق اعظمؓ سے تعلق	50
مزاج کی حدت اولاد میں	51
بنو ہلال کی پاکباز دوشیزہ سے شادی	53

Marfat.com

عبدالعزیز بن مروانؒ	55
عمر بن عبدالعزیزؒ	58
نام ونسب	58
پیدائش	58
فاروق اعظمؓ کے خواب کی تعبیر	61
تحصیل علم	64
مدینہ کی گورنری	67
مسجد نبوی کی تعمیر نو	71
روضہ نبوی کی مرمت	75
دیگر مساجد کی تعمیر	76
کنوؤں اور راستوں کی تعمیر	76
ولید بن عبدالملک کا حج کے لیے آنا	76
گورنری سے معزولی	81
عمر بن عبدالعزیز دمشق کی راہ پر	82
ایک مہینہ کی مدت میں دو ظالموں کی موت	89
ولید کی موت	90
سلیمان بن عبدالملک کے مزاج میں اثر ورسوخ	91
خلافت	94
سلیمان کی تجہیز وتکفین	102
خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کا احیاء	103
اموی خلافت کی کوتاہیاں	104
۱- غصب شدہ اموال کی واپسی	110
۲- فدک کا فیصلہ	114
فدک کیا ہے؟	114
آمدم برسر مطلب	123

خاندان کی برہمی	125
۵-ظالم افسروں کا تدارک	134
ظلم وجور کا انسداد	136
۷-بیت المال کی اصلاح	139
۸-قومی خزانہ کی حفاظت	145
۹-بیت المال کے مصارف	146
۱۰-غیر مسلموں سے برتاؤ	162
بیت المال کے محاصل میں اضافہ	171
۹-عوامی خدمات	173
۱۱-رفاہ عام کے کام	176
۱۲-دینی خدمات	179
مسجد دمشق' الجامع الاموی	181
۱۳-اشاعت اسلام	186
آپ خلافت کو شورائی بنانا چاہتے تھے	189
جمہوریت ایک خلاف اسلام نظریہ ہے	189
شورائیت کے اقدامات اور بے بسی	193
ملوکیت کے امتیازات کا خاتمہ	194
۱۴-عدالت اور قضاء	200
عمر بن عبدالعزیز قاضیوں کو خود چنتے تھے	203
قاضیوں کی رشوت سے حفاظت	212
فتوحات	221
فاروقی خلافت کا احیاء	225
علالت و وفات	230
ازواج و اولاد	237
صورت و سیرت	243

Marfat.com

فضل وکمال	247
۱۵- تفسیر وحدیث	248
۱۶- تدوین حدیث	249
تدوین حدیث کی ابتدائی صورت	251
فقہ	254
شاعری	254
خطابت	255
علماء کی قدرافزائی	257
ذاتی حالات	262
خوف آخرت	264
موت اور قبر	267
توکل	272
دیانت وامانت	273
تکبر	278
ایک عام مغالطہ اور اس کا جواب	279

Marfat.com

پیش لفظ

اسلام کی تاریخ بڑی تابناک تاریخ ہے اور دنیا میں کسی قوم کی تاریخ ایسی نہیں ہے جیسی کہ مسلمانوں کی تاریخ ہے، خصوصی طور پر صحابہ کرامؓ کے زمانہ کی تاریخ کیونکہ حدیث میں اس کو بہترین زمانہ کہا گیا ہے۔ (مسلم جلد۲ ص ۳۰۹، ترمذی جلد۲ ص ۴۵) اور اس زمانہ کے لوگوں کو بہترین لوگ کہا گیا۔ (مسلم جلد۲ ص ۳۱۰) چنانچہ امام نوویؒ قرون ثلاثہ کی شرح کرتے ہوئے لکھے ہیں:

"صحیح بات یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ کا سب سے بہتر زمانہ ہے، دوسرا تابعین کا اور تبع تابعین کا"۔

(نووی شرح مسلم جلد۲ ص ۳۰۹)

شیخ الاسلام ابن حجرؒ نے بھی لکھا ہے کہ: "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قرن سے مراد صحابہ کرامؓ کا زمانہ ہے۔" (فتح الباری جلد۱ ص ۴۴) اس زمانہ کے بہتر ہونے کی وجہ شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہؒ نے یہ بیان کی:

"ان تینوں دوروں میں بہترین دور ان لوگوں کا ہے جن کی نگاہوں نے نبوت کے جمال آراء کا بحالت ایمان مشاہدہ کیا ہے۔ یہی لوگ حق و باطل میں فرق کو سب سے اچھا جاننے والے، حق کے سب سے زیادہ ماننے والے، حق کے سب سے زیادہ شیدا و فریفتہ' باطل کے سب سے زیادہ بیری و دشمن اور حق کی خاطر سب سے زیادہ جان کھپانے والے ہیں۔ بعد میں آنے والوں کے مقابلہ میں علم و دیانت، سرفروشی و حق آشنائی، حق پذیری اور حق کی خاطر مصائب کے استقبال میں سب سے پیش پیش ہیں"۔ (النبوات ص ۸۵)

نواب صدیق حسن خانؒ فرماتے ہیں:

"یہی (صحابہ کرامؓ) صدر اول اور سلف صالح ہیں۔ ان ہی کو ہر موضوع پر بطور دلیل پیش کیا جا سکتا ہے، ان ہی پر دین کی زندگی میں اعتماد کیا جا سکتا ہے۔ دینی زندگی کے سارے احوال، اعمال، اخلاق اور احکام میں یہی لوگ سند کی حیثیت رکھتے ہیں۔ (الحطہ ص ۲۲)

اس حدیث کی رو سے صحابہ کرامؓ کا زمانہ سب سے بہترین زمانہ تھا اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو اپنا زمانہ قرار دیا ہے اور صحابہ میں سب سے آخری صحابی ابوالطفیلؓ نے جو جنگ احد کے روز پیدا ہوئے تھے، ۱۱۰ھ میں اس دار فانی سے عالم جاودانی کو رحلت فرمائی۔

صحابہ کرامؓ کے اس دور میں پانچ صحابہ کرامؓ یعنی سیدنا ابوبکرؓ، سیدنا عمرؓ، سیدنا عثمانؓ، سیدنا علیؓ اور سیدنا معاویہؓ کے عہد ہائے خلافت پر ضخیم کتابیں لکھیں جو طباعت کی منازل طے کر کے منصۂ شہود پر آ چکی ہیں اور اہل علم کے ہاں شرف قبولیت حاصل کر چکی ہیں۔ یہ وہ لوگ تھے جن کو قرآن حکیم نے "اولئک هم الراشدون" کے معزز لقب سے یاد کیا اور یہ وہی لوگ ہیں جن کے بارہ میں سیدنا عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں:

"جو شخص اقتدا کرنی چاہتا ہے اسے اصحاب رسول کی اقتدا کرنی چاہیے کیونکہ یہ حضرات ساری امت سے زیادہ اپنے قلوب کے اعتبار سے پاک، علم کے لحاظ سے گہرے، تکلف سے الگ تھلگ، عادات کے لحاظ سے معقول اور حالات کے لحاظ سے سب سے بہتر ہیں۔ یہ وہ قوم ہے کہ اللہ جل شانہ نے ان کو اپنے نبی کی صحبت اور دین کی اقامت کے لیے پسند فرمایا، لہذا تم ان کی قدر پہچانو اور ان کے قدموں کے آثار کی اتباع کرو، کیونکہ یہی لوگ سیدھے راستہ پر ہیں"۔

(شرح عقیدہ سفاریہ جلد ۳ ص ۲۸۰، اعلام الموقعین جلد ۴ ص ۱۳۹)

انہی لوگوں کی بزرگی اور مرتبت کو عشرہ مبشرہ کے صحابی سیدنا سعید بن زیدؓ نے ان الفاظ میں بیان فرمایا:

"بخدا! صحابہ کرامؓ میں سے کسی شخص کا جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کسی جنگ میں شریک ہونا جس میں اس کا چہرہ غبار آلود ہو جائے، غیر صحابہ

سے ہر شخص کی ساری عمر کی عبادت اور عمل سے بہتر ہے اگرچہ اس کو عمر نوح عطا ہو جائے"۔ (جمع الفوائد جلد۲ ص۴۹۲)

صحابہ کرامؓ کے زمانہ کے بعد تابعین کا زمانہ ہے۔ خلافت کا یہ سلسلہ ان کے زمانہ میں بھی چلا لیکن دور نبوت سے جوں جوں زمانہ دور ہوتا گیا، نیکی اور تقویٰ کے وہ آثار کم ہوتے گئے جو صحابہؓ کے زمانہ میں تھے۔ لیکن اس زمانہ کے بارہ میں بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث میں فرمایا: لایزال ھذالا مر عزیزاً الیٰ اثنی عشر خلیفة (مسلم جلد۲ ص۱۱۹، فتح الباری جلد۲ ص۱۷۹)

"اسلام بارہ خلفاء کے زمانہ تک برابر عزت والا رہے گا۔"

ایک روایت میں یہ الفاظ بھی منقول ہیں:

لایزال امرامتی صالحاً (فتح الباری جلد۲ ص۱۸۰)

"میری امت کے معاملات بہتر رہیں گے۔"

یہ بارہ خلفاء جن کے بارہ میں حدیث میں اشارہ کیا گیا ہے، علمائے اسلام نے ان کی تعیین کرتے ہوئے بتایا ہے کہ:

"بارہ خلفاء سے مراد سیدنا ابوبکرؓ، سیدنا عمرؓ، سیدنا عثمانؓ، سیدنا علیؓ، سیدنا معاویہؓ، یزید بن معاویہ، عبدالملک بن مروان، ولید بن عبدالملک، سلیمان بن عبدالملک، یزید بن عبدالملک، ہشام بن عبدالملک اور عمر بن عبدالعزیزؒ ہیں"۔

(شرح فقہ اکبر ص۱۸۴، شرح عقیدہ الطحاویہ ص۵۵۳، فتح الباری جلد۳ ص۱۸۲)

خلافت کے اس صحیح نظام کے زمانہ کی ایک روایت میں تعیین بھی فرمادی گئی جس کے راوی سیدنا عبداللہ بن مسعودؓ ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"اسلام کی چکی پینتیس یا چھتیس یا سینتیس سال کے بعد بند ہو جائے گی۔ پھر اگر لوگ ہلاک ہوں تو ان کا بھی وہی راستہ ہے جو اور ہلاک ہونے والوں کا ہے اور اگر ان کا دین ان کے لیے قائم رہ گیا تو ستر برس تک قائم رہے گا۔ سیدنا عمرؓ نے پوچھا: "یا رسول اللہ! گذشتہ زمانہ ملا کر ستر برس یا صرف آئندہ کے ستر برس۔ آپؐ نے فرمایا صرف آئندہ کے۔"

(ازالۃ الخفاء جلد۱ ص۲۶۷، فتح الباری جلد۳ ص۱۸۱)

Marfat.com

اس حدیث کی شرح میں حکیم الامت شاہ ولی اللہ قدس سرہ فرماتے ہیں:

''اس حدیث کا مضمون خارج میں ظاہر ہوا کیونکہ ۳۵ ھ میں سیدنا عثمانؓ شہید ہوئے اور جہاد کا انتظام بگڑ گیا۔ پھر سیدنا معاویہ بن ابی سفیانؓ کے زمانہ میں جہاد کا انتظام قائم ہوا اور اس تاریخ سے ۷۰ برس کے بعد بنوامیہ کی سلطنت ختم ہوئی''۔ (ازالۃ الخفاء جلد ا ص ۲۶۷)

ان بارہ خلفاء میں سے سب سے آخری خلیفہ سیدنا عمر بن عبدالعزیزؒ تھے۔ مدتوں سے خواہش تھی کہ ان کے بارہ میں بھی ایک کتاب لکھی جائے کیونکہ انہوں نے ان تمام خرابیوں کی اپنی شبانہ روز کوششوں سے اصلاح فرمائی جو عہد نبوت سے دوری کی وجہ سے خلافت میں پیدا ہو گئی تھیں اور خلافت کو پھر اسی طرح منہاج نبوت پر چلایا جس طرح سیدنا ابوبکرؓ اور سیدنا عمرؓ کے عہد خلافت میں تھی۔ یہ ان کا ایک مجددانہ کارنامہ بھی ہے، اسی وجہ سے ان کو پہلی صدی کا مجدد بھی کہا گیا ہے۔ وہ اپنے علم و عمل کے لحاظ سے بھی ایک خلیفہ راشد تھے۔ چنانچہ امام ذہبیؒ نے ان کے بارہ میں لکھا ہے: ''وہ اپنی خلقت اور اخلاق کے لحاظ سے حسین، کامل العقل، صفات کے لحاظ سے عمدہ، جیدالسیاست، ہر ممکن طریق سے عدل پر حریص، وافرالعلم، فقیہ النفس، ظاہر الذکاء والفہم، اواہاً منیباً، قانتاً للہ، باوجود خلیفہ ہونے کے زاہد وعابد، حق بات کہنے والے اور ہر قسم کی شہادت اور سعادت انہیں حاصل ہوئی اور آخر میں فرمایا:

''وعد عنداھل لعلم من الخلفاء الراشدین والعلماء العاملین''

(سیر اعلام النبلاء جلد ۵ ص ۱۲۰)

اور اہل علم کے نزدیک یہ خلفائے راشدین میں سے شمار ہوتے تھے اور ان علماء میں سے سمجھے جاتے تھے جو مجسم عمل تھے۔

امام ذہبیؒ نے ہی ایک شخص کا یہ قول نقل کیا ہے کہ اس نے ایک مرتبہ آپ سے کہا: ''اے امیرالمومنین! آپ سے پہلے جو خلفاء گذرے خلافت ان کے لیے باعث زینت اور آپ خلافت کے لیے باعث زینت ہیں''۔ (سیر اعلام النبلاء جلد ۵ ص ۱۳۶)

ان کے حالات زندگی اس وجہ سے بھی لکھنے ضروری تھے کیونکہ اس میں امت کے لیے بہت اسباق ہیں کہ باوجود جوانی اور شباب کے انہوں نے اپنے دن خدمت خلق میں

Marfat.com

اور اپنی راتیں اللہ کی عبادت میں گذار دیں اور حالات کی بادمخالف کی تندی کے باوجود سلطنت کے امیج (Image) کو اس مقام پر پہنچا دیا جس سے نہ صرف مسلمان بلکہ غیر مسلم بھی خوش اور راحت وآرام کا سانس لیتے تھے اور انہیں سیدنا عمر فاروقؓ کا زمانہ یاد آتا تھا جب شیر اور بکری ایک گھاٹ پر پانی پیتے تھے اور غریب سے غریب اور مظلوم سے مظلوم آدمی کو بھی گھر بیٹھے انصاف ملتا تھا۔ انہوں نے اپنے اہل وعیال کو بھوکا رکھ کر دوسروں کو سیر ہو کر کھلایا۔ خود پیوند زدہ کپڑے پہن کر دوسروں کو نئے کپڑے پہنائے، مظلوم کی دادرسی کی اور ظالم کا ہاتھ پکڑا، لوگوں کو زہد وقناعت کا سبق دیا اور اڑھائی برس کی قلیل مدت میں سلطنت کی بنیادیں مستحکم کیں۔ افسوس کہ ان کے بعد والوں نے اپنی غلط کاریوں سے ان بنیادوں کو ہلا دیا اس میں کچھ اسلام دشمن قوتوں کا بھی قصور تھا۔

بہرحال انہوں نے جو اصلاحات کیں اور جو تجدیدی کارنامے سرانجام دیئے اور اسلامی معاشرت اور اسلامی سیاست کو جن بنیادوں پر استوار کیا، ان پر تاریخ کی مستند کتابوں سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ امید ہے کہ قارئین کرام اس کتاب کو پڑھ کر اسلام کے اس بطل جلیل اور خلیفہ راشد کے حالات زندگی سے پوری طرح آشنائی حاصل کریں گے۔

نیاز آگین

حکیم محمود احمد ظفر۔ سیالکوٹ

۱۴ اگست ۲۰۰۲ء

Marfat.com

Marfat.com

سیدنا عمر بن عبدالعزیزؒ

خاندان قریش

امیرالمومنین سیدنا عمر بن عبدالعزیزؒ کا تعلق قریش کی شاخ بنوامیہ سے تھا۔ خاندان قریش عرب کا ایک معزز ترین خاندان تھا اور اللہ تعالیٰ نے بھی اس خاندان کو چن لیا تھا۔ جیسا کہ مسلم اور ترمذی میں حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"اللہ تعالیٰ نے اولاد ابراہیم سے اسماعیل کو چنا، اور اولاد اسماعیل سے کنانہ کو چنا اور بنی کنانہ سے قریش کو چنا"۔

یہ خاندان اپنی طاقت اور قوت میں اپنی مثال آپ تھا۔ اس خاندان کا نام بھی اس کی شجاعت، بہادری اور عزت واحترام کی خاطر ہی قریش رکھا گیا تھا۔ کیونکہ قریش ایک سمندری جانور کو کہتے ہیں جو اپنی قوت وطاقت کی وجہ سے سمندر کے دوسرے سب جانوروں پر غالب رہتا ہے اور ہر جانور پر اس کو مکمل اختیار حاصل ہوتا ہے۔ جس کو چاہتا ہے فنا کے گھاٹ اُتار دیتا ہے جس کو چاہتا ہے ہڑپ کر جاتا ہے اور جس کو چاہتا ہے اپنا دل بہلانے کے لیے رکھ چھوڑتا ہے۔ وہ سب پر غالب وحاکم ہوتا ہے لیکن اس پر کوئی غالب نہیں آسکتا۔ چنانچہ ایک مرتبہ سیدنا عبداللہ بن عباسؓ سیدنا معاویہؓ کے پاس تشریف لے گئے۔ سیدنا عمرو بن العاصؓ بھی وہاں موجود تھے۔ سیدنا عمرو بن العاصؓ اپنے علم وفضل اور کمالات ومحاسن کی وجہ سے ایک خاص مقام کے حامل تھے۔ باتوں باتوں میں انہوں نے سیدنا

Marfat.com

عبداللہ بن عباسؓ سے کہا کہ قریش کا گمان ہے کہ قریش میں تم سے بڑا کوئی عالم نہیں۔ بھلا قریش کی وجہ تسمیہ بیان کرو۔ اس پر سیدنا عبداللہ بن عباسؓ نے قریش کی وجہ تسمیہ یہی بیان فرمائی جو اُوپر بیان کی گئی ہے اور ساتھ ہی مندرجہ ذیل اشعار بطور دلیل پڑھے۔ فرمایا کہ شمرخ" بن عمرو حمیری کہتا ہے:

وَقریش ھی التی تسکن البحر بھا سمیت قریش قریشا
فاکل الغث والسمین ولاتترک لذی الجاحین ریشا
ھکذانی البلادحی قریش یاکلون البلاد اکلا کمیشا

(فتح الباری جلد ۶ ص ۴۱۶)

"یعنی قریش دراصل ایک جانور ہے جو سمندر میں رہتا ہے اسی کے نام پر قریش کا نام قریش رکھا گیا ہے۔ وہ جانور دبلے پتلے، طاقتور اور موٹے جانوروں کو اس طرح چٹ کر جاتا ہے کہ ان کے پر تک نہیں چھوڑتا۔ اسی طرح یہ قبیلہ قریش مختلف شہروں کو نہایت تیزی سے کھا جاتا ہے۔"

شیخ محی الدین ابن عربیؒ نے لکھا ہے کہ قریش ایک بحری جانور ہے۔ میں نے اس کو خود دیکھا ہے۔ اس کا بدن باہم ایک دوسرے کے ساتھ گٹھا ہوا ہوتا ہے۔ نیز فرماتے ہیں کہ اہل مکہ نے اپنی اجتماعی زندگی کی جو تنظیم کی تھی وہ سمٹ کر ایک نکتہ اور اکائی پر مرکوز تھی اسی وجہ سے اس اجتماعی تنظیم کا نام قریش رکھا گیا۔ (فتوحات مکیہ جلد ۳ ص ۱۰۶)

قریش کی شاخیں

اس خاندان کی چھوٹی بڑی دس شاخیں تھی لیکن بنو ہاشم اور بنو امیہ ان سب میں سے دنیوی عظمت اور وجاہت کے لحاظ سے بہت ممتاز تھے۔ ہاشم بہت سخی اور بامروت انسان تھے۔ سارے عرب میں ان کی سخاوت اور داد و دہش زبان زد عوام تھی۔ ہاشم کا نام عمرو یا عمر تھا۔ ہاشم اور ان کے بھائیوں کو "المجیر ون" یعنی پناہ دینے والے کہا جاتا تھا۔ کیونکہ یہ لوگ اپنی سخاوت اور سیادت کے باعث سارے عرب کے لیے بہترین پناہ گاہ ہے۔

ایک دفعہ قحط سالی کے باعث لوگوں کو شدید فاقہ کشی کی نوبت آ گئی اور انہیں کئی کئی روز تک کھانے کے لیے کچھ میسر نہ آتا تھا۔ لوگوں کی اس حالت کو دیکھ کر ہاشم مکہ سے

Marfat.com

شام گئے وہاں سے آٹا اور گندم خریدی اور حج کے ایام میں اس غلہ کو لے کر مکہ واپس آئے۔ روٹیاں پکائی گئیں۔ اونٹ ذبح کئے گئے اور ان کے گوشت کو پکا کر اس کے شوربے میں روٹیاں کوٹ کوٹ کر ڈالی گئیں اور ان کا ثرید بنایا گیا اور تمام لوگوں کو دسترخوان بچھا کر وہ ثرید کھلایا گیا جو لوگوں نے خوب سیر ہو کر کھایا۔ اس وجہ سے ان کا نام ''ہاشم'' پڑ گیا کیونکہ ہاشم کے معنی ہیں روٹیاں توڑ توڑ کر شوربے میں ملانے والا۔

آپ کو لوگ ''سید البطحاء'' بھی کہتے تھے۔ چنانچہ ان کی انہی اوصاف حمیدہ کی وجہ سے شعراء عرب نے ان کی مدح سرائی میں خوب طبع آزمائی کی ہے۔ بلوغ الارب جلد ۲ ص ۲۸۳ میں ان کے بارے میں بہت کچھ لکھا ہے۔

ہاشم ہی وہ بزرگ ہیں جنہوں نے سب سے پہلے قریش میں سال میں دو مرتبہ تجارت کے لیے قافلہ روانہ کرنے کا سلسلہ جاری کیا۔ موسم سرما میں یمن کی طرف اور موسم گرما میں شام کی طرف۔ نجاشی شاہ حبشہ اور قیصر روم ہاشم کی بہت عزت کرتے تھے۔ عرب کے دوسرے قبائل کی نگاہ میں بھی ہاشم کی خاص توقیر تھی۔ اس وجہ سے ان دو سفروں کے راستوں پر جو جو قبائل آباد تھے، ہاشم نے ان قبائل سے بھی یہ معاہدہ کیا کہ ہم تمہاری تمام ضرورتیں پوری کیا کریں گے اور تم ہمارے قافلے کو کسی قسم کا نقصان نہ پہنچانا۔

(طبقات ابن سعد جلد ۱ ص ۴۵)

مورخین نے لکھا ہے کہ عبد مناف کے بیٹوں نے اہل مکہ کے لئے مختلف بادشاہوں سے اجازت نامے حاصل کیے تاکہ یہ لوگ تجارتی مقاصد کے لیے ان کے ملکوں میں آزادی سے آجا سکیں اور کوئی ان سے تعرض نہ کرے۔ انہیں اجازت ناموں کی وجہ سے اہل مکہ کی تجارت کا دائرہ وسیع ہو گیا۔ جہاں بھی یہ جاتے وہاں کی حکومت ان کی جانوں اور ان کے تجارتی قافلوں کے حفاظت کی ضمانت دیتی۔ یہ لوگ نہایت آزادی سے خرید و فروخت کرتے اور پھر اس مال سے خوب نفع کماتے۔ ہاشم نے شام، روم اور غسان کے حکمرانوں سے اجازت نامہ حاصل کیا ہوا تھا۔ عبد شمس نے نجاشی والی حبشہ سے نوفل نے کسریٰ شاہ ایران سے اور مطلب نے حمیر کے سلاطین سے اجازت نامے حاصل کئے ہوئے تھے۔

(طبری جلد ۲ ص ۱۸۰، ابن اثیر جلد ۲ ص ۱۶، طبقات ابن سعد جلد ۱ ص ۷۵)

ہاشم کی اس تدبیر سے قریش کے قافلوں کے تمام راستے مامون و مصئون ہو گئے۔

Marfat.com

اس کے علاوہ ہاشم نے اپنے لیے یہ دستور وضع کر رکھا تھا کہ حج کے ایام میں تمام حجاج کی گوشت، روٹی، ستو، کھجوروں اور دیگر اشیائے خورد ونوش سے تواضع کرتے اور ان کے لیے ہر قسم کی سہولتوں کا انتظام فرماتے جس سے ان کی چاردانگ عالم میں شہرت پھیل گئی۔

مورخین نے لکھا ہے کہ جس شام ذی الحجہ کا چاند نظر آتا اس کے اگلے روز صبح سویرے ہاشم حرم میں تشریف لاتے اور بیت اللہ کی دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر کھڑے ہو کر خطبہ ارشاد فرماتے:

"اے گروہ قریش! تم عرب کے سردار ہو، تمہارے چہرے بڑے حسین وجمیل ہیں، تم زیرک بھی ہو اور دانشور بھی۔ تم اللہ کے گھر کے پڑوسی ہو۔ اللہ تعالیٰ نے تمہیں اپنے گھر کا متولی ہونے کے شرف سے نوازا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے گھر کی زیارت کرنے والے اور اس کا ادب واحترام کرنے والے چند روز میں آئیں گے اور وہ اس کے مہمان ہوں گے اور اللہ تعالیٰ کے مہمانوں کی عزت وتکریم کرنے کے تم سب سے زیادہ حقدار ہو۔ پس تم اس کے مہمانوں اور اس کے گھر کی زیارت کرنے والوں کی عزت وتکریم کرو۔ قسم ہے اس گھر کے رب کی! اگر میرے پاس اتنا مال ہوتا تو میں زائرین کعبہ کی مہمانی کا سارا بوجھ خود ہی اٹھا لیتا۔ میں اپنے پاکیزہ اور حلال مال سے اس مقصد کے لیے کچھ حصہ نکالوں گا۔ ایسا مال جس کے حاصل کرنے میں نہ قطع رحمی کی گئی ہے اور نہ ظلم روا رکھا گیا ہے اور نہ ہی اس میں کچھ حرام داخل ہے۔ میں تم سے عرض کرتا ہوں کہ جو چاہے اس نیک مقصد کے لیے مالی تعاون کرے، لیکن کوئی شخص ایسا مال نہ دے جو پاکیزہ نہ ہو، جس کے حصول میں کسی کے ساتھ ظلم کیا گیا ہو یا کسی سے زبردستی چھینا گیا ہو۔"

اہل مکہ اس دعوت کو بسر وچشم قبول کرتے اور ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر مالی تعاون کرتے اور یہ سب مال اور چیزیں دارالندوہ میں جمع کر دی جاتیں۔

بنوامیہ

قریش کے دوسرے ممتاز بزرگ امیہ بن عبد شمس تھے۔ عبد شمس ہاشم کے سگے

بھائی تھے اور امیہ ہاشم کے حقیقی بھتیجے تھے۔ جن سے خاندان بنوامیہ کی شاخ چلی۔ یہ قریش کے سپہ سالار تھے۔ اگرچہ ابتدا میں قریش کی سپہ سالاری کا عہدہ بنومخزوم کے پاس تھا لیکن عبدشمس کے زمانہ میں یہ عہدہ اور منصب بنوامیہ میں منتقل ہوگیا۔ چنانچہ عکاظ اور حروب فجار وغیرہ سب لڑائیوں میں جو زمانہ جاہلیت میں قریش اور دوسرے خاندانوں میں ہوئیں، سپہ سالاری کے فرائض عبدشمس کے پوتے ابوسفیان کے والد حرب بن امیہ نے سرانجام دیے۔
(العقد الفرید جلد۲ ص ۳۱)

حرب بن امیہ کی موت کے بعد ابوسفیان اس منصب پر فائز ہوئے اور اپنے مسلمان ہونے تک قریش کی سپہ سالاری انہی کے ہاتھوں میں رہی۔ جنگ بدر میں جو کہ اہل اسلام اور اہل کفر کے درمیان سب سے پہلا معرکہ تھا، ابوسفیان قریش کے قافلہ کے ساتھ گئے ہوئے تھے۔ اس وجہ سے ان کے سسر عتبہ بن ربیعہ اموی نے سپہ سالاری کے فرائض انجام دیے۔ ویسے بھی وہ عمر میں ابوسفیان سے بڑے تھے۔ اس وجہ سے بھی سپہ سالاری ان ہی کا حق بنتا تھا۔ اس کے بعد ابوسفیان کے اسلام لانے تک جتنے معرکے بھی کفر اور اسلام کے درمیان ہوئے ان سب میں قریش کی قیادت ابوسفیان کے ہاتھ میں رہی۔
(تاریخ الاسلام السیاسی جلد ا ص ۳۹۵)

بنوامیہ اور تجارت

بنوامیہ نہ صرف قریش کے قائد اور سپہ سالار تھے بلکہ یہ قریش کے دوسرے خاندانوں کی طرح صاحب مال اور تجارت پیشہ بھی تھے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ یہ خاندان تجارت میں بھی سارے قریش کا لیڈر اور قائد تھا۔ جنگ بدر کے موقع پر قریش کا جو قافلہ شام گیا ہوا تھا، اس کی قیادت بھی ابوسفیان کے ہاتھ میں تھی۔ اور ہرقل کے نام جب سید دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے دعوت اسلام کا خط بھیجا، اس زمانے میں بھی ابوسفیان اپنے تجارتی قافلے کو لے کر وہاں گئے ہوئے تھے۔ آپ اس سارے قافلے کے قائد اور سربراہ تھے، چنانچہ ہرقل نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تحقیق حال کے لیے انہی کو بلایا اور مختلف سوالات کے ذریعہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات سے آشنائی حاصل کی۔ (یہ واقعہ بخاری کے مختلف ابواب میں تفصیلاً مذکور ہے) تجارت کی وجہ سے بنوامیہ کی مالی پوزیشن

Marfat.com

بھی بہت مضبوط تھی اور مکہ کے مالداروں میں اکثریت انہیں کی تھی۔ عتبہ اور شیبہ کی طائف میں بھی کوٹھیاں تھیں۔ سیدنا عثمان بن عفانؓ جن کی ساری دولت اسلام کے دورِ عسرت میں اس کی خدمت کے لیے وقف تھی، اسی خاندان کے چشم وچراغ تھے۔

بنوامیہ مخالفت اور موافقت کے روپ میں

سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کے اعلان نبوت کے بعد ہاشم کی طرح بنوامیہ بھی حلقہ بگوش اسلام ہوئے لیکن بنوہاشم نے قومی اور قبائلی عصبیت کی بنا پر آپ کی زیادہ حمایت کی تھی۔ چنانچہ آپ کے قتل کی سازش میں بنوہاشم میں سے کوئی بھی شریک محفل نہ تھا۔

(محاضرات تاریخ الامم الاسلامیہ جلد۴ ص ۱۴۷)

بنوامیہ چونکہ قریش کی قیادت عظمیٰ کے عہدہ پر فائز تھے، اس لیے انہوں نے اس عہدہ کے عظیم فرائض منصبی کا احساس کرتے ہوئے اہل اسلام کا آخری دم تک مقابلہ کیا اور ان کا یہ مقابلہ اہل اسلام سے خاندانی چشمک کی وجہ سے نہ تھا بلکہ مسلمانوں کے علاوہ کسی اور جماعت سے بھی اگر ان کا مقابلہ ہوتا تو اس کے خلاف بھی بنوامیہ یہی سرگرمی دکھاتے، لہذا یہ روایت جو بنائی گئی ہے کہ پیدائش کے وقت ہاشم کے پاؤں کا انگوٹھہ عبدشمس کے سر کے ساتھ چسپاں تھا، اس کو الگ کرنے کے لیے تیز دھار آلہ استعمال کیا گیا جس سے خون کے چند قطرے ٹپک پڑے۔ لوگوں نے ازراہ قیافہ کہنا شروع کیا کہ ان کی اولاد کے درمیان خون ریزی ہوگی۔ پھر اس روایت کے ڈانڈے واقعہ کربلا سے ملائے جاتے ہیں۔ اول تو یہ روایت ہی غلط ہے لیکن اگر اس کو صحیح بھی مان لیا جائے تو پھر قیافہ شناسوں کے قیافہ کے غلط ہونے میں کوئی شک وشبہ نہیں۔ ان کے قیافہ کو وحی کا درجہ دینا ایک بہت بڑی زیادتی ہے۔ بنوامیہ اور بنوہاشم کے بعض اختلافات کو خاندانی چشمک کا نتیجہ بتانا تاریخ سے جہالت اور بنوامیہ کے اصلی حالات سے ناواقفیت کی دلیل ہے۔ تاہم تاریخ اسلام کے اوراق میں آپ کو بنوامیہ کے ایسے افراد بکثرت ملیں گے جنہوں نے اسلام کی خاطر اپنا سب کچھ قربان کردیا یہاں تک کہ حبشہ کی پہلی ہجرت میں زیادہ بنوامیہ ہی کے لوگ تھے۔ بنوہاشم میں سے صرف سیدنا جعفر طیارؓ تھے (سیرت ابن ہشام جلد ا ص ۴۹ سو) چنانچہ علامہ بلاذریؒ نے بھی لکھا ہے کہ بنوہاشم میں سے صرف سیدنا جعفر طیارؓ نے حبشہ کی طرف ہجرت فرمائی (انساب

Marfat.com

الاشراف جلد ا ص ۱۹۷) اور بنوامیہ اور ان کے حلفاء میں سے جن حضرات نے حبشہ کی طرف ہجرت کی ان کے نام حسب ذیل ہیں۔

۱۔ سیدنا عثمان بن عفانؓ اور ان کی اہلیہ محترمہ سیدہ رقیہ بنت رسول اللہ ﷺ
۲۔ سیدنا خالدؓ بن سعید بن العاص بن امیہ
۳۔ سیدنا عمرو بن سعیدؓ
۴۔ سیدنا ابوحذیفہؓ بن عتبہ ربیعہ اور ان کی اہلیہ محترمہ سیدہ سہلہؓ بنت سہیل
۵۔ سیدنا عبداللہ کنیت ابومحمد حلیف بنوامیہ
۶۔ سیدنا عبداللہ کنیت ابواحمد حلیف بنوامیہ
۷۔ عبیداللہ کنیت ابوجحش حلیف بنوامیہ
۸۔ سیدنا شجاع بن وہب بن ربیعہؓ حلیف بنوامیہ
۹۔ سیدنا قیس بن عبداللہؓ حلیف بنوامیہ
۱۰۔ سیدنا معیقیب بن ابی فاطمہ دوسیؓ حلیف آل سید بن العاص
۱۱۔ سیدنا ابوموسیٰ عبداللہ بن قیس بن سلیم بن خضار حلیف آل عتبہ بن ربیعہ

(انساب الاشراف بلاذری جلد ا ص ۱۹۹۔۲۰۰)

(ہجرت اولیٰ بجانب حبشہ کے مہاجرین کی فہرست کے لیے ملاحظہ ہو عیون الاثر لابن سید الناس کی جلد ا ص ۱۱۵، فتح الباری جلد ۷ ص ۱۴۷)

اس کے علاوہ سیدنا عثمانؓ نے مدینہ منورہ کے میٹھے پانی کے کنویں بئر رومہ کو جو ایک یہودی کی ملکیت تھا اور اس نے اس کو ذریعہ معاش بنا رکھا تھا، غریب اور قلاش مسلمانوں کی تکلیف کی خاطر آٹھ ہزار میں خرید کر مسلمانوں کے لیے وقف کر دیا۔

(الاستیعاب جلد ۲ ص ۴۸۸ فتح الباری، باب مناقب عثمان بن عفانؓ جلد ۷ ص ۴۳)

پھر انہی سیدنا عثمانؓ نے غزوہ تبوک میں تین سو اونٹ بمعہ ساز و سامان اور تقریباً ۳۰ کلو چاندی اور نقد ایک ہزار دینار لا کر بارگاہ نبوت میں پیش کیے۔ اس سے آپ اس قدر خوش ہوئے کہ آپ ان اشرفیوں کو بار بار اچھالتے اور فرماتے کہ "آج کے بعد عثمانؓ کو کوئی عمل نقصان نہ پہنچا سکے گا"۔ اور فرماتے! "اے اللہ! میں عثمانؓ سے راضی ہوں تو بھی اس سے راضی ہو جا"۔ (فتح الباری جلد ۷ ص ۴۳، مستدرک حاکم جلد ۳ ص ۱۰۳ زرقانی، جلد

۳ ص ۶۴، ترمذی جلد۲ ص ۲۱۱، باب مناقب عثمان بن عفانؓ)

بنوامیہ کی اسلام دشمنی جو کچھ بھی تھی اس کو زیادہ بڑھا چڑھا کر بیان کیا جاتا ہے۔ یہ درست ہے کہ حالت کفر میں ان لوگوں نے اسلام اور اہل اسلام کی سرتوڑ مخالفت کی لیکن جب یہ لوگ حلقہ بگوش اسلام ہوئے تو اسلام کی محبت اور دوستی میں بھی انہوں نے وہ کار ہائے نمایاں سرانجام دیئے کہ اسلام کی تاریخ میں وہ واقعات سنہری حروف سے لکھے جانے کے قابل ہیں۔ خود ابوسفیانؓ جنہوں نے اسلام کی سب سے زیادہ مخالفت کی تھی، اسلام قبول کرنے کے بعد اسلامی لڑائیوں میں دوسرے مسلمانوں کے دوش بدوش اس قدر گرم جوشی سے حصہ لیتے رہے کہ خود ان کی جاہلیت کی تاریخ اس کے سامنے گرد ہے۔ غزوہ حنین میں شرکت فرمائی۔ پھر محاصرہ طائف میں کار ہائے نمایاں سرانجام دیئے یہاں تک کہ اس غزوہ میں ان کی ایک آنکھ جاتی رہی۔ (الاستیعاب جلد۲ ص ۷۱) بعض روایات میں ہے کہ غزوہ طائف میں جب اہل طائف نے تیروں کی بارش برسائی تو ایک تیر سیدنا ابوسفیانؓ کی آنکھ پر لگا۔ آنکھ کا ڈھیلا باہر نکل آیا۔ انہوں نے اسے ہاتھ میں پکڑ لیا اور دوڑتے ہوئے بارگاہ نبوت میں عرض پرداز ہوئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا! "اگر تیری مرضی ہو تو اللہ تعالیٰ اسے پہلی حالت سے بہتر بنا کر تجھے روشنی عطا فرمائے اور اگر تو اس سے بہتر جنت میں آنکھ لینا چاہتا ہے تو اللہ تعالیٰ جنت میں ایسی آنکھ عطا فرمائے گا کہ کوئی آنکھ اس کا مقابلہ نہیں کر سکے گی۔ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان اقدس سے یہ بات سُن کی آنکھ کا ڈھیلا جو ان کے ہاتھ میں تھا، زمین پر پھینک دیا اور عرض کی! "خیر أفی الجنتہ" اس سے بہتر آنکھ مجھے جنت میں عطا فرمائی جائے۔

اسی طرح دوسری آنکھ سیدنا فاروق اعظمؓ کے عہد خلافت میں جنگ یرموک میں اللہ تعالیٰ کی راہ میں قربان کردی۔

(اسد الغابہ جلد۵ ص ۲۱۶، الصدیق، محمد حسین ہیکل ص ۲۰۶)

اسی لیے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا تھا:

الناس معاون کمعادن الذهب والفضة، خیارهم فی الجاهلیته خیارهم فی الاسلام اذا فقهوا

(بخاری جلد۱ ص ۹۴، مسلم جلد۲ ص ۱۰۳، مستدرک حاکم جلد۳ ص ۲۴۳)

لوگوں کی مثال سونے اور چاندی کی کانوں کی طرح ہے۔ جو لوگ زمانہ جاہلیت میں بہتر تھے، اسلام لانے کے بعد بھی وہی بہتر ہیں اگر انہیں دین کی سمجھ حاصل ہو جائے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور بنوامیہ

یہی وجہ تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بنوامیہ کو جوں جوں وہ اسلام لاتے رہے، اپنی خاص نوازشات سے نوازتے رہے کیونکہ آپ ان کے اندرونی مخفی جوہر سے بخوبی آشنا تھے اور سمجھتے تھے کہ جس طرح ان لوگوں نے حالت کفر میں کفر کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا دی تھی اسی طرح اب یہ اسلام کے لیے بھی اپنا سب سرمایہ حیات قربان کرنے سے دریغ نہیں کریں گے جیسا کہ بنوامیہ کی تاریخ اس بات کی گواہ ہے۔ چنانچہ آپ نے اپنی چار میں سے تین صاحبزادیوں (سیدزینب، سیدہ رقیہ اور سیدہ ام کلثوم سلام اللہ علیھن) کا نکاح بنوامیہ میں کیا۔ اپنی سب سے بڑی صاحبزادی سیدہ زینب سلام اللہ علیھا کا نکاح ابوالعاص بن ربیع بن عبدالعزی اموی سے کیا (سیرۃ ابن ہشام جلد۲ ص ۲۷۶) اور سیدنا عثمان بن عفانؓ سے یکے بعد دیگرے اپنی دو صاحبزادیاں سیدہ رقیہؓ اور سیدہ ام کلثومؓ بیاہیں (حیات القلوب ملا باقر مجلسی جلد۲ ص ۳۳) اور فرمایا کہ اگر میری دس لڑکیاں بھی ہوتیں تو میں یکے بعد دیگرے انہیں عثمانؓ کی زوجیت میں دے دیتا۔ (مجمع الزوائد جلد۹ ص ۲۱۷) ایک روایت میں یوں آیا ہے۔

لوکان لی ثالثة لزوجته، مازوجته الابالوحی من اللّٰه تعالیٰ (تاریخ الخلفاء ص ۱۵۲)

"اگر میری تیسری بیٹی ہوتی تو میں وہ بھی عثمانؓ سے بیاہ دیتا اور میں از خود نہ بیاہتا بلکہ اللہ تعالیٰ کی وحی کے حکم سے بیاہتا۔"

ایک اور روایت میں چالیس بیٹیوں کا ذکر آتا ہے۔

(تاریخ الخلفاء للسیوطی ص ۱۵۲)

اور ایک اور روایت میں سو کا لفظ بھی آتا ہے۔

دوسری طرف بنوامیہ کے رئیس اور سردار سیدنا ابوسفیانؓ کی صاحبزادی سیدہ ام حبیبہ سلام اللہ علیھا سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود نکاح کر کے بنوامیہ سے اپنے

Marfat.com

نہایت قریبی رشتہ داری کے تعلقات قائم فرمائے۔

(زرقانی جلد۳ ص ۲۴۲، الاصابہ جلد۴ ص ۳۰۵، صفۃ الصفوۃ جلد۲ ص ۲۲)

فتح مکہ کے روز آپؐ نے ابوسفیانؓ کے گھر کو ایک عظیم درجہ دے دیا اور فرمایا:

من دخل دار ابی سفیان فھو آمن

(مسلم جلد۲ ص ۱۰۴، مسند احمد حدیث نمبر ۹، ۷۹، تہذیب التہذیب جلد۴ ص ۴۱۱
تاریخ ابن خلدون جلد۳ ص ۵)

جو ابوسفیان کے گھر میں داخل ہو جائے اسے بھی امان ہے۔

جمادی الاولیٰ ۴ ھ میں غزوہ ذات الرقاع پیش آیا۔ اس مہم میں جب آپ تشریف لے گئے تو آپؐ نے سیدنا عثمان بن عفانؓ کو مدینہ منورہ میں اپنا قائم مقام بنایا۔ (طبقات ابن سعد جلد۳ ص ۹۳) پھر ۶ ھ میں سیدنا عثمانؓ کے لیے بیعت رضوان منعقد فرمائی اور آخر میں اپنے بائیں ہاتھ کو دائیں ہاتھ پر رکھ کر فرمایا کہ یہ بیعت عثمانؓ کی جانب سے ہے۔ سیدنا عثمانؓ اس واقعہ کا ذکر کر کے فرمایا کرتے تھے۔ کہ میری جانب سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بایاں ہاتھ میرے دائیں ہاتھ سے کہیں بہتر تھا۔

(زرقانی جلد۲ ص ۲۰۶)

اسی بیعت میں اللہ تعالیٰ نے صرف سیدنا عثمانؓ کی طفیل چودہ سو اور بعض روایات کے مطابق پندرہ سو صحابہ کرامؓ کو اپنی رضا کا سرٹیفکیٹ عطا فرمایا جس کا ذکر سورۃ الفتح آیت نمبر ۱۹ میں ہے۔

(زرقانی جلد۲ ص ۱۸۰)

انہی سیدنا عثمان بن عفان اموی ؓ کو آپ نے کتابت وحی کے ذمہ دارانہ منصب پر مامور فرمایا۔ چنانچہ سیدہ عائشہ صدیقہ سلام اللہ علیہا فرماتی ہیں کہ ایک دفعہ رات کے وقت وحی نازل ہوئی۔ اس وقت سیدنا عثمانؓ موجود تھے۔ آپؐ نے انہیں لکھنے کا حکم فرمایا تو انہوں نے اسی وقت تعمیل ارشاد کی۔

(کنز العمال جلد۶ ص ۳۷۷)

پھر اسی خاندان کے ایک اور فرد سیدنا معاویہؓ بن ابی سفیانؓ کی ذہنی، فکری، علمی خوبیوں اور صلاحیتوں کی وجہ سے سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کو ان پر خاص اعتماد تھا۔ اسی اعتماد کی بنا پر بارگاہ رسالت کی طرف سے آپ کو کتابت وحی کا منصب جلیلہ عطا ہوا۔

(تقریب التہذیب ص ۳۵۷ کنز العمال جلد۲ ص ۲۳۹، البدایہ والنہایہ جلد ۸ ص ۱۱۸،

آداب السلطانیہ للمحزی ص ۱۴۵، النجوم الزاھرہ جلد ۱ ص ۱۵۴، الاستیعاب جلد ۳ ص ۳۲۵)

ابن ابی الحدید نے لکھا ہے کہ:

كان معاوية احد كتاب رسول الله صلى الله عليه وسلم

(ابن ابی الحدید جلد ۱ ص ۴۳۴)

"معاویہؓ رسول اللہ صلی علیہ وسلم کے کاتبوں میں سے ایک تھے۔"

ایسا ہی علامہ ذہبیؒ نے لکھا ہے (تاریخ الاسلام للذہبی جلد ۲ ص ۳۱۸)

بنو ہاشم کا قبول اسلام

عام تاثر یہ دیا جاتا ہے کہ بنوامیہ اور بنو ہاشم کی شروع ہی سے چونکہ باہمی دشمنی چلی آرہی تھی اور یہ دونوں قبیلے ایک دوسرے کے حریف تھے، اس وجہ سے بنوامیہ نے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی از حد مخالفت کی، لیکن یہ بات بالکل غلط ہے اور اس پر تعمیر کردہ نتائج کی دنیا محض ایک باطل مفروضہ ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب نبوت کا دعویٰ کیا تو سب سے پہلے آپ پر ایمان لانے کے سعادت آپ کی زوجہ محترمہ سیدہ خدیجہ بنت خویلد سلام اللہ علیہا کے حصہ میں آئی تھی جو اگرچہ قبیلہ وخاندان کے لحاظ سے بنواسد کی فرد تھیں، لیکن شادی کے بعد عملی طور پر بنوہاشم کی رُکن بن چکی تھیں۔ عربوں کی قبائلی روایات کے مطابق بیویاں اپنے خاوندوں کے خاندان کی رُکن سمجھی جاتی تھیں۔ اسی طرح موالی اور حلیف بھی اپنے سرپرستوں اور آقاؤں کے خاندان ہی کے افراد سمجھے جاتے تھے۔ چنانچہ سیدنا زید بن حارثہؓ کلبی کے علاوہ ابورافع صالح شقرانؓ، ابوکبشہؓ اور انسہؓ اور غالباً کچھ اور موالی بھی بنو ہاشم اور اہل بیت رسول کے مکی مسلمان تھے۔ اہل بیت کرام میں آپ کی چار صاحبزادیاں سیدہ زینبؓ، سیدہ رقیہؓ، سیدہ ام کلثومؓ اور سیدہ فاطمہؓ بھی ابتدائی مکی دور کی مسلمان تھیں۔ خاندان رسول کے موالی میں سیدنا زید بن حارثہؓ کی زوجہ محترمہ سیدہ ام ایمنؓ بھی قدیم ترین اسلام والوں میں سے تھیں۔ پھر سیدنا زید بن حارثہؓ کے فرزند سیدنا اسامہ بن زید کلبی پیدائشی مسلمان تھے۔

ابو طالب جدید اور قدیم مورخین کی روایات کے مطابق اسلام سے محروم رہے، لیکن ان کے دو بیٹے سیدنا علیؓ اور سیدنا جعفر طیارؓ اور ان کی اہلیہ اسماء بنت عمیس خثعمیؓ بھی

Marfat.com

قدیم کی مسلمان ہیں۔ سیدہ اسماءؓ نے تو اپنے شوہر سیدنا جعفرؓ کے ساتھ ہجرت حبشہ بھی کی تھی۔ ابو طالب اگرچہ خود شرف اسلام سے محروم رہے لیکن ان کی زوجہ محترمہ سیدہ فاطمہؓ بنت اسد بن ہاشم نے مکہ ہی میں (غالباً ابو طالب کی وفات کے بعد) اسلام قبول کر لیا اور بعد میں مدینہ طیبہ کی طرف ہجرت بھی فرمائی۔ ان کے بیٹے عقیل کی اہلیہ فاطمہؓ بنت ربیعہ نے بھی غالباً حدیبیہ کے بعد یا فتح مکہ کے زمانہ میں اپنے خاوند کے ساتھ اسلام قبول کر لیا تھا۔

بنو ہاشم ہی کے ایک اور اہم فرد اور آپؐ کے چچا ابولہب بن عبدالمطلب ہاشمی نے نہ صرف اسلام قبول نہ کیا بلکہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی شدید مخالفت بھی کی اور آپ کی ایذا رسانی میں کوئی دقیقہ فرد گذاشت نہ رکھا، لیکن اس دشمن اسلام اور دشمن رسولؐ کے دو لڑکوں عتبہ اور عتیبہ نے فتح مکہ کے بعد دعوت اسلام کو قبول کر لیا تھا اور غالباً ان کی تمام اولاد نے بھی۔

بنو ہاشم کا ایک اور گھرانہ جس کا تعلق سیدنا عباسؓ بن عبدالمطلب سے تھا، یہ بھی آپؐ کے چچا تھے۔ انہوں نے صلح حدیبیہ کے کچھ بعد یا فتح مکہ سے کچھ قبل اسلام قبول کیا تھا۔ اس زمانہ میں آپ کے صاحبزادے بہت چھوٹے تھے لیکن غالباً اپنے والد سیدنا عباسؓ کے ساتھ وہ بھی دائرہ اسلام میں داخل ہو گئے تھے۔ ان میں فضلؓ، اقثمؓ، عبیداللہ اور عبداللہؓ وغیرہ شامل ہیں۔

بنو ہاشم کا ایک اور گھرانہ سیدنا حمزہ بن عبدالمطلبؓ کا گھرانہ تھا۔ سیدنا حمزہؓ کا خاندان ابتدائی عہد کا مسلمان تھا جب کہ آپؐ دارارقم میں قیام پذیر تھے۔ سیدنا حمزہؓ کی کوئی نرینہ اولاد نہ تھی۔ صرف ایک لڑکی امامہ تھی جو عمرۃ القضاء میں بہت چھوٹی تھیں اور سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے سیدنا جعفر بن ابی طالبؓ کی کفالت میں دیا تھا، کیونکہ ان کی اہلیہ سیدہ اسماء بنت عمیسؓ سیدہ امامہؓ کی خالہ لگتی تھی۔ البتہ ان کے موالی بنوغنی ابتدائی مکی مسلمان تھے جو ابو مرثدؓ اور مرثد غنویؓ کے نام سے یاد کیے جاتے تھے۔

بنو ہاشم کا ایک گھرانہ حارث بن عبدالمطلبؓ کا تھا۔ حارث تو بعثت نبوی سے قبل ہی انتقال کر چکے تھے لیکن ان کے بیٹے نوفل بن حارث بن عبدالمطلب نے جنگ بدر کے بعد اسلام قبول کر لیا تھا مگر مدینہ طیبہ کو ہجرت جنگ خندق کے بعد سیدنا عباسؓ کے ساتھ کی

Marfat.com

تھی۔ نوفل کے باقی تین بھائیوں ربیعہ، عبداللہ اور ابوسفیان کے بارہ میں تاریخ کے رپورٹر بتاتے ہیں کہ وہ فتح مکہ کے روز حلقہ بگوش اسلام ہوئے تھے۔

ابوسفیانؓ بن حارث بن عبدالمطلب ہاشمی کے بارہ میں روایات میں ہے کہ وہ اپنے وقت کے بہت اچھے شاعر تھے لیکن اسلام کے سخت دشمن تھے۔ وہ بیس برس تک اسلام اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجو کرتے رہے لیکن فتح مکہ کے روز جاں نثار رسولؐ بن گئے۔ اس خاندان کے تین اور افراد جعفر بن ابی سفیان، حارث بن نوفل بن حارث اور عبدالمطلب بن ربیعہ بن حارث نے فتح مکہ کے روز اسلام قبول کیا تھا۔ ابوسفیان بن حارث بن عبدالمطلب کی اہلیہ جمیلہ بنت ابی طالب جو سیدنا علیؓ کی ہمشیرہ تھیں اپنے خاوند سے قبل مکہ میں حلقہ اسلام میں داخل ہو کر ہجرت مدینہ کے شرف سے مشرف ہو چکی تھیں۔

اس ساری بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ بنو ہاشم نے خاندان کی محبت میں اسلام قبول نہیں کیا تھا اور نہ ہی ایک ہاشمی فرد ہونے کی وجہ سے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ دیا تھا بلکہ اسلام کو سچا سمجھتے ہوئے اسے قبول کیا تھا۔ دوسرے لفظوں میں بنو ہاشم نے اسلام کی شدید ترین مخالفت بھی کی اور شدید ترین حمایت بھی۔

بنوامیہ کا قبول اسلام

بنوعبد مناف کی دوسری شاخ بنوعبدشمس کی تھی۔ یہ قبیلہ اور خاندان دنیوی جاہ وحشمت، مال ودولت اور عددی لحاظ سے بنوعبد مناف کا سب سے زیادہ طاقتور اور مالدار خاندان تھا۔ اس کی اہم ترین شاخ بنوامیہ اتنی اہمیت اختیار کر گئی تھی کہ بنوعبدشمس عملاً بنوامیہ ہی سمجھے جانے لگے تھے۔ ہمارے خیال میں بنوامیہ کو سیاسی، سماجی اور اقتصادی طور پر جو عروج اور بلند مقام حاصل ہوا وہ ہاشم اور ان کے فرزند عبدالمطلب کی وفات کے بعد حاصل ہوا کیونکہ ہاشم ایک بڑے باوجاہت انسان تھے اور سرکار دربار تک ان کی رسائی تھی۔ دوسرے بادشاہوں کے ہاں بھی انہیں باریابی حاصل تھی۔ وہ مدبر و منتظم بھی تھے، بڑے باہمت اور فرائض کی ادائیگی اور انجام دہی میں نہایت چابک دست تھے۔ اس وجہ سے ان کا سیاسی اور سماجی طور پر ایک خاص مقام تھا۔

ان کے صاحبزادے عبدالمطلب کو بھی اللہ تعالیٰ نے انہی صلاحیتوں اور خوبیاں

سے نوازا تھا۔ جن سے ان کے باپ ہاشم کو نوازا تھا۔ آپ سیرت وصورت دونوں میں یگانہ روزگار تھے۔ قد بحر رجز میں، بدن سڈول، چہرہ سے ہیبت و وجاہت، آنکھوں سے شرافت ونجابت اور رخساروں سے جلالت وعظمت کی شعائیں ضوفشاں تھیں۔ ایک اجنبی بھی جب دیکھتا تو قدموں میں گرنے کے لیے بیتاب ہو جاتا۔ جود وسخا میں شہرہ آفاق تھے۔ آپ کا دسترخوان نہ صرف انسانوں کے لیے وسیع تھا بلکہ جنگل کے وحشی جانور اور ہوا کے پرندے بھی اس سے مستفید ہوتے تھے۔

عبدالمطلب کی وفات کے بعد جانشینی کے لیے ان کے بیٹے زبیر بن عبدالمطلب، کا تقرر ہوا۔ زبیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے والد ماجد حضرت عبداللہ کے سب سے بڑے حقیقی بھائی تھے۔ ویسے خواجہ عبدالمطلبؓ کی اولاد میں ان کا سب سے بڑا بیٹا حارث تھا جس کے نام پر آپ نے اپنی کنیت ابوالحارث رکھی ہوئی تھی۔ یہ حارث اپنے باپ کی زندگی ہی میں فوت ہو گئے تھے۔ خواجہ عبدالمطلب کی جو اہلیہ فاطمہ بنت عمرو بنومخزوم میں سے تھیں، ان کے بطن سے تین بیٹے اور چار بیٹیاں پیدا ہوئیں۔ بیٹوں کے نام زبیر، عبدمناف (ابو طالب) اور جناب عبداللہ تھے۔ زبیر سب سے بڑے تھے۔ علامہ بلاذریؒ نے لکھا ہے کہ

"زبیر قریش کے سرداروں میں سے تھے۔ وہ عبداللہ اور ابو طالب سے عمر کے لحاظ سے بڑے تھے"۔ (انساب الاشراف جلد ا ص ۸۵)

یعقوبی نے بھی زبیر کو قریش کے معززین اور باوجاہت سرداروں میں سے لکھا ہے۔ (یعقوبی جلد ا ص ۳۷)

عرب کے مختلف قبائل کے درمیان ایک معاہدہ ہوا جس کا نام "حلف الفضول" تھا۔ جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی شرکت فرمائی تھی اور جس معاہدہ نے "حروب الفجار" کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ کر دیا۔ اس معاہدہ کے اصلی محرک زبیر بن عبدالمطلب ہی تھے۔ (ابن ابی الحدید جلد ۳ ص ۴۵۵)

ابن ابی الحدید ہی نے لکھا ہے کہ:

"زبیر بن عبدالمطلب ایک بہادر، خوبصورت اور باوجاہت انسان تھے اور خطیب، شاعر اور بنو ہاشم کے سردار اور سخی تھے"۔ (ابن ابی الحدید جلد ۳ ص ۴۵۵)

زبیر کے انتقال کے بعد بنو ہاشم میں اس پایہ کا ان کا کوئی جانشین نہیں تھا۔ ابو

Marfat.com

طالب مالی طور پر نہایت مفلوک الحال تھے۔ خاندان کے سربراہ اور سردار کے لیے جو صفات اور خصوصیات کسی شخص میں پائی جانی چاہیں جیسے شجاعت، بہادری، جود ونوال، بخشش وعطاء، مروت و بردبادی اور دولت وشہرت وغیرہ، ابوطالب ان میں سے اکثر سے محروم تھے۔ پھر وہ جسمانی طور پر بھی لنگڑے تھے۔ چنانچہ اس نقص کی وجہ سے نہ ہی حرب فجار میں اور نہ ہی کسی اور جنگ میں آپ کی شرکت کا پتہ چلتا ہے۔ ٹانگوں کے اس نقص کی وجہ سے وہ عطر فروشی اور بعض اوقات غلہ کی خرید وفروخت کر لیتے تھے۔ چنانچہ سیدنا علیؓ فرماتے ہیں کہ:

ابی ساده فقیراً ، ماساد فقیرا قبله (یعقوبی جلد ا ص ۱۷)

''میرے والد (ابوطالب) سردار ہوئے تو فقیر تھے اور ان سے قبل کوئی فقیر کبھی قبیلہ کا سردار نہیں ہوا۔''

اس سے پتہ چلتا ہے کہ بنوامیہ کو سیادت و قیادت کی یہ زمام کار زبیر بن عبدالمطلب کی وفات کے بعد آئی۔ عبدشمس کو ہاشم کی طرح اپنے باپ کی زندگی ہی میں برابری کا مقام حاصل تھا اور باپ کے انتقال کے بعد اگر ہاشم کو سقایہ اور رفادہ کے عہدے ملے تھے تو عبدشمس کو قیادہ کا عظیم منصب ملا تھا۔ اسی طرح عبدمناف کے دونوں فرزند مکی اشرافیہ کے برابر کے رُکن اور مکی سماج ومعاشرہ میں یکساں عزت وتوقیر کے حق دار بن گئے تھے۔

ہاشم کی نوعمری میں وفات اور ان کے بیشتر بچوں کا بچپن میں انتقال وغیرہ کی وجہ سے ان کی نسل صرف بنوعبدالمطلب میں جاری رہی جب کہ اس کے مقابلہ میں عبدشمس کے متعدد لڑکوں سے ان کی نسل خوب چلی اور بعثت نبوی تک بنوعبدشمس کے اپنے متعدد بطون (چھوٹے چھوٹے قبیلے) وجود میں آچکے تھے۔ قبیلوں کی کثرت تعداد کی وجہ سے جو اس زمانے میں ایک امتیازی خصوصیت تھی، بنوعبدشمس کو ایک امتیازی سیاسی اور سماجی عظمت وتوقیر حاصل ہوگئی تھی۔ علاوہ ازیں ان کو ملکی اقتصادیات میں بھی نمایاں برتری حاصل تھی۔ عہدنبوی میں بھی بنوعبدشمس کو یہ قیادت و سیادت حاصل تھی۔ اس قیادت وسیادت کو قائم رکھنے میں بنوعبدشمس کی اپنی صلاحیتوں اور قابلیتوں کے علاوہ کل خاندان بنوعبدمناف کی تائید و تصدیق اور تحاد کی دولت حاصل تھی۔ گویا بنوعبدشمس کی عظمت وریاست بنوہاشم کی عظمت و ریاست تھی۔ یہ دونوں خاندان ایک دوسرے کے دوست، حلیف اور بھائی تھے نہ

Marfat.com

کہ رقیب، حریف اور مدمقابل جیسا کہ کہا جاتا ہے۔

بعثت نبوی تک بنو عبد شمس کے متعدد خاندان اور گھرانے بجائے خود ایک سماجی اکائی بن چکے تھے۔ ان میں سب سے بڑا اور اہم ترین گھرانہ بنوامیہ کا تھا جو معتدد گھرانوں پر مشتمل تھا۔ اس کی اہم شاخیں مندرجہ ذیل تھیں۔

۱۔ بنوابی العاص بن امیہ اکبر (اس کی مزید دو ذیلی شاخیں تھیں)

(ا) بنوعفان: سیدنا عثمان بن عفانؓ کا خاندان

(ب) بنوحکم: سیدنا مروان بن الحکم کا خاندان

۲۔ بنوحرب بن امیہ اکبر (اس کی حسب ذیل تین اہم ترین شاخیں تھیں)

(ا) بنوابوسفیان بن حرب

(ب) بنوعتبہ بن ابی سفیان

(ج) بنومعتیبہ بن ابی سفیان

ان کے علاوہ بھی بعض گھرانے ان میں شامل تھے۔

۳۔ بنوابی العیص : سیدنا عتاب بن اسیدؓ کا گھرانہ

۴۔ بنوابی عمرو بن امیہ : دشمن رسولؐ عقبہ بن ابی معیط کا خاندان

۵۔ بنوعاص بن امیہ : ابواحیحہ سعید بن عاص کا خاندان

علاوہ ازیں عبد شمس کے متعدد بیٹوں کے خاندان تھے جیسے بنوحبیب بن عبد شمس، بنوعبدامیہ بن عبد شمس، بنونوفل عبد شمس، بنوربیعہ بن عبد شمس اور بنوعبدالعزی بن عبد شمس۔ پھران کے آگے کئی گھرانے ہو چکے تھے۔ بنوربیعہ بن عبد شمس کے دو افراد عتبہ بن ربیعہ اور شیبہ بن ربیعہ بعثت نبوی سے قبل مکی اشرافیہ کے اہم ترین ستون تھے جب کہ موخرالذکر رسول کریم علیہ الصلواۃ والتسلیم کے بڑے داماد ابوالعاص بن ربیع کا گھرانہ تھا۔

یہ مختصری تفصیل تھی بنوعبد شمس/بنوامیہ کے خاندان کی۔ اسلام کے بارہ میں اس خاندان کا رویہ بنوہاشم یا دوسرے کسی مکی خاندان سے مختلف نہ تھا۔ اگرچہ ان میں سے بعض نے اسلام کی پوری پوری مخالفت کی تھی لیکن اسی خاندان کے کئی افراد نے بھرپور حمایت بھی کی تھی۔ بنوہاشم کے بعض گھرانوں کی طرح بعض اموی/عبد شمسی گھرانوں نے بھی سبقت اسلام کی دولت سے حظ وافر پایا۔

خاندان بنو عاص بن امیہ اکبر میں ابواحیحہ سعید بن عاص کا گھرانہ اپنی دولت وشہرت، شرافت ونجابت اور سیادت وریاست کے لیے تمام مکہ میں ممتاز ترین گھرانہ سمجھا جاتا تھا۔ اسی خاندان کے ایک فرد خالد بن سعید اموی ؓ غالباً اولین اموی مسلمان تھے اور روایات کے مطابق ان کا سلسلہ سابقین اولین صحابہ کرامؓ میں تیسرا یا چوتھا نمبر تھا۔ ان میں سے ایک بھائی عمرو بن سعیدؓ نے غالباً ان کے اثر سے مکی عہد کے نصف اول کے آغاز ہی میں اسلام قبول کر لیا تھا۔ یہ دونوں بھائی اپنے والد، دوسرے بھائیوں اور خاندان کے دوسرے کے ظلم وستم کا نشانہ بنے تھے۔

ابن اسحاق کے قول کے مطابق اپنی دونوں بیویوں امینہ بنت خلف خزاعی اور فاطمہ بنت صفوان الکنانی کے ساتھ حبشہ کی طرف ہجرت کی تھی۔ سیدنا خالد بن سعیدؓ کے دو بچے سیدنا سعید اور سیدہ امہ حبشہ ہی میں پیدا ہوئے تھے۔ غالباً عمرو بن سعید کی اولادیں بھی مکہ یا حبشہ میں پیدا ہوئی تھیں۔ سربراہ خاندان سعید بن عاص کا بدر کے بعد حالت کفر میں انتقال ہوا تھا جب کہ ان کے دو لڑکے ابان بن سعیدؓ اور حکم (عبداللہ) بن سعیدؓ نے صلح حدیبیہ کے بعد یا فتح مکہ کے زمانے میں اسلام قبول کیا تھا۔ حسن اتفاق سے یہ چاروں بھائی بے پناہ اور غیر معمولی صلاحیتوں کے مالک تھے۔ اس لیے انہوں نے اسلامی ریاست کے چار مختلف صوبوں میں عہد نبوی ہی میں گورنر کے فرائض سرانجام دیے تھے۔ اس خاندان کے ایک اور فرد سعید غزوہ طائف میں شہید ہوئے تھے اس خاندان کے دوسرے کئی افراد نے بھی اسلام قبول کیا۔ اس خاندان کی بیٹیوں میں سے ایک فاختہ بنت سعیدؓ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے داماد سیدنا ابو العاص اموی ؓ کے حبالہ عقد میں آئیں۔ انہی سے ان کی نسل چلی۔

خاندان بنوابی العاص کے قدیم ترین مسلمان سیدنا عثمان بن عفان اموی تھے۔ جو سیدنا صدیق اکبر کی ترغیب سے مسلمان ہوئے۔ یہ دار ارقم میں قیام نبوی سے قبل شرف اسلام سے مشرف ہوئے۔ اور بقول ابن اسحاق پہلے آٹھ مسلمانوں میں سے تھے۔ ان کے حقیقی چچا حکم بن ابی العاص نے اسلام لانے کی وجہ سے ان پر بڑے ظلم توڑے تھے۔ آخر تنگ آ کر یہ اپنی اہلیہ محترمہ سیدہ رقیہ بنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ۵ نبوی میں جانب حبشہ ہجرت فرما گئے۔ سیدنا عثمانؓ کے دوسرے بہن بھائیوں کے قبول اسلام کے بارہ

Marfat.com

میں کتابوں میں کچھ نہیں ملتا ، البتہ ان کی والدہ ماجدہ سیدہ اروٰی بنت کریزؓ ابتدائی مکی مسلمان تھیں۔ اور ان کی ایک اموی بیوی سیدہ رملہ بنت شیبہ بن ربیعہ ابتدائی مکی مسلمان اور مہاجرہ مدینہ تھیں۔ ان کے چچا حکم بن ابی العاصؓ کے خاندان نے فتح مکہ میں اسلام قبول کیا تھا۔ سیدنا حکمؓ کے علاوہ ان کے بیٹے مروانؒ بھی صحابہ میں شمار ہوتے ہیں۔

بنوربیعہ بن عبد شمس کی قسمت میں سبقت اسلام کا شرف حاصل کرنے والے سیدنا ابو حذیفہؓ بن عتبہ بن ربیعہ تھے۔ یہ تیسرے اہم اموی مکی مسلمان ہیں جو نہ صرف آغاز اسلام ہی میں حلقہ بگوش اسلام ہوئے تھے بلکہ مکہ میں اپنوں ہی کے ہاتھوں ستائے جانے کی وجہ سے اپنی اہلیہ محترمہ سیدہ سہلہ بنت سہیل عامریؓ کے ساتھ حبشہ ہجرت فرما گئے تھے اور پھر مدینہ طیبہ کی طرف ہجرت فرمائی۔ جنگ بدر میں شریک ہوئے جن میں ان کے بھائی اور والد شریک ہوئے تھے۔ ان کے خاندان میں ان کی ایک عم زاد بہن کے علاوہ اور کسی کے فتح مکہ سے قبل مسلمان ہونے کا ذکر نہیں ملتا البتہ ان کے ایک مولیٰ (آزاد کردہ غلام) سالم تھے جو آغاز اسلام میں حلقہ بگوش اسلام ہوئے اور قدیم مہاجر اور بدری تھے۔

روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ بنوحرب بن امیہ کے کسی فرد نے مکی عہد میں اسلام قبول نہیں کیا تھا۔ تاہم روایات سے پتہ چلتا ہے کہ اس خاندان کی ایک خاتون سیدہ ام حبیبہؓ جو ابوسفیان بن حرب کی صاحبزادی تھیں ، ابتدائی دور کی مسلمان تھیں۔ اس خاندان کے مردوں نے فتح مکہ کے روز اسلام قبول کیا تھا ، لیکن یہ صحیح نہیں ہے کیونکہ قوی اور معتبر روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ ابوسفیانؓ کے دو صاحبزادے یزیدؓ اور معاویہؓ صلح حدیبیہ کے بعد غالباً عمرہ القضاء کے موقع پر مسلمان ہو گئے تھے۔ (تقریب التہذیب ص ۳۵۷، تاریخ الاسلام ذہبی جلد ۲ ص ۳۱۸، اسد الغابہ جلد ۴ ص ۳۸۵، تہذیب الاسماء والصفات جلد ۲ ص ۱۰۲، البدایہ والنہایہ جلد ۸ ص ۱۱۷، ۱۱۸، تاریخ بغداد جلد ۱ ص ۲۰۷، فتح الباری جلد ۷ ص ۸۲، نسب قریش ص ۱۲۱، طبقات ابن سعد جلد ۷ ص ۱۲۷) اور ان کے ساتھ غالباً ان کے اہل خانہ بھی مسلمان ہوئے ہوں گے۔ سیدنا ابوسفیانؓ اپنی زوجہ ہند بنت عتبہ اور اپنے دوسرے صاحبزادوں عتبہ اور عتیبہ کے ساتھ فتح مکہ میں دولت اسلام سے بہرہ ور ہوئے تھے۔

یہ نہایت تعجب اور حیرت کی بات ہے کہ سیدنا ابوسفیانؓ اور ان کے خاندان کے اکثر افراد مکی عہد میں دائرہ اسلام میں داخل نہ ہوئے لیکن ان کے بنوغنم بن دودان کے تمام

حلیف جن کی تعداد روایات کے مطابق چالیس بالغ افراد پر مشتمل تھی، آغاز اسلام ہی میں مسلمان ہو گئے تھے۔ بعض مورخین کا خیال ہے کہ ان کے قبول اسلام کا زمانہ مکی دور کا آخر ہے۔ بہر حال زمانہ کوئی ہوا ان کا شمار سابقین اولین میں ہوتا ہے اور ان میں سے بعض ہجرت حبشہ میں بھی شریک تھے اور باقی مہاجرین مدینہ اور اصحاب بدر میں شمار ہوتے ہیں۔ محمد ابن اسحاق اور ابن سعد نے ان کے ۲۳ مردوں کے نام گنوائے ہیں۔ اور ابن اسحاق کی روایت کے مطابق ان کی آٹھ خواتین کے نام معلوم ہوئے ہیں۔ اس طرح بنوحرب بن امیہ کے حلیف بنوغنم بن دودان کے ابتدائی مسلمانوں کی کل تعداد ۳۱ ہوتی ہے۔ کتابوں میں مزید ۹ مردوں کے نام بھی آئے ہیں۔ ان کے بچوں میں سے کسی کا ذکر نہیں کیا گیا۔ اس سے زیادہ حیرت کی بات یہ ہے کہ عبداللہ بن جحش کی والدہ سیدہ امیمہ بنت عبدالمطلب ہاشمی کا ذکر کہیں نہیں کیا گیا جو کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی ابتدائی دور کی مسلمان پھوپھی ہیں۔ اندازہ یہ ہے کہ حلفاء بنی حرب بن امیہ کے ابتدائی مسلمانوں کی تعداد اڑھائی تین سو کے درمیان ہے۔

بنوامیہ کے ایک اور حلیف سیدنا معیقیب بن ابی فاطمہ دوسیؓ تھے جو کہ قدیم مسلمان تھے۔ ہجرت کر کے حبشہ بھی گئے۔ بعض روایات میں ہے کہ وہ مکہ سے واپس اپنے قبیلہ دوس چلے گئے اور وہاں تبلیغ اسلام کرتے رہے۔

بنو عبدالعزی بن عبدشمس کے ایک اہم رُکن ابو العاص بن ربیع تھے۔ وہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے سب سے بڑے داماد اور سیدہ زینب بنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے شوہر تھے۔ ان کے علاوہ سیدہ خدیجہ ام المومنین سلام اللہ علیہا کی بہن کے بیٹے تھے۔ انہوں نے صلح حدیبیہ سے قبل اسلام قبول کیا۔ پھر مدینہ طیبہ ہجرت فرمائی۔ ان کی صاحبزادی امامہؓ پیدائشی مسلمان تھی۔ باقی گھرانہ فتح مکہ کے زمانہ میں دولت اسلام سے بہرہ ور ہوا تھا۔

بنوابی العیص میں سیدنا عتاب بن اسیدؓ موی فتح مکہ کے روز اپنے خاندان کے ساتھ دولت اسلام سے بہرہ ور ہوئے۔ وہ قبول اسلام کے چند ہی روز کے بعد اسلامی ریاست کی طرف سے مکہ کے گورنر مقرر ہوئے۔ زبیری نے ان کے ایک بھائی خالد بن اسید کا ذکر بھی کیا ہے جس کا کافی بڑا گھرانہ تھا۔

Marfat.com

خاندان بنی عمرو بن امیہ کے سردار عقبہ بن ابی معیط نے نہ صرف اسلام قبول کرنے سے انکار کیا بلکہ وہ ابولہب ہاشمی اور ابوجہل کی طرح اسلام اور پیغمبر اسلام کا تیسرا بڑا دشمن تھا۔ وہ اپنے جنگی جرائم کی وجہ سے غزوہ بدر میں قتل کر دیا گیا تھا۔ اس دشمن خدا اور رسولؐ کی جرات مند اور دلیر صاحبزادی سیدہ ام کلثوم بنت عقبہؓ نے ہجرت کے بعد کسی وقت اسلام قبول کر لیا تھا اور صلح حدیبیہ کے فوراً بعد دلیرانہ ہجرت کر کے مدینہ طیبہ پہنچ گئی تھیں۔ عقبہ بن ابی معیط کے تین لڑکوں سیدنا ولیدؓ، سیدنا خالدؓ اور سیدنا عمارؓ نے عام روایات کے مطابق فتح مکہ کے روز اسلام قبول کیا ہو۔ اس بات کا قوی امکان ہے کہ ان کی وجہ سے دوسروں نے بھی اسلام قبول کر لیا تھا۔ بہر حال یہ ایک مسلم تاریخی حقیقت ہے کہ عقبہ بن ابی معیط اموی کا گھرانہ ہجرت کر کے مدینہ طیبہ جا بسا تھا۔

بنو عبد شمس اور بنوامیہ کے باقی گھرانے اور افراد زیادہ تر فتح مکہ کے زمانے میں اسلام میں داخل ہوئے۔ ممکن ہے کہ ان میں سے کچھ حضرات وخواتین کچھ عرصہ پہلے مشرف بہ اسلام ہوئے ہوں۔ پھر ان میں سے ابو کیسہ حارث بن کریزؓ، عامر بن کریزؓ عبداللہ بن عامرؓ اور عبدالرحمٰن بن سمرہؓ وغیرہ عظیم صحابہ کا ذکر مل ہی جاتا ہے۔

بنوامیہ اور بنو ہاشم کا تقابلی جائزہ

اگر خاندان بنو ہاشم اور خاندان بنوامیہ کے قبول اسلام کا تقابلی جائزہ لیا جائے تو اس میں بڑی حیرت انگیز مماثلت نظر آتی ہے اور واضح ہوتا ہے کہ خاندان بنو عبد مناف کے دو برادر قبیلوں اور ان کے افراد نے اسلام اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ یکساں رویہ اپنایا تھا۔ اگر چند ہاشمیوں نے سبقت اسلام اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حمایت کا شرف حاصل کیا تھا تو بعینہٖ یہی شرف چند امویوں نے بھی حاصل کیا تھا۔ اگر کچھ ہاشمیوں نے مکہ میں اللہ کے راستہ میں تکالیف اٹھائیں اور مصائب برداشت کیے تھے اور حبشہ کی جانب ہجرت کی تھی تو ان سے زیادہ امویوں نے یہی قربانیاں دی تھیں۔ اگرچہ ابوسفیان بن حرب اموی اور عقبہ بن ابی معیط میں سے اسلام کی مخالفت کی تو عناد اسلام اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت میں ابولہب ہاشمی اور ابوسفیان بن حارث ہاشمی بھی کسی سے پیچھے نہیں رہے تھے بلکہ ڈٹ کر اسلام اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مخالفت کی۔ لہذا

Marfat.com

یہ کہنا کہ امویوں نے غیر معمولی طور پر بنو ہاشم سے پرانے عناد کی وجہ سے اسلام اور رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کی تھی، یہ بات سراسر غلط اور خلاف حقیقت ہے۔ واقعات اس بات کے خلاف شہادت دیتے ہیں۔

سیاسی نظام میں بنوامیہ کا مقام

بنوامیہ کا علمی اور فکری صلاحیتوں کی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو سیاسی نظام میں ایک خاص اہمیت دی تھی۔ چنانچہ اکثر صوبوں کے گورنر اموی خاندان ہی سے مقرر فرمائے اور اسٹیٹ کی انتظامی مشینری ان کے ہاتھوں میں دی کیونکہ جاہلیت میں قیادت کا شعبہ انہیں کے ہاتھوں میں تھا۔ فتح مکہ کے بعد مکہ کا گورنر سیدنا ابوسفیانؓ کے چچا کے پوتے عتاب بن اسیدؓ کو مقرر فرمایا۔ اس وقت ان کی عمر ۲۱ سال تھی اور روزینہ کے طور پر ایک درہم یومیہ مقرر فرمایا۔ اس پر عتابؓ نے یہ کہا:

ایھاالناس ! اجاع اللّٰہ کبدمن جاع علیٰ درھم

"اے لوگو! اللہ اس شخص کے جگر کو بھوکا رکھے جو ایک درہم میں بھی بھوکا رہے۔"

عتابؓ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد صدیق اکبرؓ کے سارے دور خلافت میں مکہ کے گورنر رہے۔

(روض الانف جلد۲ ص ۲۷۶، استیعاب جلد۳ ص ۵۳، اسد الغابہ جلد۳ ص ۳۵۸، تہذیب التہذیب جلد۷ ص ۷۹)

بعض روایات میں آتا ہے کہ مکہ کی امارت پر سرفراز فرماتے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عتابؓ کو ارشاد فرمایا!

"عتاب! تم کو معلوم ہے کہ کن لوگوں پر میں نے تم کو گورنر بنایا ہے، اہل اللہ پر، اگر مکہ والوں کے لیے تم سے زیادہ کوئی موزوں شخص نظر آتا تو میں اسے بناتا"

(اسد الغابہ جلد۳ ص)

آپؐ پہلے ہی سے ان سے بخوبی آشنا تھے اور فتح مکہ سے دو سال بنایا تو آپؐ کے میں آپؐ نے فرمایا تھا!

ب بن اسیدؓ مکہ پر

"قریش کے چار شخص شرک سے دور اور اسلام حالد بن سعید صنعاء پر اور ابو

(انساب الاشراف جلد۱ ص ۵۱۹)

راغب ہیں۔ لوگوں نے پوچھا: یا رسول اللہؐ! وہ کون ہیں؟ فرمایا! عتاب بن اسید، جبیر بن مطعم، حکیم بن حزام اور سہیل بن عمروؓ۔ 50

(مستدرک حاکم جلد۳ ص ۵۹۵)

پھر ۸ ھ میں حج کی امارت کا شرف بھی آپ ہی کو حاصل ہوا۔ (تہذیب التہذیب جلد ۷ ص ۸۹، اسد الغابہ جلد۳ ص ۳۵۷) اس لحاظ سے عتابؓ تاریخ اسلام میں سب سے پہلے امیر الحج ہیں۔

سیدنا ابوسفیانؓ کو آپ نے نجران کا گورنر مقرر فرمایا۔ (الاستیعاب جلد۲ ص ۷۱ تہذیب التہذیب جلد۴ ص ۴۱۳، کتاب المحبر لابی جعفر ص ۱۲۶، تاریخ خلیفہ بن خیاط جلد۱ ص ۶۲) اور قبیلہ بنی ثقیف کے بت منات کو توڑنے کے لیے بھی آپ کو اور سیدنا مغیرہ بن شعبہؓ کو مقرر فرمایا۔ چنانچہ ان دونوں نے اس بت کو توڑا۔ (تہذیب التہذیب جلد۴ ص ۴۱۲ البدایہ والنہایہ جلد۵ ص ۳۰، ۳۳ سیرت ابن ہشام جلد۲ ص ۵۴۰)

ایک مرتبہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ مکرمہ میں قریش میں تقسیم کرنے کے لیے کچھ مال بھیجا۔ وہ مال سیدنا ابوسفیانؓ نے قریش میں تقسیم کیا۔

(طبقات ابن سعد جلد۴ ص ۳۲، ۳۳، السنن الکبریٰ بیہقی جلد۱ ص ۱۲۹)

سیدنا ابوسفیانؓ ایک صاحب حیثیت شخص اور متمول آدمی تھے، اس لیے کئی دفعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے مال کو غریب اور نادار لوگوں کی حاجات پوری کرنے میں صرف کیا۔ چنانچہ قبیلہ بنی ثقیف کے دو شخص عروہ اور الاسود مقروض تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدنا ابوسفیانؓ کو ان کا قرض اُتارنے کے لیے ارشاد فرمایا اور آپ نے فرمان نبوی کے مطابق ان کا قرض ادا کر دیا۔ (سیرۃ ابن ہشام جلد۲ ص ۵۴۲)

عثمان بن ابی العاصؓ کو طائف اور اس کے ملحقات کو گورنر مقرر فرمایا۔ (تہذیب جانب ہجرت جلد۷ ص ۱۲۸) آپ سیدنا عثمان بن عفانؓ کے چچازاد بھائی تھے، اور دور فاروقی بن حرب اموی اور بصرہ، بحرین اور عمان کے گورنر رہے۔ یمن میں سیدنا خالد بن سعید بن صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت عہدہ پر مقرر فرمایا۔ (زرقانی جلد۳ ص ۳۶۳، زاد المعاد جلد۱ ص ۳۱) پیچھے نہیں رہے تھے بلکہ ڈٹ کر اسدؓ کے چچا عاص کے پوتے تھے۔ جنگ مرج میں شہید ہوئے لے آپ نے ہی آمادگی کا اظہار کیا تھا۔

Marfat.com

(فتوح الشام ازدی جلد ا ص ۴)

عثمان بن سعیدؓ کو آپؒ نے خیبر کا گورنر مقرر فرمایا اور ان کے بھائی ابان بن سعیدؓ کو بحرین کی گورنری عطا فرمائی۔ (استیعاب جلد ا ص ۳۵)

سیدنا ابوسفیانؓ کے بڑے صاحبزادے سیدنا یزید بن ابی سفیانؓ جو تاریخ اسلام میں "یزید الخیر" کے نام سے مشہور ہیں، بڑی صلاحیتوں اور خوبیوں کے مالک تھے۔ فتح مکہ کے روز اسلام کے شرف سے مشرف ہوئے اور غزوہ حنین میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت میں شریک ہوئے۔ جنگ کے اختتام پر آپؐ نے انہیں بہت سا مال مرحمت فرمایا۔ (طبقات ابن سعد جلد ۷ ص ۱۲۷، البدایہ والنہایہ جلد ۷ ص ۹۵) آپ کا شمار کاتبان وحی میں سے بھی ہے۔ (جوامع السیرۃ لابن حزم ص ۲۶) نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے ننہال قبیلہ بنی فراس پر انہیں عامل صدقات مقرر فرمایا۔ (الاصابہ جلد ۳ ص ۶۱۹، اسد الغابہ جلد ۵ ص ۱۱۲) علاوہ ازیں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں تیماء کا گورنر بھی مقرر فرمایا۔ (زرقانی جلد ۳ ص ۳۶۳، کتاب المجر ص ۱۲۶)۔ چنانچہ شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں!

"نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے گورنروں میں دوسرے خاندانوں کی بہ نسبت بنوامیہ کے لوگ اکثر و بیشتر تھے۔ چنانچہ فتح مکہ کے بعد آپ نے عتابؓ بن اسید بن ابی العاص بن امیہ کو وہاں کا گورنر مقرر فرمایا، اور خالدؓ بن سعید بن ابی العاص اور ان کے دونوں بھائیوں ابانؓ اور سعیدؓ کو دوسرے علاقوں کا گورنر بنایا۔ ابوسفیانؓ اور ان کے صاحبزادے یزیدؓ کو بھی (نجران اور تیماء) کا گورنر بنا کر بھیجا حتی کہ آپ کی وفات تک وہ اس منصب پر فائز تھے۔ علاوہ ازیں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی تین بیٹیوں (سیدہ زینب، سیدہ رقیہ اور سیدہ ام کلثومؓ سلام اللہ علیہن) کو بھی بنوامیہ ہی میں بیاہا"۔ (منہاج السنہ جلد ۲ ص ۱۴۵)

علامہ بلاذریؒ نے بھی واقدی کی روایت سے لکھا ہے کہ:

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب اس دنیا سے انتقال فرمایا تو آپؐ کے بنوامیہ میں سے مختلف صوبوں پر چار گورنر تھے (۱) عتاب بن اسیدؓ مکہ پر (۲) ابان بن سعید بن العاصؓ بحرین پر (۳) خالد بن سعید صنعاء پر اور ابو سفیان بن حربؓ نجران پر"۔ (انساب الاشراف جلد ا ص ۵۱۹)

اس کے برعکس نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے عہد حیات میں کسی ہاشمی کو نہ تو مستقل طور پر کسی صوبہ کی حکومت عطا فرمائی اور نہ کسی بڑی فوج کا خود مختار سپہ سالار بنایا۔ اپنی اس دنیوی زندگی کے آخری ایام میں آپ نے سیدنا علیؓ کو چند روز کے لیے یمن کا کلکٹر مقرر فرمایا لیکن اقتدار اعلیٰ اور افسری سیدنا ابو موسیٰ اشعریؓ اور سیدنا معاذ بن جبلؓ کو عطا فرمائی"۔ (حلیۃ الاولیاء جلد ۱ ص ۳۵۴، مدارج النبوۃ جلد ۱ ص ۵۰۲، زرقانی جلد ۳ ص ۹۹، مسند احمد بن حنبل جلد ۵ ص ۲۳۴)

چنانچہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کی پوری تاریخ اسلام کی ورق گردانی فرمالیجیے، آپ کو ایک گورنر بھی ایسا نہیں ملے گا جس کا تعلق نسبی بنو ہاشم سے ہو بلکہ بنو ہاشم میں سے بعض لوگوں نے تقرر کی خواہش کا اظہار کیا لیکن آپ نے منظور نہ فرمایا۔ یہی وجہ تھی کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حیات دنیوی کے آخری ایام میں جب آپ ہی کی طبیعت میں قدرے افاقہ ہوا تو سیدنا عباسؓ نے سیدنا علیؓ کا ہاتھ پکڑ کر فرمایا کہ اے علی! خدا کی قسم! تین دن کے بعد تم پر کوئی اور حاکم ہوگا اور تم اس کے محکوم ہو گے۔ خدا کی قسم! میں سمجھتا ہوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس بیماری میں انتقال فرما جائیں گے، لہذا بہتر یہ ہے کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس بارہ میں دریافت کر لیں کہ آپ کے بعد کون خلیفہ ہوگا؟ اگر ہم میں سے ہوگا تو معلوم ہو جائے گا ورنہ آپؐ اس کو ہمارے متعلق وصیت فرما دیں گے۔ سیدنا علیؓ نے جواب دیا کہ ہو سکتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے بارے میں انکار فرما دیں تو پھر ہم ہمیشہ کے لیے اس سے محروم ہو جائیں گے۔ بخدا! میں اس بارہ میں آپ سے ایک حرف بھی نہ کہوں گا۔

(بخاری، کتاب المغازی جلد ۲ ص، مسند احمد بن حنبل جلد ۱ ص ۲۶۳، ۳۲۵، البدایہ والنہایہ جلد ۵ ص ۲۲۷، ص ۲۵۱)

غرض کہ عہد رسالت میں اکثر و بیشتر بنو امیہ کو گورنری کے عہدوں پر فائز کیا گیا اور بنو ہاشم میں سے ایک فرد بھی ایسا نہ تھا جس کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی جگہ کا گورنر بنا کر بھیجا ہو حالانکہ آپ کے چچا سیدنا عباسؓ اور آپ کے چچا کے بیٹے سیدنا عقیل، سیدنا علیؓ اور دیگر عصبات موجود تھے۔ سرکاری عہدہ تو ایک طرف رہا، آپ نے غزوات کے سلسلہ میں ۲۸ مرتبہ مدینہ طیبہ کو چھوڑا لیکن ایک مرتبہ بھی انتظامی امور کی انجام دہی کے

Marfat.com

لیے آپؐ نے بنو ہاشم میں سے اپنے نائبین کا تقرر نہیں فرمایا بلکہ کبھی کسی اموی کو اپنا نائب مقرر فرمایا اور کبھی کسی انصاری کو کبھی کسی مخزومی کو تو کبھی کسی کلبی اور غفاری کو۔ جنگ تبوک کے موقع پر سیدنا علیؓ کو مدینہ میں چھوڑا لیکن اپنا قائم مقام اور مدینہ کا والی مقرر کر کے نہیں بلکہ صرف اہل وعیال اور عورتوں اور بچوں کی حفاظت اور خبر گیری کے واسطے اور اپنا قائم مقام اور مدینہ کا والی سیدنا محمد بن مسلمہ انصاریؓ کو مقرر فرمایا۔ (طبقات ابن سعد جلد ا ص ۱۱۹)

عہد صدیقی اور بنوامیہ

جس خاندان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی نوازشات سے نوازیں اور اسلامی ریاست میں ان کو بڑے بڑے عہدوں پر سرفراز فرمائیں، بھلا یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ خلفائے راشدین اپنے عہد راشدہ میں اس خاندان کی قابلیت اور تدبر سے فائدہ نہ اٹھائیں۔ چنانچہ تاریخ اسلام کے صفحات اس بات کی گواہی دے رہے ہیں کہ خلفائے راشدین خصوصی طور پر سیدنا ابوبکرؓ سیدنا عمرؓ اور سیدنا عثمانؓ نے اس خاندان کے لوگوں کی قابلیت سے پورا پورا فائدہ اٹھایا اور اسٹیٹ میں گورنروں اور سپہ سالاروں کی آسامیوں کے لیے اس خاندان کی خدمات حاصل کیں۔ سیدنا ابوبکر صدیقؓ نے مرتدین کے خلاف جنگ میں اموی سرداروں کی خدمات سے پورا پورا فائدہ اُٹھایا اور ہر موقع پر اموی قائدین نے نہایت قابلیت، محنت اور جانفشانی سے اپنے فرائض سرانجام دے کر خلافت اسلامیہ میں ایک خاص مقام اور اہمیت حاصل کی۔ شام کی فوج کشی میں سیدنا ابوسفیانؓ کے بڑے صاحبزادے سیدنا یزیدؓ کو اسلامی فوج کے ایک بڑے حصے کا سردار اور قائد مقرر فرمایا (محاضرات تاریخ الامم الاسلامیہ جلد ۴ ص ۴۷۰، العواصم بن القواصم ص ۸۱، فتوح البلدان بلاذری ص ۱۱۸) اور سیدنا معاویہؓ کو اس لشکر کا علم بردار مقرر کیا (ہسٹری آف دی عربز، ہٹی، انگریزی ص ۱۴۸) روانگی کے وقت کچھ دور تک پیادہ پا رخصت کرنے کے لیے نکلے۔ (طبری جلد ۴ ص ۳۰) سیدنا یزید بن ابی سفیانؓ نے خلیفہ رسول سیدنا ابوبکر صدیقؓ کو اپنے ساتھ پیادہ پا دیکھ کر عرض کیا: "امیرالمومنین! آپ بھی سوار ہو جائیں یا پھر مجھے پیادہ پا چلنے کی اجازت مرحمت فرمائیں"۔ سیدنا ابوبکرؓ نے جواب میں ارشاد فرمایا! "نہ مجھ کو سوار ہونے کی ضرورت ہے اور نہ تم کو سواری سے اُترنے کی، میں جتنے قدم رکھتا ہوں ان کو اللہ کی راہ میں شمار کرتا ہوں"۔

Marfat.com

رخصت کرتے وقت سیدنا صدیق اکبرؓ نے ارشاد فرمایا! ''اے یزید! شام میں تم کو بہت سے تارک الدنیا راہب ملیں گے، ان سے اور ان کی رہبانیت سے تعرض نہ کرنا''۔ پھر فرمایا: ''تم کو جنگ میں ایسے لوگوں سے واسطہ پڑے گا جو بیچ سے سر منڈاتے ہیں، ان کو اسی حصہ پر تلوار مارنا''۔ پھر فرمایا! ''میں تم کو دس نصیحتیں کرتا ہوں ان کا ہمیشہ خیال رکھنا، بچوں، عورتوں اور بوڑھوں کو نہ مارنا، پھلے پھولے درختوں کو نہ کاٹنا، آبادیوں کو ویران نہ کرنا، بکری اور اونٹ کھانے کے علاوہ بیکار ذبح نہ کرنا، درخت نہ جلانا، پانی میں نہ ڈبانا، خیانت اور بزدلی نہ کرنا۔ (موطا امام مالک ص ۱۷۶، تاریخ الخلفاء ص)

ان ہدایات کو لے کر جب سیدنا یزید بن ابی سفیانؓ شام کی سرزمین میں پہنچے تو آپ نے سب سے پہلے سیدنا خالد بن ولیدؓ کے ساتھ بصریٰ پر حملہ کیا۔ بصریٰ والوں نے صلح کر لی۔ بصریٰ کے بعد فلسطین کا رُخ کیا اور اجنادین کے مقام پر رومیوں کو شکست فاش دی (اسد الغابہ جلد ۵ ص ۱۱۲) اردن کی فتح کے بعد سیدنا ابوعبیدہ بن الجراحؓ نے سیدنا یزیدؓ کو ساحلی علاقے کی طرف روانہ کیا۔ انہوں نے سیدنا عمرو بن العاصؓ کے ساتھ مل کر اس کو زیر نگین کیا (فتوح البلدان ص ۱۳۶) دمشق کے محاصرہ میں شہر پناہ کے ہر ہر حصہ پر علیحدہ علیحدہ افسر متعین تھے۔ چنانچہ باب صغیر سے لے کر باب کیسان تک کی نگرانی سیدنا یزیدؓ کے سپرد تھی۔ دمشق کی فتح کے بعد جب سیدنا ابوعبیدہؓ نے حمص کو فتح کرنے کا ارادہ کیا تو سیدنا یزیدؓ کو دمشق میں اپنے قائم مقام کی حیثیت سے چھوڑ دیا۔ (فتوح البلدان ص ۱۳۷) جنگ یرموک میں بھی سیدنا یزید بن ابی سفیانؓ اسلامی فوج کے ایک حصہ کے افسر تھے۔ اس جنگ میں آپ کے والد ماجد سیدنا ابوسفیانؓ بھی شریک تھے۔ آپ نے اس جنگ میں نمایاں کردار ادا کیا یہاں تک کہ ان کی دوسری آنکھ بھی اس لڑائی میں جاتی رہی (اسد الغابہ جلد ۵ ص ۲۱۶، الصدیق ص ۲۰۶) سیدنا ابوسفیانؓ کی پہلی آنکھ غزوہ طائف کے محاصرہ میں ضائع ہوئی تھی۔ (استیعاب جلد ۲ ص ۷۱۰) اور دوسری آنکھ جنگ یرموک میں ضائع ہوئی۔ اس وجہ سے وہ جنگ یرموک کے بعد ظاہری بینائی سے کلیتاً محروم ہو گئے۔ اس جنگ میں سیدنا یزید بن ابی سفیانؓ اپنے پورے کنبے، والد، والدہ اور بھائی معاویہؓ کے ساتھ شریک تھے اور ان کی والدہ ہند سپاہیوں کو جنگ پر ابھارتی تھیں۔ (فتوح البلدان ص ۱۴۲) جب

Marfat.com

مسلمانوں پر رومیوں کا ریلا زیادہ ہوا تو سیدنا یزیدؓ کے والد سیدنا ابوسفیانؓ لڑتے بھی جاتے اور اللہ رب العزت کی بارگاہ میں فتح ونصرت کی دعا بھی فرماتے جاتے اور ساتھ ہی جان نثار ان اسلام کو ابھارتے بھی جاتے کہ:

"اللہ اللہ! تم لوگ عرب کا ہالہ، اس کا خلاصہ اور اسلام کے دست وبازو ہو اور تمہارے حریف سلطنت روم کا ہالہ، اس کا خلاصہ اور مشرکین کے دست وبازو ہیں۔ اے اللہ! آج کا دن تیرا دن ہے تو اپنے بندوں کی مدد فرما"۔

(المنتقی ا ص ۲۵۴، فتوح البلدان ص ۱۴۲، اسد الغابہ جلد ۵ ص ۲۱۶، تاریخ الاسلام الذہبی جلد ۲ ص ۹۷)

سیدنا سعید بن المسیبؒ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ جنگ یرموک کے روز جب کہ مسلمان رومیوں سے نبرد آزما تھے۔ ایک ہو کا عالم طاری تھا اور جنگ کی شدت کے باعث تمام لوگ چپ تھے، لیکن ایک شخص ایسا تھا جو بآواز بلند پکار رہا تھا۔

یانصر اللّٰہ اقترب، یا نصر اللّٰہ اقترب

"اے اللہ کی مدد جلد آ، اے اللہ کے مدد جلد آ"

میں نے سر اٹھا کر جو دیکھا تو وہ سیدنا ابوسفیان تھے جو اپنے فرزند سیدنا یزیدؓ کے جھنڈے تلے رومیوں سے لڑ رہے تھے۔

(تہذیب التہذیب جلد ۴ ص ۴۱۲، اسد الغابہ جلد ۵ ص ۲۱۶، تاریخ الاسلام ذہبی جلد ا ص ۱۰)

اس جنگ یرموک میں مسلم خواتین کی قیادت ایک اموی خاتون سیدہ جویریہ بنت ابی سفیانؓ نے فرمائی۔ (الصویق ص ۲۰۶)

اس کے علاوہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جن جن اموی قائدین کو اسٹیٹ کے سیاسی نظام میں جو مقام دیا تھا۔ خلیفہ رسول سیدنا ابوبکرؓ نے ان کے اس مقام کو برقرار رکھا بلکہ جہاں تک ہو سکا اپنے مختصر دور خلافت میں ان کے مقام میں اور اضافہ کیا۔ چنانچہ سیدنا عتاب بن اسیدؓ گورنر مکہ کو آپ نے مکہ کی گورنری پر برقرار رکھا۔

(استیعاب جلد ۳ ص ۵۳، تہذیب التہذیب جلد ۷ ص ۸۹)

Marfat.com

عہد فاروقی اور بنوامیہ

عہد فاروقی میں سیدنا ابوعبیدہ بن الجراحؓ کی وفات کے بعد ۱۸ھ میں سیدنا فاروق اعظمؓ کی طرف سے سیدنا یزید بن ابی سفیانؓ فلسطین کے گورنر مقرر ہوئے اور قیساریہ کی مہم ان کے سپرد ہوئی۔ مسلمان اس وقت قیساریہ کا محاصرہ کیے ہوئے تھے۔ یزیدؓ سیدنا عمرؓ کے حکم کے مطابق سترہ (۱۷) ہزار فوج لے کر ان کے امداد کو پہنچے اور اپنے بھائی سیدنا معاویہؓ کو اپنا قائم مقام بنا کر واپس فلسطین لوٹ آئے۔ سیدنا معاویہؓ نے اس مہم کو سر کر کے ان کے پاس اس کی اطلاع بھیجی اور انہوں نے مدینہ الرسول میں سیدنا فاروق اعظم کو اس کی اطلاع بھجوائی۔ (فتوح البلدان بلاذری ص ۱۴۷)

عہد فاروقی میں جب عمواس کی تاریخی طاعون میں سیدنا یزید بن ابی سفیانؓ کا انتقال ہو گیا۔ تو سیدنا فاروق اعظم نے ان کی جگہ ان کے چھوٹے بھائی سیدنا معاویہؓ کو شام کے صوبے کا گورنر مقرر فرمایا۔ (ہسٹری آف دی عربز ص ۱۵۴، فتح الباری جلد ۷ ص ۷۲) خود سیدنا یزیدؓ کے زمانے میں بھی آپ اسلامی فوج کے علم بردار تھے اور جس لشکر نے صیدا، عرقہ اور بیروت وغیرہ علاقوں کو فتح کیا اس کے ہراول دستہ کی قیادت سیدنا معاویہؓ ہی فرما رہے تھے۔ (ہسٹری آف دی عربز ص ۱۴۷)

علامہ ذہبیؒ نے لکھا ہے کہ یزید بن ابی سفیانؓ کو لوگ "یزید الخیر" کے نام سے پکارتے تھے۔

اسلم یوم الفتح وحسن اسلامه وشهد حنیناً

"یہ فتح مکہ کے روز اسلام لائے اور ان کا اسلام حسن وخوبی کے لحاظ سے اپنی مثال آپ تھا اور آپ نے جنگ حنین میں بھی شرکت فرمائی۔"

ایک اور مقام پر علامہ ذہبیؒ فرماتے ہیں:

"سیدنا یزیدؓ شرافت، سیادت اور بزرگی وعظمت کے لحاظ سے ایک جلیل القدر انسان تھے اور یہ ان چار نیک صفت امراء میں سے تھے جن کو سیدنا ابوبکر صدیقؓ نے شام کی فتح کے وقت متعین فرمایا تھا"۔ (تاریخ اسلام جلد ۲ ص ۶۷)

ساحل شام پر واقع شہر قیساریہ کو فتح کرنے کے بعد ۱۹ھ میں ان کا انتقال ہو

گیا۔ علامہ ذہبیؒ نے لکھا ہے کہ

"دمشق جب فتح ہو گیا تو سیدنا عمرؓ نے انہیں وہاں کا گورنر مقرر فرمایا اور ان کی وفات کے بعد ان کے بھائی معاویہؓ کو وہاں کا گورنر مقرر فرمایا"۔

(تاریخ الاسلام جلد۲ ص ۱۸)

عہد عثمانی اور بنوامیہ

عہد عثمانی میں بھی بنوامیہ کو ان کا جائز مقام حاصل رہا۔ ان کے عہد خلافت میں بنوامیہ کی اگلی نسل جوان ہو چکی تھی اس وجہ سے انہوں نے ان کی خداداد صلاحیتوں سے فائدہ اٹھایا۔ سیدنا عثمانؓ کا تعلق چونکہ خود بھی بنوامیہ سے تھا اس وجہ سے کچھ لوگوں نے آپ پر اقربا نوازی کا الزام لگایا کہ انہوں نے اپنے قریبی عزیزوں سیدنا ولید بن عقبہؓ، سیدنا عبداللہ بن عامرؓ، سیدنا عبداللہ بن سعدؓ اور سیدنا سعید بن العاصؓ کو حکومت کے مختلف عہدوں پر فائز کیا حالانکہ آپ نے ان کی قابلیتوں اور صلاحیتوں کی وجہ سے ان کو یہ عہدے عطا فرمائے تھے۔ چنانچہ ہم نے اس الزام کا جواب اپنی کتاب سیرت سیدنا عثمانؓ میں تفصیل سے دیا ہے۔ اہل علم وہاں ملاحظہ فرمالیں۔

علاوہ ازیں سیدنا عثمانؓ کے چچا زاد بھائی اور داماد سیدنا مروان بن الحکمؓ کو اپنا کاتب بنایا۔ انہی سیدنا مروانؓ کے پوتے سیدنا عمر بن عبدالعزیزؒ تھے جنہوں نے بنوامیہ کے عہد حکومت میں ان تمام خرابیوں کو دور کرنے کی پوری پوری کوشش کی جو مرور زمانہ سے خلافت اسلامیہ میں پیدا ہو چکی تھیں۔

مروان بن الحکمؓ

سیدنا مروان بن الحکمؓ سیدنا عثمان بن عفانؓ کے چچا زاد بھائی تھے۔ آپ کی والدہ آمنہ بنت علقمہ بن صفوان تھی۔ ان کی کنیت ام عثمان تھی (تہذیب التہذیب جلد۱۰ ص ۹۱) آپ کے والد حکم بن العاصؓ فتح مکہ کے روز مسلمان ہوئے۔ سیدنا مروانؓ اس وقت بچے تھے کیونکہ یہ سن ۲ھ میں پیدا ہوئے تھے۔ اس لحاظ سے فتح مکہ کے وقت آپ کی عمر چھ سال تھی اور رسول اللہ صلی علیہ وسلم کے انتقال کے وقت آٹھ سال۔

(الاصابہ جلد۳ ص ۴۷۷، استیعاب جلد۳ ص ۴۲۵، تہذیب التہذیب جلد۱۰ ص ۹۱)

Marfat.com

بعض روایات میں ہے کہ سیدنا مروانؒ کے والد حکم بن ابی العاصؓ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض ناشائستہ حرکات کی وجہ سے طائف سے جلاوطن کر دیا تھا لیکن یہ روایت، درایت اور روایت کے اصولوں کے بالکل خلاف ہونے کی وجہ سے غلط ہے، کیونکہ اس واقعہ کی تمام اسناد منقطع ہیں۔ کسی صحابی رسولؐ نے اس واقعہ کو نقل نہیں کیا اور نہ ہی معتبر تواریخ میں اس کا کوئی اتا پتا ملتا ہے۔ علامہ ابن عبدالبرؒ نے اس واقعہ کو بغیر کسی سند کے نقل کیا ہے۔ (ملاحظہ ہو استیعاب جلد ا ص ۳۶۷) ابن اثیر اور ابن قتیبہ نے بھی حکم کی جلاوطنی کی روایت کو بغیر کسی سند کے نقل کیا ہے (اسد الغابہ جلد ۲ ص ۳۴۴، کتاب المعارف لا بن قتیبہ ص ۱۵۴) علامہ بلاذریؒ نے جو سند اس واقعہ کی نقل کی ہے اس میں کذاب اور مجہول راوی بھی ہیں جو رافضی ہیں۔ (انساب الاشراف جلد ۵ ص ۲۷) اسی وجہ سے شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہؒ اس واقعہ کے بارہ میں لکھتے ہیں:

كثير من اهل العلم ينكرذ الك ويقول انه ذهب باختيار ه وان نفيه ليس له اسناد

(منہاج السنہ جلد ۳ ص ۱۸۶)

"اکثر اہل علم نے اس واقعہ کی صحت سے انکار کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ وہ اپنی مرضی سے طائف گئے تھے اور ان کی جلاوطنی کے واقعہ کی کوئی سند بھی نہیں۔"

بنوامیہ اور ان کے افراد کو بدنام کرنے کے لیے مخالفین نے جیسی اور روایات وضع کیں ویسے ہی یہ روایت بھی گھڑی ہوئی ہے۔ جلاوطنی کی یہ روایت کیسے صحیح ہو سکتی ہے۔ کیونکہ واقعات اس کی تردید کرتے ہیں۔ چنانچہ شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ ہی نے لکھا ہے کہ سیدنا مروانؒ کے والد حکم نے سب لوگوں کے ساتھ حجتہ الوداع میں شرکت بھی کی اور حجتہ الوداع کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس جہان فانی میں چند روز ہی رہے۔ ان ایام میں آپ نے انہیں جلاوطن نہیں کیا اور علامہ ابن سعدؒ نے تو صاف لکھا ہے۔ کہ وہ فتح مکہ کے بعد مکہ ہی میں سیدنا عثمان کی خلافت تک مقیم رہے۔

(طبقات ابن سعد جلد ۵ ص ۳۳۱)

بعض لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مروان بن الحکمؓ کے والد کے لیے بددعا اور لعنت کی تھی، لیکن حافظ ابن حجرؒ نے اس کی تردید کی ہے۔

Marfat.com

چنانچہ انہوں نے ابن السکن کے حوالے سے لکھا ہے:

"حکمؓ پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بددعا کرنا ثابت نہیں ہے"۔

(اصابہ جلد ا ص ۳۴۵)

ابن اثیر اور دوسرے کئی ایک مورخین نے سیدہ عائشہ سلام اللہ علیہا سے ایک روایت نقل کی ہے بلکہ بخاری میں یہ روایت موجود ہے کہ جب سیدنا مروانؓ نے اکابر مدینہ کو جمع کر کے یزید بن معاویہ کی ولی عہدی کی بات ان کے سامنے پیش کی تو پورے اجتماع میں سیدنا عبدالرحمٰن بن ابی بکرؓ نے کوئی چبھتی ہوئی بات کہی جس پر مروانؓ کو غصہ آ گیا اور سیدنا عبدالرحمٰن بن ابی بکرؓ اس اجتماع کو چھوڑ کر چلے گئے۔ (بخاری جلد ۲ ص ۷۱۵) اس پر سیدہ عائشہؓ نے سیدنا مروانؓ کو مخاطب کر کے فرمایا:

یا مروان! فاشهد ان رسول الله صلى الله عليه وسلم لعن اباك وانت فى صلبه

(اسد الغابہ جلد ۲ ص ۳۴)

"اے مروان! میں اس بات کی گواہی دیتی ہوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تیرے باپ پر لعنت فرمائی جب کہ تو اس کی پیٹھ میں تھا"۔

یہ روایت بھی غلط ہے جس کی تفصیل ہم نے اپنی کتاب سیدنا مروان بن الحکمؓ میں کی ہے۔ اہل علم وہاں ملاحظہ فرمالیں۔ لیکن ایک دلیل اس کی یہ بھی ہے کہ یہ بات سیدہ عائشہ نے اس وقت بیان فرمائی جب یزید کی ولی عہدی کا معاملہ سیدنا مروانؓ نے اکابر صحابہ کرامؓ کے سامنے پیش کیا۔ اور یزید کی ولی عہدی کا واقعہ ۵۶ ھ میں پیش آیا۔ (طبری جلد ۴ ص ۲۲۴) بلکہ مسعودی نے سنہ ۵۹ ھ میں لکھا ہے (مروج الذہب جلد ۳ ص ۳۶) اور سیدنا عبدالرحمٰن بن ابی بکرؓ کی وفات سنہ ۵۳ ھ میں ہو چکی تھی۔ وہ تو اس واقعہ کے وقت زندہ بھی نہ تھے۔

(مستدرک حاکم جلد ۳ ص ۴۷۵، المعارف ابن قتیبہ ص ۲۶، تہذیب التہذیب جلد ۶ ص ۱۴۷)

لہذا اس روایت سے سیدنا مروانؓ اور ان کے والد پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بددعا اور لعنت ثابت نہیں ہوتی۔

مستدرک حاکم میں ایک اور روایت سیدنا عبدالرحمان بن عوفؓ سے مروی ہے کہ

Marfat.com

مروان بن الحکمؓ جب پیدا ہوئے تو انہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں دعا اور برکت کے لیے پیش کیا گیا۔ آپ نے فرمایا:

هوالوزغ بن الوزغ الملعون ابن الملعون

(مستدرک حاکم جلد۴ ص۴۷۹)

"یعنی یہ گرگٹ کا بیٹا گرگٹ ہے اور ملعون کا بیٹا ملعون ہے۔"

یہ روایت بھی بالکل غلط ہے کیونکہ!

۱۔ سیدنا مروانؓ سنہ۲ ھ میں مکہ مکرمہ میں پیدا ہوئے۔ اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ طیبہ میں تھے۔ کیا ان کے والد مکہ سے مدینہ انہیں حضور علیہ الصلواۃ والسلام سے دعا برکت کے لیے لائے تھے؟ جو کہ ناممکن اور محال ہے۔

۲۔ سیدنا مروانؓ کے والد حکمؓ اس وقت تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان ہی نہیں لائے تھے، لہذا کافر ہونے کے ناطے وہ دعا و برکت کے لیے انہیں آپ کی خدمت میں کیسے پیش کر سکتے تھے؟

۳۔ اس روایت کو اگرچہ حاکم نے صحیح کہا ہے لیکن یہ روایت بالکل غلط ہے کیونکہ اس روایت کا ایک روای مغیرہ ہے جو کہ غالی شیعہ ہے جس کی وجہ سے علماء نے اس کی حدیثوں سے انکار کیا ہے۔ (تہذیب التہذیب جلد۱۰ ص۲۹۷)

ابن ابی حاتم نے بھی اپنی کتاب الجرح والتعدیل میں اس پر کذاب ہونے کا کہا ہے۔ لہذا معلوم ہوا کہ یہ حدیث موضوع ہے۔

سیدنا مروانؓ صغار صحابہ کرامؓ میں سے ہیں اور صحابہ کے اس زمرہ میں شامل ہیں جن میں سیدنا عبداللہ بن عمرؓ، سیدنا حسنؓ، سیدنا حسینؓ، سیدنا عبداللہ بن جعفر طیارؓ، سیدنا مسور بن مخرمہؓ اور سیدنا عبداللہ بن عامرؓ شامل ہیں۔ چنانچہ حافظ ابن کثیرؒ نے لکھا ہے۔

وهو صحابی عند طائفة كثيرة لانه ولد فی حياة النبی صلی الله عليه وسلم

"اور اکثر لوگوں کے نزدیک وہ صحابی ہیں کیونکہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ میں پیدا ہوئے۔" (البدایہ والنہایہ جلد۸ ص۲۵۷)

سیدنا ابوبکرؓ اور سیدنا عمرؓ کے زمانہ میں کوئی قابل ذکر واقعہ ان کی طرف منسوب

Marfat.com

نہیں ہے۔ سیدنا عثمانؓ نے ان کی علمی اور فکری قابلیتوں کی وجہ سے اپنے عہد خلافت میں انہیں اپنا کاتب مقرر فرمایا۔ یہ سیدنا عثمانؓ کے داماد بھی تھے اور آپ کی صاحبزادی ام ابان بنت عثمانؓ آپ کے نکاح میں تھیں۔ (نسب قریش ص ۱۱۲ تحت اولاد عثمان) حکمؒ آپ کے چچا تھے اس لحاظ سے سیدنا مروانؒ آپ کے چچا زاد بھائی بھی تھے۔ ہمارے ارباب تاریخ نے بتایا ہے کہ انہوں نے اپنی سیکرٹری شپ کے زمانہ میں سیدنا عثمانؓ کے خلاف فتنہ برپا کیا تھا۔ حالانکہ یہ بات سراسر غلط ہے۔

سیدنا عثمانؓ کے زمانہ میں ان کی طرف ایک خط منسوب کیا جاتا ہے کہ انہوں نے گورنر مصر کو خط میں لکھا تھا کہ جب حامل خط آپ کے پاس پہنچے تو اس کو قتل کر دیں یہ بھی سب غلط ان کی طرف منسوب کیا گیا ہے جس کی تفصیل کے لیے ہماری کتاب "سیدنا مروان بن الحکمؒ ملاحظہ فرمائیں۔

اصل بات یہ ہے کہ یہ امت مسلمہ کے اکابر اور فقہا میں سے تھے۔ جیسا کہ ابو بکر بن عربیؒ نے لکھا ہے (العواصم بن القواصم ص ۷۹) ایک موقع پر سیدنا معاویہؓ نے ان کی علمی عظمت وفضیات کے بارہ میں فرمایا تھا:

القاری لکتاب اللّٰہ ، الفقیہ فی دین اللّٰہ ، الشدید فی حدوداللّٰہ

"یہ کتاب اللہ کے قاری' دین کے فقیہ اور اللہ کے حدود کے قائم کرنے میں سخت تھے۔" (البدایہ والنہایہ جلد ۸ ص ۲۵۷، سیر اعلام النبلاء جلد ۳ ص ۴۷۷)

حافظ ابن حجرؒ نے لکھا ہے کہ:

کان یعد فی الفقہاء (الاصابہ جلد ۳ ص ۴۷۷)

ان کا شمار فقہائے امت میں سے ہوتا تھا۔

شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہؒ نے لکھا ہے کہ:

"اہل صحاح نے ان کی کئی احادیث کی تخریج کی ہے اور وہ اہل فتوی میں سے ہیں"

(منہاج السنہ جلد ۳ ص ۱۸۹)

"سیدنا حسنؓ اور سیدنا حسینؓ ان کی اقتداء میں ہمیشہ نمازیں پڑھتے تھے۔"

(ملاحظہ ہو بحار الانوار، مجلسی جلد ۱۰ ص ۱۳۹)

Marfat.com

فاروق اعظمؓ سے تعلق

سیدنا عمر بن خطابؓ کی شخصیت ایک نہایت خوبصورت اور بارعب شخصیت تھی۔ دوسرے لفظوں میں آپ جلال و جمال کا آمیزہ تھے، لمبے دھڑنگے اور مضبوط جسم کے مالک تھے۔ آپ کے صاحبزادے سیدنا عبداللہ بن عمرؓ بیان فرماتے ہیں کہ میرے والد سرخ وسفید اور مضبوط جسم کے مالک تھے۔ آپ تنگی اور فراخی ہر حالت سے بخوبی عہدہ برآ ہوسکنے کی بھرپور صلاحیت رکھتے تھے۔ دونوں ہاتھوں سے یکساں قوت کے ساتھ کام کر لیتے تھے۔

(طبقات ابن سعد جلد ۳ ص ۲۳۵)

جسمانی وجاہت وہیبت کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے عقل وخرد کی خوبیاں بھی فراوانی سے عطا فرمائی تھیں۔ اگرچہ عالم شباب ہی میں سیدنا عمرؓ کو قومی مسائل اور ان کی اصلاح کے طریقوں پر غور وفکر کا موقع بہم پہنچایا گیا اور عزت نفس کے احساس نے ان کی رائے میں عصبیت پیدا کی، پھر ان کے مزاج کی سختی اور ان کے جسم کی توانائی نے اس عصبیت کو تشدد کی حد تک پہنچایا یہاں تک کہ وہ اپنی بات منوانے کے لیے زبان کی حدت کے ساتھ بازو کی قوت سے بھی کام لے لیا کرتے تھے، لیکن دوسرے کی بات کو بڑے غور سے سننے کی خوبی بھی اللہ نے ان میں ودیعت فرمائی تھی۔ دوسرے کی بات وہ اس لیے بڑے غور سے سنتے تھے تاکہ انہیں رد کریں تو قطعی دلیل سے اور ختم کریں تو بھی پوری قوت سے اور قبول کریں تو بھی قلب کی اتھاہ گہرائیوں سے۔

قبول اسلام کے بعد اس سختی میں کچھ افاقہ ہوا اور قدرے نرمی پیدا ہوئی لیکن دین اسلام اور سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں کوئی رورعایت گوارا نہ تھی۔ جونہی کوئی شخص دین اسلام کے بارہ میں یا سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارہ میں کوئی نازیبا بات کہتا تو سیدنا عمرؓ کی رگ فاروقی فوراً پھڑک اٹھتی۔ تاریخ اسلام میں کئی ایسے واقعات ملتے ہیں جن میں شمشیر فاروقی فوراً گستاخ رسولؐ کو مزہ چکھانے کے لیے برہنہ ہو جاتی۔ آپ کے مزاج کی اسی سختی کی وجہ سے صحابہ کرامؓ نے اس وقت ان کی مخالفت کی جب سیدنا ابوبکرؓ ان کو اپنا جانشین نامزد فرما رہے تھے۔ خصوصی طور پر سیدنا عبدالرحمٰن بن عوفؓ اور سیدنا طلحہ بن عبیداللہؓ نے تو بہت ہی مخالفت کی اور رائے ظاہر کی کہ ان کو خلیفہ نامزد نہ کیا جائے بلکہ

Marfat.com

ابن اسیر نے لکھا ہے کہ سیدنا طلحہؓ نے کہا: ''اے ابو بکر! آپ کو معلوم ہے کہ عمرؓ کے مزاج میں کس قدر شدت اور حدت ہے، اس کے باوجود آپ ان کو اپنا جانشین نامزد فرما رہے ہیں تو کل اپنے پروردگار کو جب وہ آپ سے باز پرس کرے گا کیا جواب دیں گے؟'' (ابن اثیر جلد۲ ص۲۹۲) سیدنا ابوبکرؓ، سیدنا طلحہؓ کی یہ بات سُن کر غصہ میں آ گئے اور اس کی بات پر یہ جواب دیا کہ ''سختی اسی وقت تک ہے جب تک ان پر خلافت کا بار نہیں پڑتا۔ جب خلافت کی ذمہ داری ان پر پڑے گی تو اس کے بار کی وجہ سے وہ خود نرم ہو جائیں گے''۔

سیدنا خالد بن ولیدؓ کی معزولی بھی آپ کے مزاج کی سختی کا ایک ثبوت ہے لیکن دوسری طرف آپ اتنے نرم دل بھی تھے کہ ۱۸ھ میں جب عرب میں قحط پڑا تو دیکھنے والوں کا بیان ہے کہ سیدنا عمرؓ کی بے قراری دیدنی تھی۔ قحط کو دور کرنے کی ہر ممکن کوشش کی اور خود تمام مرغوب غذائیں یک قلم ترک کر دیں اور ہر قسم کے عیش وطرب سے اجتناب برتا اور راتوں کو اٹھ اٹھ کر بارگاہ خداوندی میں روتے تھے۔ (کنزالعمال جلد ۶ ص ۳۴۳)

مزاج کی حدت اولاد میں

مزاج کی یہ حدت اور شدت سیدنا عمرؓ کی اولاد میں بھی منتقل ہوئی۔ چنانچہ آپ کی قریباً قریباً تمام اولاد کے مزاج میں تیزی تھی حتی کہ سیدہ حفصہؓ ام المومنین کے بارہ میں بھی کتابوں میں مرقوم ہے کہ آپ کے مزاج میں قدرے حدت تھی۔

اولاد مذکور میں سب سے زیادہ مشہور سیدنا عبداللہ بن عمرؓ ہیں۔ یہ جنگ احد میں جو سنہ ۳ھ میں ہوئی چودہ برس کے تھے۔ سیدنا عمرؓ کے ایمان لانے کے وقت ان کی عمر قریباً پانچ سال تھی۔ سیدنا عبداللہ بن عمرؓ کی زندگی کے واقعات کا تسلسل یہ بتاتا ہے کہ جب وہ کسی کام کا عزم کر لیتے تو پھر نتائج کی پروا کیے بغیر اس میں درّانہ گھس جاتے اور دنیا کی کوئی طاقت انہیں اپنے ارادوں سے باز نہ رکھتی تھی۔ یہ بات آپ میں موروثی تھی۔

سیدنا عمرؓ کے دوسرے صاحبزادے عاصمؒ تھے۔ یہ بھی نہایت عالم وفاضل اور تقویٰ وطہارت میں اپنی مثال آپ تھے۔ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ہی میں پیدا ہوئے تھے۔ اس وجہ سے انہیں بھی صحابیت کا شرف حاصل ہے بعض کتابوں میں ہے کہ آپ کی پیدائش رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد ہوئی لیکن ذہبیؒ نے اس

Marfat.com

بات کو ترجیح دی ہے کہ آپ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں پیدا ہوئے۔ (دول الاسلام جلد ا ص ۳۷) ہمارے نزدیک یہی روایت درست ہے۔ سنہ ۷۰ ھ میں ان کا انتقال ہوا۔ سیدنا عبداللہ بن عمرؓ نے اپنے اس چھوٹے بھائی کا مرثیہ لکھا جس کا ایک شعر یہ تھا۔

فلیت المنایا کن خلفن عاصماً
فعشنا جمیعا اُو ذھبن بنا معاً

''یعنی کاش موت عاصم کو چھوڑ جاتی تا کہ ہم سب ایک ساتھ زندگی گذارتے یا پھر ہم سب کو لے جاتی۔'' (کتاب المعارف لابن قتیبہ ص ۸۱)

اپنے بھائی سیدنا عبداللہ بن عمرؓ کی طرح سیدنا عاصم کو بھی اللہ تعالیٰ نے بہت سی ممتاز صفات سے نوازا تھا۔ احادیث اپنے والد سے سنیں اور روایت کیں۔ فقہ میں بھی خاص درک تھا۔ جوان ہوئے تو مختلف محاذوں پر جہاد میں شرکت کی۔ اور سنہ ۲۷ ھ میں عبداللہ بن ابی سرحؓ کی سپہ سالاری میں جو لشکر افریقہ کی فتح کے لیے گیا تھا، اس کے مجاہدین میں بھی آپ کا نام ملتا ہے۔ تاریخ کی کتابوں میں ہے کہ آپ نے ان جنگوں میں جہاد کا پورا پورا حق ادا کیا اور افریقہ میں مجاہد بن کر داخل ہوئے اور فاتح بن کر واپس آئے۔ اس جہاد سے واپسی کے بعد اپنی باقی ماندہ زندگی مدینہ الرسول ہی میں گزاری اور ایک روایت کے مطابق سنہ ۶۳ ھ میں اور دوسری روایت کے مطابق سنہ ۷۰ ھ میں اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ (ریاض النفوس جلد ا ص ۸۹، النجوم الزاھرہ لابی المحاسن جلد ا ص ۱۸۵) قیام مدینہ کے دوران لوگوں کو حدیث وفقہ کی تعلیم دیتے رہے۔ آپ ایک بہت اچھے شاعر تھے۔ علم وادب کا ایک خاص ذوق اللہ تعالیٰ نے ودیعت فرما رکھا تھا۔ جسمانی طور پر نہایت بلند قامت اور جسیم وشحیم تھے۔

کتابوں میں ان کے بارہ میں آتا ہے کہ ان کی والدہ کا تعلق ایک انصاری خاندان سے تھا اور نام جمیلہ تھا۔ سیدنا عمرؓ نے کسی وجہ سے اس کو طلاق دے دی اور سیدنا عاصمؒ اپنی نانی کے پاس رہنے لگے۔ ایک روز سیدنا عمرؓ کا ادھر سے گزر ہوا۔ دیکھا کہ ان کا بیٹا عاصم مسجد کے صحن میں کھیل رہا ہے۔ سیدنا عمرؓ نے اسے بازو سے پکڑا اور اپنے آگے سواری پر بٹھا لیا۔ بچہ کی نانی آئی اور سیدنا عمرؓ سے جھگڑنے لگی یہاں تک کہ دونوں سیدنا ابوبکرؓ کے پاس آئے۔ سیدنا عمرؓ نے کہا: ''یہ میرا بیٹا ہے۔'' اس عورت نے کہا: ''یہ میرا بیٹا

Marfat.com

ہے"۔ سیدنا ابوبکرؓ نے فرمایا:

"بچہ اس کی نانی کے پاس رہنے دیا جائے"۔ چنانچہ سیدنا عمرؓ نے سیدنا ابوبکرؓ کا یہ فیصلہ خاموشی سے قبول کرلیا"۔

(موطاامام مالک جلد ۲ ص ۷۶۷ ، سنن کبریٰ بیہقی جلد ۸ ص ۵ ، مصنف عبدالرزاق جلد ۷ ص ۱۵۴)

سیدنا عمرؒ کے اس صاحبزادہ کو اللہ تعالیٰ نے بے شمار خصوصی صفات سے نوازا تھا۔ تمام عمر فضول اور بیہودہ باتوں سے کلی طور پر اجتناب کرتے رہے۔ شرم وحیاء اور عفت وپاک دامانی ان کا خصوصی شعار تھا۔ ہر معاملہ میں سلامتی اور خیر وصلاح کو ترجیح دیتے تھے۔ فطرتاً کم گو اور خاموش طبع تھے۔ غصہ یا جھگڑا ہونے کا گمان ہوتا تو مجلس کو چھوڑ دیتے تھے۔ اگرچہ سیدنا عمرؓ سے وراثتاً مزاج میں حدت اور شدت تھی لیکن ہر ممکن کوشش کرتے کہ مزاج ٹھنڈا رہے۔ چنانچہ ایک مرتبہ آپ کا ایک شخص سے کسی زمین کے سلسلہ میں کچھ تنازعہ ہو گیا۔ وہ شخص آپ کو خوب صلواتیں سُنانے لگا۔ آپ نہایت خاموشی کے ساتھ اس کی صلواتیں سُنتے رہے، آخر میں اس شخص نے آپ کو دھمکا کر کہا اگر آپ سچے ہیں تو اس زمین پر قبضہ کرلیں۔ سیدنا عاصمؒ نے اس کی بات کا جواب دیتے ہوئے فرمایا: "چونکہ میری وجہ سے آپ کو غصہ آیا ہے، لہذا یہ زمین آپ ہی کی ہے"۔ آپ کا یہ جواب سُن کر اس شخص پر گھڑوں پانی پڑ گیا اور وہ ندامت وخجالت سے کہنے لگا: "نہیں، یہ زمین میری نہیں بلکہ آپ کی ہے۔ مختصر یہ کہ زمین پر ان دونوں میں سے کسی نے قبضہ نہ کیا حتی کہ دونوں فوت ہو گئے۔ پھر ان دونوں کی اولاد میں سے بھی کسی نے اس زمین سے تعرض نہ کیا اور وہ فقراء اور مساکین کے لیے چھوڑ دی گئی۔

(سیرۃ عمر بن عبدالعزیز لابن عبدالحکم ص ۱۶، ریاض النفوس جلد ۱ ص ۷۷ لابی بکر المالکی)

بنو ہلال کی پاکباز دوشیزہ سے شادی

سیدنا عاصم بن عمرؒ کی شادی کا بھی ایک عجیب واقعہ ہے۔ آپ کی شادی بنو ہلال کی ایک نہایت ذہین، زیرک اور دیانت دار اور پاکباز دوشیزہ سے ہوئی جس کا واقعہ کتابوں میں کچھ اس طرح مرقوم ہے کہ ایک رات سیدنا فاروق اعظمؓ حسب معمول لوگوں

کے حالات معلوم کرنے کے لیے مدینہ طیبہ کی گلیوں میں گشت کر رہے تھے۔ اتفاقاً آپ کو کچھ تھکن سی محسوس ہوئی اور آپ ایک دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔ اتنے میں آپ نے سُنا کہ ایک بڑی بی اپنی بچی سے کہہ رہی تھی کہ "کل مدینہ میں بازار لگتا ہے، لہذا دودھ میں تھوڑا سا پانی ملا دے۔" اس بچی نے والدہ سے کہا: "اماں! امیرالمومنین کا حکم ہے کہ کوئی شخص کھانے پینے کی اشیاء میں ملاوٹ نہ کرے۔ بڑی بی نے جواب دیا: "امیرالمومنین! ہمیں کون سا دیکھ رہے ہیں، وہ تو اس وقت گھر میں سوئے ہوں گے۔" جب کہ امیرالمومنین ان کی ساری باتوں کو سُن رہے تھے۔ اس لڑکی نے یہ جواب دیا کہ "مجھ سے یہ کبھی نہیں ہو سکتا کہ امیرالمومنین کے سامنے تو اس کی اطاعت کروں اور ان کی غیر موجودگی میں نافرمانی کروں۔"

سیدنا فاروق اعظمؓ کو ان باتوں پر بڑا تعجب ہوا۔ آپ اس نادار، دیانت دار اور زیرک و ذہین لڑکی کی باتوں سے بڑے متاثر ہوئے کہ خیموں میں رہنے والی ایک لڑکی باوجود ناداری اور قلاشی کے اس قدر دیانت دار ہے۔ کیونکہ دودھ میں پانی ملانے سے دودھ زیادہ ہوگا اور پیسے زیادہ آئیں گے۔ فاروق اعظمؓ کو یہ پتہ نہیں تھا کہ بچی کو دودھ میں پانی ملانے کا حکم دینے والی عورت اس کی ماں ہے وگرنہ آپ کی حیرانی میں اور بھی اضافہ ہو جاتا۔ آپ کو اس بات پر بھی تعجب ہوا کہ ایک بچی بڑی بی کو نیکی کی تلقین کر رہی ہے اور ماں عمر رسیدہ اور سمجھ دار ہو کر بھی نیکی کی طرف مائل نہیں ہے۔

سیدنا فاروق اعظمؓ کے دل میں یہ خیال گزرا کہ کاش کہ اس عورت کو بیوی بنا لیا جائے کیونکہ یہ اولاد کی نہایت اچھے طریقے سے تربیت کر سکتی ہے، چنانچہ آپ تو اس وقت عمر کے اس حصے میں تھے کہ اس دوشیزہ سے شادی نہیں کر سکتے تھے اور عورتوں کی طرف آپ کی رغبت بھی نہیں تھی۔ آپ نے اپنے غلام اسلم سے فرمایا کہ اس خیمے کو ذہن میں رکھو۔ صبح اسلم سے کہا کہ اس جگہ جا کر دیکھو اور اس بات کی تحقیق کرو کہ یہ بات کن دو کے درمیان ہوئی۔ اور کیا یہ دونوں عورتیں شادی شدہ ہیں۔ اسلمؓ صبح گئے اور حقیقت حال کا پتہ چلایا۔ معلوم ہوا کہ لڑکی دوشیزہ اور غیر شادی شدہ ہے اور وہ خاتون جو دودھ میں پانی ملانے کی ترغیب دے رہی تھی وہ اس دوشیزہ کی والدہ ہے۔ ان کے گھر میں کوئی مرد نہیں اور اس خاتون کا تعلق بنی ہلال سے ہے۔ سیدنا فاروق اعظمؓ نے اپنے بیٹوں کو بلوا کر پوچھا: کیا تم

میں سے کوئی شادی کرنا چاہتا ہے؟ کیونکہ فلاں لڑکی سے بہتر اس وقت میرے ذہن میں کوئی اور لڑکی نہیں۔ عاصمؒ نے کہا: ابا جان! میری چونکہ بیوی نہیں لہذا آپ میری شادی اس عورت سے کرا دیں آپ نے فرمایا: بیٹا! جاؤ اور اس سے نکاح کر لو کیونکہ یہ اس لائق ہے کہ اس سے ایک ایسا بچہ پیدا ہو جو مشہور بھی ہو اور عرب کا سردار بننے کی صلاحیت بھی رکھتا ہو۔ چنانچہ سیدنا عاصمؒ وہاں گے اور اس بچی سے نکاح کر لیا۔

(سیرت عمر بن عبدالعزیز لابن عبدالحکم ص ۱۷، لابن الجوزی ص ۶۵)

وہ لڑکی بنی ہلال سے تھی۔ خاوند کی نہایت وفاشعار اور اطاعت گزار بیوی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے اس سے ایک لڑکی عطا فرمائی جس کا نام "ام عاصم" رکھا گیا۔ وہ بچی نہایت ہونہار تھی۔ باپ نے نہایت اچھے طریقہ سے اس کی پرورش اور تربیت کی۔ ماں نے بھی اپنی ساری ذہانت اور اپنی ساری خوبیاں اس میں سمو دیں۔ انہوں نے احادیث نبویہ اپنے دادا سیدنا فاروق اعظمؓ اور اپنے والد عاصمؒ سے روایت کیں۔ چنانچہ اس کی روایت کردہ ایک حدیث "نعم الادام الخل" (یعنی بہترین سالن سرکہ ہے) (کتاب الاغانی جلد ا ص ۱۵۵) اپنی والدہ کی طرح ام عاصم تقویٰ وطہارت میں اپنی مثال آپ تھیں۔ پھر سیدنا فاروق اعظمؓ کے گھرانہ میں پرورش پانے کی وجہ سے ان میں یہ خوبیوں سے جلا پیدا ہوگئی۔ بالآخر عاصمؒ کی شادی سیدنا مروانؒ کے صاحبزادے عبدالعزیز سے ہوگئی اور دونوں میاں بیوں نہایت اچھی زندگی بسر کرنے لگے۔

عبدالعزیز بن مروانؒ

سیدنا مروانؒ کے کئی صاحبزادے تھے۔ جن میں عبدالملک زیادہ مشہور تھے کیونکہ وہ خلیفہ ہونے کے ساتھ ساتھ ایک جلیل القدر عالم بھی تھے۔ بڑے بڑے آئمہ دین ان کے علمی فضل وکمال کے معترف تھے۔ سیدنا مروانؒ کے ایک صاحبزادے عبدالعزیز تھے۔ جن کو اللہ تعالیٰ نے مختلف خوبیوں سے نوازا تھا۔ مدینہ طیبہ میں پلے بڑھے تھے اس لیے مدینہ کے پاک وصاف ماحول نے آپ کو خیر وصلاح کے سانچے میں ڈھال دیا، لیکن طبیعت میں نفاست ہونے کی وجہ سے خوش پوش نوجوانوں میں سے ایک تھے۔ علم وفضل میں بھی ایک بلند مقام تھا اس وجہ سے سیدنا ابوہریرہؓ وغیرہ سے احادیث بھی روایت کرتے تھے۔ کچھ عرصہ

Marfat.com

بعد مصر کے گورنر بنا دیے گئے لہذا مصریوں کے ماحول میں رہ کر نرم طبیعت اور بہترین اطاعت گزار ہو گئے اور دل خشیت الٰہی سے معمور ہو گیا کیونکہ کہا جاتا ہے کہ مصری لوگ نہایت نرم طبیعت اور اطاعت شعار ہوتے ہیں۔ طبیعت کی اس نرمی کی وجہ سے آپ انتہائی اونچے درجے کے امیر تھے۔ آپ نے مصر وشام میں شاندار اور جاذب نظر عمارتیں دیکھی تھیں جن سے آپ متاثر تھے۔ اس وجہ سے خود بھی عمارتیں بنانے کا شوق قلب کی اتھاہ گہرائیوں میں انگڑائیاں لیتا تھا۔ چنانچہ اپنے خاندان کے امراء اور خلفاء سے عمارتوں اور گھروں کی اونچی اونچی دیواروں میں بڑھ جانا چاہتے تھے۔ انہوں نے دسیوں گھر خریدے اور خوبصورت اور پائدار مکان بنائے پھر انہیں اپنی اولاد کو ہبہ کر دیا۔

(شذرات الذہب جلد ا ص ۹۵)

مصر کی گورنری کے زمانہ میں ایک مرتبہ وہاں کے باشندوں میں طاعون پھیلا۔ عبدالعزیز وہاں ایک نہایت خوبصورت، پاکیزہ اور ہوادار مکان میں منتقل ہو گئے۔ اس مکان کو آپ نے ایک قبطی سے دس ہزار دینار میں خریدا تھا اور پھر وہاں حلوان کے شہر کی بنیاد رکھی۔ جو ساحل نیل پر واقع ہے اور اس میں اور فسطاط کے درمیان صعید کی راہ سے چھ میل کا فاصلہ ہے۔ پھر آپ نے اس میں اپنا ایک گھر بنایا اور اسے خوب آراستہ کیا۔ اس پر سونے کا پانی پھروایا اور اس کے قریب مقیاس حلوان رکھا اور اس میں باغات لگوائے اور کھجوریں اور انگور نصب کروائے۔ (ملا خطہ ہو النجوم الزاہرہ جلد ا ص ۱۸۵)

جس طرح لباس اور مکان کے بارہ میں عبدالعزیز کے شاہانہ ٹھاٹھ باٹ تھے اسی طرح مہمانوں کی خاطر تواضع کے لیے بھی ایک بہت بڑا مہمان خانہ بنایا ہوا تھا۔ اور اس کے چاروں طرف کھانا کھلانے کے لیے گنبد بنائے ہوئے تھے۔ لوگوں کو بلوا کر وہاں کھانا کھلایا جاتا تھا۔ کتابوں میں ہے کہ آپ کے گھر میں مہمانوں کا تانتا لگا رہتا تھا اور کھانا پکا پکا کر راکھ کا ڈھیر لگ جاتا تھا۔ روزانہ قریباً ایک ہزار ہنڈیا پکتی تھیں۔ جن سے مہمانون کو کھانا کھلایا جاتا ہے۔ (معجم البلدان جلد ۳ ص ۳۲۶) مہمانوں کے ہجوم کے ساتھ ساتھ سائلوں کا ہجوم بھی آپ کے پاس رہتا تھا۔ ان سائلوں کا تعلق زیادہ تر مدینہ اور حجاز سے ہوتا تھا۔ آپ نے ان کے لیے گھر تک بنوا رکھے تھے اور حلوان میں فسطاط کے کنارے کھجوروں کے باغات بھی ان کے لیے تھے۔ آپ انہیں وہ وہ عطیات مرحمت فرماتے جن کا انہیں وہم

وگمان بھی نہ ہوتا تھا۔ گویا آپ سائلوں پر سخاوت کی انتہا کر دیتے تھے۔

جب شادی کا وقت آیا تو آپ نے ایک نہایت شریف خاندان میں ایک شریف عورت سے شادی کی۔ آپ کا خیال تھا کہ خاندان کے افراد کا خاندان پر اثر ہوتا ہے، لہذا شادی ہمیشہ شریف خاندان میں کرنی چاہیے۔ اس نظریہ کے پیش نظر آپ نے سیدنا فاروق اعظمؓ کی پوتی ام عاصم سے شادی کی۔ اپنے حلال اور طیب مال سے بیگم کا حق مہر ادا کیا جو ایک روایت کے مطابق چار سو دینار تھا۔ اس شادی سے آپ کے گھر والوں اور خاندان کے لوگوں کو نہایت خوشی اور مسرت ہوئی۔ اسی خوشی میں کہا جاتا ہے کہ شادی والی رات چراغوں میں روغن زیتون کے بدلہ میں غالبہ (ایک قسم کی خوشبو جو مشک عنبر سے بنائی جاتی ہے اور وہ موم بتی کی طرح جلتی ہے اور نہایت خوشبو بکھیرتی ہے) جلائی گئی۔

Marfat.com

عمر بن عبدالعزیزؒ

نام و نسب

سیدنا عمر بن عبدالعزیزؒ کا تعلق خاندان بنو امیہ سے تھا۔ نام عمر، کنیت ابو حفص اور باپ کی طرف سے نسب نامہ یہ ہے: عمر بن عبدالعزیز بن مروان بن الحکم بن ابی العاص بن امیہ بن عبد شمس بن عبد مناف بن قصی بن کلاب۔ ان کی والدہ ام عاصم بنت عاصم بن عمر بن خطاب تھیں۔ (سیر اعلام النبلاء، ذہبی، جلد ۵ ص ۱۱۴۔۱۱۵ البدایہ والنہایہ جلد ۹ ص ۱۹۲، تہذیب الکمال فی اسماء الرجال لمزی جلد ۲۱ ص ۴۳۳) گویا سیدنا عمرؓ کی رگوں میں سیدنا فاروق اعظمؓ کا خون بھی شامل تھا، اسی وجہ سے ان کے عہد خلافت میں فاروقی اصلاحات بہت ہوئیں اور آپ نے انہیں بنیادوں اور اسی نہج پر چلانی شروع کی جو سیدنا فاروق اعظمؓ نے قائم کی تھیں اور مرور زمانہ کے باعث بعض لوگوں نے ان کو پامال کر دیا تھا۔ آپ نے اپنے عہد خلافت میں خلافتی اصولوں کی تجدید کی۔ اس وجہ سے آپ مجدد ملت بھی ہیں۔ سیدنا ابوبکرؓ کی صداقت، فاروق اعظمؓ کی عدالت، سیدنا عثمانؓ کی حیاء اور سیدنا علیؓ کا زہد آپ کی خلافت کے اجزائے ترکیبی تھے۔ آپ کے عہد میں خلافت راشدہ کا دور پھر واپس آیا جس کے بنیادی اصول سیدنا ابوبکرؓ، سیدنا عمرؓ، سیدنا عثمانؓ، اور سیدنا علیؓ نے وضع کیے تھے۔

پیدائش

روایات کے مطابق آپ کی پیدائش ۶۱ھ میں یزید بن معاویہؓ کے عہد خلافت

Marfat.com

میں مدینہ میں ہوئی (سیر اعلام النبلاء جلد۵ ص ۱۱۵، حسن المحاضرہ للسیوطی جلد۲ ص ۲۰۴) اگرچہ بعض حضرات نے سن پیدائش میں اختلاف کیا ہے لیکن زیادہ معتبر روایت یہی ہے۔ علامہ مزی نے لکھا ہے کہ عبداللہ بن داؤد فرماتے ہیں: طلحہ بن یحییٰؒ، اعمشؒ، ہشام بن عروہؒ اور عمر بن عبداللہ العزیزؒ سنہ ۶۱ھ میں پیدا ہوئے جب سیدنا حسینؓ نے میدان کربلا میں جام شہادت نوش فرمایا تھا اور خلیفہ بن خیاط نے بھی اپنی تاریخ ص ۲۳۵ میں لکھا ہے کہ آپ سنہ ۶۱ھ میں پیدا ہوئے۔ (تہذیب الکمال جلد ۲۱ ص ۴۳۶) آپ کے والد عبدالعزیز کو سیدنا مروانؓ نے عبدالملک کے بعد اپنا ولی عہد نامزد کیا تھا لیکن اللہ تعالیٰ کو ان کا خلیفہ ہونا منظور نہیں تھا اس وجہ سے وہ عبدالملک کی زندگی ہی میں اس عدم ہستی نما سے ہستی عدم نما کو انتقال فرما گئے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے عبدالعزیز کو بڑی خوبیوں سے نوازا تھا۔ وہ اپنے خاندانی اوصاف وکمالات کے حامل تھے اور مختلف مہمات میں اپنی بہادری کے جوہر دکھا چکے تھے۔ والد کے دست راست اور سائے کی طرح ہر وقت ان کے ساتھ رہتے تھے۔ باپ کو بھی ان پر بڑا اعتماد تھا۔ چنانچہ سیدنا عبداللہ بن زبیرؓ کی وفات کے بعد سیدنا مروانؓ نے جب مصر پر لشکر کشی کی تو عبدالعزیز کو ایلہ پر متعین کیا۔ مصر پر قبضہ کرنے کے بعد سیدنا مروانؓ یہاں دو ماہ مقیم رہے۔ دو ماہ کے بعد آپ اپنے بیٹے عبدالعزیز کو یہاں کا گورنر بنا کر خود شام واپس آ گئے۔ (کتاب الولاۃ کندی، ص ۴۷، ۵۴، ۵۵) عبدالعزیز نے نہایت اچھے طریقے سے مصر کا انتظام کیا۔ لوگ ان سے نہایت خوش تھے۔ اس وجہ سے سیدنا مروانؓ کے انتقال بعد ان کے صاحبزادے عبدالملکؒ بن مروانؓ نے ان کو مصر کی گورنری کے عہدہ پر برقرار رکھا اور انہوں نے یہاں ۲۱ سال گورنری کرنے کے بعد ۸۶ھ میں انتقال فرمایا۔ مورخین نے لکھا ہے کہ اتنی طویل گورنری مصر میں کسی اور کو کم ہی نصیب ہوئی ہے۔

عبدالعزیز کو اسلام اور اسلامی اقدار اور اسلامی شعائر سے بہت محبت تھی۔ رعایا کے ساتھ آپ کا نہایت اچھا سلوک تھا۔ اہل علم و دانش اور علماء وفقہا اور ارباب کمال کی نہایت قدر کرتے تھے۔ قاضی عبدالرحمٰن بن حجیرہ خولانی جو اس زمانہ کے علماء میں ایک نامور شخصیت تھے، ان کا ایک ہزار دینار سالانہ وظیفہ مقرر کیا۔ دوسرے ارباب فضل وکمال کو بھی اپنی داد و دہش سے نوازا۔ شعراء کرام کو بھی بڑے بڑے عطیات دیے یہاں تک کہ بعض شعراء نے ان کے بعد شاعری ہی کو خیرباد کہہ دیا۔ کثیر سے کسی نے پوچھا کہ "تم اب شعر

Marfat.com

کیوں نہیں کہتے۔ جواب دیا کہ عبدالعزیز کے بعد داد و دہش اور صلہ کی توقع کس سے کی جائے۔ (حسن المحاضرہ جلد۲ ص۲۴۰)

عبدالعزیز نے نہ صرف رعایا اور ارباب علم و دانش کے ساتھ ہی نیک سلوک کیا بلکہ مصر اور حلوان میں اپنی حکومت کی بہت سی یادگاریں چھوڑیں جن کو لوگ مدتوں دیکھتے رہے اور ان کی تعریف میں رطب اللسان رہے۔ انہوں نے ایک زرنگار محل تعمیر کرایا۔ حلوان میں کئی مسجدیں اور محلات تعمیر کرائے۔ مصر کی اس وقت کی جامع مسجد منہدم کرا کر اس کو از سر نو نہایت خوبصورت تعمیر کرایا۔ خلیج مصر پر پل بنوائے اور ان کے علاوہ اور کئی محلات اور عمارتیں بنوائیں۔ انگور اور خرمے کے باغات لگوائے جن سے لوگ مدتوں مستفید ہوتے رہے۔

(حسن المحاضرہ سیوطی جلد۲ ص۲۰۴، کتاب الولاۃ ص۵۵)

ان خوبیوں والے باپ کے ہاں آپ کی پیدائش ہوئی، اس وجہ سے باپ نے اپنے بیٹے میں اوصاف حمیدہ اور مرد خود آشنا اور خدا آگاہ کی خوبیاں پیدا کرنے کے لیے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا۔ وہ چاہتا تھا کہ میرا بیٹا صداقت، عدالت، سخاوت اور حکمت کا پیکر ہو، مفسر، معلم، مجاہد، صوفی اور حکمران ہو، سیدنا عبداللہ بن عباسؓ جیسا ترجمان القرآن، جرالامۃ سیدنا عبداللہ بن مسعودؓ جیسا محدث وفقیہ، سیدنا معاذ بن جبلؓ جیسا قاضی و مجتہد، سیدنا ابوذر غفاریؓ جیسا مسیح الامت، سیدنا ابوعبیدہ بن الجراحؓ جیسا امین الامۃ، سیدنا ابو ہریرہؓ جیسا صاحب فقر وغنا، سیدنا خالد بن ولیدؓ جیسا سیف اللہ اور سیدنا ابی بن کعبؓ جیسا قاری ہو۔ امام ذہبیؒ نے لکھا ہے کہ عمر بن عبدالعزیز کا بچپن مصر ہی میں گزرا اور غالباً ابتدائی تعلیم بھی وہیں مصر ہی میں حاصل کی۔ (تذکرۃ الحفاظ جلد۱ ص۱۰۵)

روایات میں ہے کہ ام عاصم کے ہاں چار بیٹے ابوبکر، عمر، محمد، اور عاصم پیدا ہوئے لیکن والدین کی صفات اور خوبیاں عمرؒ کو ورثہ میں ملیں یعنی والدین کی مجموعی صفات بھی اور والد اور والدہ کی منفرد صفات بھی۔ باپ کی طرف سے علم کا بلند پایہ ذوق اور ماں کی طرف سے حدت طبع اور فصاحت و بلاغت وغیرہ۔ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ام عاصم میں سیدنا فاروق اعظمؓ کی حدت مزاج زیادہ تھی بہ نسبت ان کے بیٹے عاصم کے، اس وجہ سے ام عاصم لغزش اور غلطی کا سخت محاسبہ کرتیں۔ اگر شوہر سے بھی غلطی ہو جاتی تو اس سے بھی باز پرس ہوتی۔

فاروق اعظمؓ کے خواب کی تعبیر

روایات میں ہے کہ سیدنا فاروق اعظمؓ نے ایک خواب دیکھا تھا۔ خواب دیکھتے ہی آپ اپنی آنکھیں ملتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ پوچھا گیا کہ آپ نے خواب میں کیا دیکھا ہے؟ فرمایا! میری اولاد میں سے ایک شخص ہوگا جس کے چہرے پر زخم کا نشان ہوگا، وہ زمین کو عدل و انصاف سے بھر دے گا۔ خواب دیکھنے کے بعد آپ فرمایا کرتے تھے: کون ہے جو میری اولاد میں اشج (زخمی) ہوگا۔ یہ ایک ایسا خواب تھا جس کی تعبیر سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ وہ کون زخمی ہوگا۔ لیکن عمرؒ کی پیدائش سے یہ امید پیدا ہوگئی کہ اس خواب کی تعبیر آپ ہیں کیونکہ آپ کے اخلاق، عادات و حرکات اور طبعی پیدائش سے اس خواب کی تعبیر کے آثار جھلکنے لگے۔ پھر یہ خواب عمر بن عبدالعزیزؒ کی شکل میں متحرک نظر آنے لگا۔

یہ ایک خواب تھا جو سیدنا فاروق اعظمؓ نے دیکھا۔ فاروق اعظمؓ کا خواب ایسے نہیں ہوسکتا تھا کہ اس کی کوئی تعبیر نہ ہو لیکن آپ کو تعجب تھا کیونکہ آپ نے اپنی تمام اولاد کو خلافت سے محروم کر دیا تھا آپ اپنی اولاد کے کندھوں پر امت کا بوجھ نہیں دیکھنا چاہتے تھے۔ آپ کی خواہش تھی کہ میری اولاد کو زندگی گزارنے کے لیے بقدر کفایت دنیا ملتی رہے۔ دنیا نہ ان کے لیے موجب وبال ہو اور نہ ہی موجب عیش و عشرت۔ جب سیدنا فاروق اعظمؓ نے اپنے گھر والوں کو یہ خواب سنایا تو خوشی و مسرت انہیں بھی ہوئی لیکن تعبیر سمجھ میں نہ آئی، مگر وہ تعبیر کے انتظار میں رہے۔ سیدنا عمرؓ کے صاحبزادے عبداللہؒ تو اکثر اپنے والد کا یہ قول دہراتے رہتے تھے:

> ''کاش مجھے معلوم ہوتا کہ عمرؓ کی اولاد میں وہ کون ہے جس کے چہرے پر زخم کا نشان ہوگا اور وہ میری سیرت اپنائے گا اور زمین کو عدل و انصاف سے بھر دے گا''۔ (کتاب المعارف لابن قتیبہ ص ۱۵۸، سیرۃ ابن جوزی ص ۷)

زمانہ کے شب و روز گزرتے گئے۔ گزرنے والے دن مہینوں اور مہینے سالوں میں تبدیل ہوتے گئے۔ خواب دیکھنے والے فاروق اعظمؓ بھی جام شہادت نوش کر کے اس دار فانی سے دار باقی کو انتقال فرما گئے لیکن آپ کی یہ بات زبان بہ زبان نقل ہوتی چلی گئی۔ ہر ایک اس زخمی چہرے والے کا منتظر رہنے لگا کیونکہ ہر ایک کو سیدنا فاروق اعظمؓ کے خواب

Marfat.com

کی صداقت کا پورا پورا یقین تھا جیسا کہ بعض روایات کے مطابق حجاج بن یوسف ثقفی بھی اس شخصیت کے انتظار کرنے والوں میں شامل ہوگیا۔ (سیرۃ ابن عبدالحکم ص ۱۴۲)

عمر بن عبدالعزیزؒ ابھی بچہ ہی تھے کہ اپنے والد سے ملنے مصر گئے۔ جب حلوان پہنچے تو اپنی عادت کے مطابق اٹھلا اٹھلا کر چلنے لگے۔ ایک روز آپ اپنے اخیافی بھائی اصبغ کے ساتھ سیر کے لیے نکلے۔ سیر کرتے کرتے دونوں گھوڑوں کے اصطبل تک پہنچ گئے۔ عمرؒ بے خبر ہو کر گھوڑوں کے پیچھے سے گزر رہے تھے کہ ایک خچر نے آپ کو دولتی ماری جو آپ کی پیشانی پر پڑی۔ پیشانی سے خون کا فوارہ نکلا اور ایک گہرا زخم ہوگیا۔ اصبغ نے خون اچھلتے دیکھا تو بجائے پریشان ہونے کے ہنسنے لگا اور بے ساختہ ان کی زبان سے نکلا: "اللہ اکبر! یہ بنی مروان کا الشیخ ہے جو حکمران ہوگا" گویا آپؒ کے بھائی نے سیدنا فاروق اعظمؓ کے خواب کی تعبیر بتا دی۔

عمرؒ کا خچر کی دولتی سے خون بہ رہا تھا۔ پیشانی خون سے شرابور تھی، زخم کی گہرائی سخت تکلیف دہ تھی۔ عمرؒ رو رہے تھے لیکن اصبغ کی خوشی کی کوئی انتہا نہ تھی۔ وہ برابر ہنس رہے تھے اور چیخ چیخ کر یہ کہہ رہے تھے کہ میرا یہ بھائی بنو مروان کا الشیخ ہے۔ عمرؒ میں سیدنا فاروق اعظمؓ کی جھلکیاں تو سب گھر والوں کو پہلے ہی نظر آ رہی تھیں لیکن جب خچر نے دولتی ماری اور آپ زخمی ہو گئے تو اصبغ سے صبر نہ ہو سکا اور وہ ظہور تعبیر کے یقین کی وجہ سے ہنستے ہوئے اور اللہ اکبر کے نعرے لگاتے ہوئے خواب کی تعبیر کے ظہور کا اعلان کر رہے تھے لیکن عمر بن عبدالعزیزؒ کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ میرا بھائی کیوں خوش ہے اور چیخ چیخ کر اللہ اکبر کے نعرے کیوں لگا رہا ہے۔

جونہی یہ خبر آپ کی والدہ ام عاصم کو ملی تو وہ تیزی سے دوڑتی ہوئی آئیں اور اپنے نور نظر کو سینے سے چمٹا لیا، چہرے سے خون کو صاف کیا۔ بچے کو تسلی دی۔ شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا لیکن پھر جب انہیں پتہ چلا کہ میرے بچے کی چوٹ پر اس کا بڑا بھائی ہنس رہا ہے تو سخت پریشان ہوئیں اور اپنے شوہر عبدالعزیز سے اصبغ کی شکایت کی اور خود بھی اصبغ کو ڈانٹا کہ تم میرے لال کو اصطبل کیوں لے گئے اور پھر جب وہ خچر کی دولتی سے زخمی ہوا تو اس پر برابر کیوں ہنستے رہے؟ عبدالعزیز بھی بیوی کی شکایت سن کر پہلے تو اپنے لخت جگر عمرؒ کی پیشانی سے خون پونچھنے لگے اور پھر اصبغ پر ناراض ہونے لگے۔ یہ تمہارا

Marfat.com

چھوٹا بھائی تھا۔ یہ دولتی سے گرا۔ اس کی پیشانی لہولہان ہوگئی اور وہ تکلیف سے رونے لگا اور تم اس کی تکلیف سے خوش ہو کر نعرے لگاتے رہے اور ہنستے رہے، ہنسنے کا یہ کون سا موقع تھا؟ اصبغ نے باپ کی ڈانٹ سن کر کہا: ابا! یہ بات نہیں، مجھے اس وجہ سے ہنسی نہیں آئی کہ میرا بھائی گرا اور اس کی تکلیف سے خوش ہوا، بلکہ میں خوش اس وجہ سے ہوا کہ میں اپنے اس بھائی میں زخم کے نشان کے علاوہ وہ تمام علامتیں دیکھتا تھا جو خواب میں سیدنا فاروق اعظمؓ نے دیکھی تھیں۔ پھر جب یہ گر کر زخمی ہوگیا تو مجھے اس زخم سے خوشی اور مسرت ہوئی کیونکہ اس میں تمام علامات مکمل ہوگئی تھیں اور اللہ کی قسم! یہ بنو امیہ کے اشج ہیں۔ (سیرۃ ابن عبدالحکم ص۲۰) اصبغ کی یہ بات سن کر عبدالعزیز خاموش ہوگئے اور آپ کے زخم کو دوبارہ نہایت غور سے دیکھنے لگے۔ پھر اپنی بیوی ام عاصم سے کہا: دیکھو، تمہارا بیٹا بنو مروان کا اشج ہے اور واقعی اس کی پیشانی سے سعادت جھلکتی ہے۔ (سیرۃ ابن جوزی ص۷، سیرۃ ابن عبدالحکم ص۱۹، کتاب الاغانی جلد ۸ ص ۱۴۹) اس زخم کی وجہ سے لوگ عمرؓ کو اشج بنی مروان کہنے لگے اور امرائے بنی امیہ عموماً اور عبدالملک کے فرزند خصوصاً اس علامت کی وجہ سے آپ کو حسد کی نگاہ سے دیکھتے۔ لیکن روایات میں ہے عبدالملک بن مروانؒ اپنے اس بھتیجے کو بچپن ہی سے نہایت محبت کی نگاہ سے دیکھتے، اپنے قریب بٹھاتے اور آپ کے سر پر دست شفقت پھیرا کرتے تھے، اور جب کبھی عمرؒ ان کے پاس جاتے تو عبدالملک انہیں اونچی جگہ بٹھاتے۔ اور جب کبھی کوئی ان کی اس بات پر اعتراض کرتا تو فرماتے: ”تمہیں کیا پتہ کہ اس بچے کا کیا مقام ہے۔ یہ سریر آرائے خلافت ہوں گے کیونکہ یہ اشج بنی مروان ہیں اور سیدنا فاروق اعظمؓ کے خواب کی تعبیر ہیں کہ جب زمین جور و تشدد سے بھر جائے گی تو یہ اسے عدل وانصاف سے بھر دیں گے۔ پھر میں اس کو مقرب اور محبوب کیوں نہ بناؤں۔

(کتاب الاغانی جلد ۸ ص ۱۶۷)

عمر بن عبدالعزیزؒ اگرچہ ماں کے پیٹ سے چاندی کا چمچہ لے کر پیدا ہوئے تھے اور لباس اور خورد و نوش میں ان کا معیار سب لوگوں سے الگ تھا لیکن فطرت نہایت سلیم اور طبع نہایت مستقیم تھی۔ اس وجہ سے بچپن ہی سے آپ کا دل اولاد عمرؓ جو رشتہ میں آپ کے ماموں تھے، کی طرف مائل تھا۔ خصوصی طور پر سیدنا عبداللہ بن عمرؓ جو آپ کے آئیڈیل تھے اور جب آپ نے ان سے ملاقات کی تو پھر تو ہر وقت دل میں وہی سمائے

Marfat.com

رہتے تھے اور آپ اکثر اپنی والدہ محترمہ سیدہ ام عاصمؒ سے یہ کہتے: امی جان! میں اپنے ماموں عبداللہ بن عمرؓ کی طرح بننا چاہتا ہوں۔ ان کی والدہ ان کی یہ بات سن کر مسکرا دیتیں اور کہا کرتیں: بیٹا! ان کی طرح بننا بڑا مشکل ہے اور واقعی عبداللہ بن عمرؓ بننا محض خیال خام ہے۔

تحصیل علم

عمرؒ جب بچپن سے لڑکپن کی منزل میں پہنچے اور ہوش سنبھالا تو باپ نے ان کو اعلیٰ تعلیم کے لیے مدینہ الرسول بھیج دیا جو اس زمانہ میں مہبط وحی ہونے کی وجہ سے علم اور علماء کا مرکز تھا اور چار دانگ عالم سے لوگ وہاں حدیث وفقہ کی تعلیم کے لیے جاتے تھے۔ عمرؒ یہاں حفظ قرآن سے فارغ ہوئے تو بعض صحابہؓ اور تابعین سے روایت کرنے لگے۔ چنانچہ آپ عبداللہ بن جعفرؓ، انس بن مالکؓ، ابوبکر بن عبدالرحمٰن للہؓ اور عبیداللہ بن عبداللہ بن عتبہ بن مسعودؓ سے احادیث بیان کرتے۔ آپ کی ابن عتبہ سے کثرت سے روایات ہیں۔ (سیرۃ ابن الجوزی ص ۸) اس زمانہ میں محدث صالح بن کیسانؒ کو مدینہ منورہ میں مرکزیت کا مقام حاصل تھا۔ گورنر عبدالعزیزؒ نے ان کی نگرانی اور سرپرستی میں ان کی تعلیم و تربیت کی۔ صالح بن کیسانؒ نے نہایت احسن طریق سے ان کی تعلیم و تربیت کی اور ایک مربی ہونے کے ناطے نہایت دیانت اور ذمہ داری کے ساتھ ان کی دینی اور اخلاقی نگرانی کرتے رہے کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ علم بغیر عمل کے وبال جان اور عمل بغیر علم کے سراسر گمراہی ہوتا ہے، لہذا انہوں نے تعلیم کے ساتھ ساتھ تربیت میں بھی کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا۔ چنانچہ حافظ ذہبیؒ نے لکھا ہے کہ ایک دفعہ عمر بن عبدالعزیزؒ نے نماز میں دیر کر دی اور مسجد میں جماعت ہو جانے کے بعد آئے۔ صالح بن کیسان نے دیر سے آنے کی وجہ پوچھی تو عمرؒ کا جواب تھا کہ "بال سنوارنے میں دیر ہوگئی"۔ شاگرد کے جواب نے استاد کو ورطہ حیرت میں ڈال دیا اور وہ سمجھے کہ شاگرد کے دل میں بالوں کی اہمیت نماز باجماعت کی اہمیت سے زیادہ ہے کیونکہ بالوں کی آرائش میں شغف کو نماز پر ترجیح دی گئی ہے۔ چنانچہ انہوں نے فوراً عمرؒ کے باپ عبدالعزیز کو یہ واقعہ اور شاگرد کا یہ جواب لکھ کر بھیجا۔ انہوں نے فوری طور پر ایک شخص روانہ کیا جس نے مدینہ میں داخل

ہونے کے ساتھ پہلے عمرؒ کے بال مونڈھے اور بعد میں کسی سے بات کی۔
(سیر اعلام النبلاء جلد ۵ ص ۱۱۶، سیرۃ ابن الجوزی ص ۹، البدایہ والنہایہ جلد ۹ ص ۹۳)

عمر بن عبدالعزیزؒ کے ایک اور استاد عبیداللہ بن عبداللہ تھے۔ عمرؒ کو ان سے بڑی محبت تھی اور آپ ان کو سب پر ترجیح دیتے تھے اور ان کی مجلس میں کثرت سے آتے جاتے تھے۔ کیونکہ آپ علم کا ایک بے پایاں سمندر تھے۔ (صفۃ الصفوۃ جلد ۲ ص ۵۷) اس استاد کا اثر آپ پر پوری زندگی رہا۔ چنانچہ ایک مرتبہ اپنی اہلیہ سے فرمایا! فاطمہ! جب مجھے غصہ آتا ہے تو گویا میں اپنے سامنے عبیداللہ کو کھڑا پاتا ہوں کہ آپ مجھ سے مخاطب ہیں اور مجھے غصہ سے منع فرما رہے ہیں۔ (صفۃ الصفوۃ جلد ۲ ص ۵۵) عمرؒ ان سے علم حاصل کرتے وقت بعض مسائل میں اختلاف بھی کرتے تھے۔ ان عبیداللہ کو پتہ چلا کہ عمرؒ سیدنا علیؓ کی تنقیص کرتے ہیں۔ یہ سننا تھا کہ انہوں نے عمرؒ کو بلایا اور پوچھا: آپ کو کب پتہ چلا کہ اللہ تعالیٰ اہل بدر پر راضی ہونے کے بعد غصہ ہو گئے تھے؟ اس فقرہ سے عمرؒ سمجھ گئے کہ استاد کا اس سوال سے کیا مقصد ہے۔ فوری طور پر اللہ تعالیٰ اور عبیداللہ سے معذرت کی اور وعدہ کیا کہ میں آئندہ سیدنا علیؓ کے بارے میں ایسی بات ہرگز نہیں کہوں گا اور پھر اس وعدہ کو پوری زندگی نبھایا اور کسی نے بھی پھر کوئی ایسا کلمہ ان کے منہ سے نہ سنا جس سے سیدنا علیؓ کے بارہ میں کوئی تنقیص کا پہلو نکلتا ہو۔ (البدایہ والنہایہ جلد ۹ ص ۱۹۳، سیر اعلام النبلاء جلد ۵ ص ۱۱۷)

بعض روایات میں ہے کہ عمر بن عبدالعزیزؒ کا لڑکپن کا زمانہ تھا۔ باپ بیٹے کو شدید محبت کرنے کے باوجود مصر سے مدینہ تحصیل علم کے لیے بھیجنا چاہتا تھا۔ بیٹے کو بھی باپ کے اس ارادے کا علم ہو گیا۔ انہوں نے والد سے پوچھا: ''اس کے علاوہ آپ کی کوئی اور خواہش؟'' باپ نے جواب دیا: ''اور تو کوئی خواہش نہیں، بس یہی آرزو ہے کہ تو مدینہ جائے اور وہاں کے علماء وفقہاء سے تحصیل علم کرے، ان سے زمانے میں رہنے کے ادب و آداب سیکھے، امید ہے کہ یہ بات تیرے اور میرے دونوں کے لیے مفید اور نفع بخش ہوگی۔'' بیٹا باپ کے ان جذبات کو سن کر مدینہ کی طرف چل پڑا اور عنفوان شباب ہی میں علم و دانش اور حدیث و فقہ کی تعلیم حاصل کر لی۔ اسی اثنا میں ان کے والد کا انتقال ہو گیا تو ان کے تایا ابا عبدالملک بن مروان نے ان کی طرف ایک آدمی بھیجا اور انہیں اپنے بچوں میں شامل کر لیا اور بعد میں اپنی بیٹی فاطمہ کو ان کے حبالہ عقد میں دے دیا جس کی شان کے بارہ میں کسی

شاعر نے یہ کہا تھا۔

بنت الخلیفة، والخلیفته جدّها
اخت الخلالُف، والخلیفته زوجها

"یعنی وہ ایک خلیفہ کی بیٹی تھی اور اس کا دادا بھی خلیفہ تھا' وہ خلفاء کی بہن تھی اور ایک خلیفہ کی زوجہ محترمہ تھی۔"

(سیر اعلام النبلاء جلد ۵ ص ۱۱۷، البدایہ والنہایہ جلد ۹ ص ۱۹۳)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے والد اور آپ کے تایا ابا عبدالملک بن مروانؒ نے جو خود بھی ایک بہت بڑے عالم اور فقیہ تھے، بڑی توجہ اور کوشش سے آپ کی تعلیم و تربیتؒ کی اور آپ میں ہر قسم کے اوصاف حمیدہ اور شمائل محمودہ پیدا کرنے کی پوری پوری کوشش کی' لیکن حالات کے نشیب و فراز بتاتے ہیں کہ آپ کو خود بھی تحصیل علم کا ذوق و شوق تھا۔ خود فرماتے ہیں کہ میں مدینہ کے لڑکوں میں سے ایک لڑکا تھا پھر عربی ادب اور شعر و شاعری کا ذوق پیدا ہوا جو اس زمانہ میں ایک بہت بڑا شوق سمجھا جاتا تھا۔ (سیرت عمر بن عبدالعزیز لا بن جوزی ص ۹) مختصر یہ کہ آپ نے نہایت ذوق و شوق کے ساتھ علم کی تحصیل کی۔ علم کی یہ طلب انہیں صرف طالب علمی کے زمانے ہی میں نہ تھی بلکہ جب وہ پڑھ لکھ کر مدینہ کی گورنری کے عہدہ پر فائز ہوئے اس وقت مدینہ کے اکابر علماء محدثین اور فقہاء کے ساتھ آپ کی علمی صحبتیں اور علمی بحث و مباحثے اکثر رہتے تھے اور یہ علمی بحث و مباحثے تحصیل علم کا ایک بہت بڑا ذریعہ تھے۔ ان علمی صحبتوں نے انہیں امام وقت اور فقیہ روزگار بنا دیا۔ خود فرماتے ہیں کہ میں جب مدینہ سے نکلا اس وقت مجھ سے بڑا عالم اور کوئی نہ تھا۔ (تذکرۃ الفاظ جلد ۱ ص ۱۰۶)

بعض روایات میں ہے عبدالعزیز جب مصر کے گورنر تھے تو انہوں نے اپنی اہلیہ ام عاصم کو لکھا کہ اپنے بیٹے عمر کو اپنے ساتھ لے کر حلوان مصر آ جاؤ۔ انہوں نے اپنے تایا سیدنا عبداللہ بن عمرؓ سے اس بارہ میں مشورہ کیا۔ انہوں نے فرمایا: تم تنہا مصر چلی جاؤ اور عمر کو یہیں مدینہ میں رہنے دو تا کہ اسے مدینہ کی پرفضا علمی آب و ہوا میں تعلیم و تربیت کے لحاظ سے آراستہ کیا جا سکے۔ چونکہ عمرؒ اپنے نانا فاروق اعظمؓ سے مشابہت کی وجہ سے آل خطاب کی محبت و شفقت کا مرکز تھے۔ چنانچہ ام عاصم اپنے بیٹے عمر کو مدینہ میں چھوڑ کر تنہا حلوان مصر

چلی گئیں۔ جب وہ مصر پہنچیں تو عبدالعزیز نے ان سے پوچھا: ''عمر کہاں ہے؟'' انہوں نے کہا کہ میں اسے تعلیم و تربیت کے لیے مدینہ کی خوشگوار علمی فضا میں چھوڑ آئی ہوں۔ اس سے عبدالعزیز کو بڑی خوشی ہوئی کہ میرا بیٹا اپنے ماموؤں کے سایہ عاطفت و شفقت میں تعلیم و تربیت حاصل کرے گا۔ چنانچہ عبدالعزیز نے خود بھی فوری طور پر اپنے بیٹے کی تعلیم و تربیت کی طرف توجہ دی اور اپنے خلیفہ عبدالملک بن مروان کو بھی دمشق میں اس بارہ میں ایک خط لکھا۔ خط پڑھ کر عبدالملک کو بہت خوشی ہوئی۔ اس نے اپنے بھتیجے کی تعلیم وغیرہ کے لیے ایک ہزار دینار ماہانہ جاری کر دیا۔ عمر بن عبدالعزیزؒ کی تعلیم و تربیت مدینہ طیبہ کی علمی فضا اور ماحول میں جود و کرم کے نعمت کدوں میں ہوئی اور چچاؤں کے مال و دولت اور ماموؤں کی شفقتوں کے زیر سایہ ہوئی۔

عمر غصہ میں بے قابو ہو جایا کرتے تھے۔ مزاج کی یہ حدت اور شدت ویسے تو آپ کو اپنی والدہ سے ورثہ میں ملی تھی لیکن یہ دراصل فاروقی مزاج کی ایک فرع تھی۔ غصہ سے فوری طور پر بھڑک اٹھنے سے آپ کو کئی مرتبہ نقصان بھی اٹھانا پڑا' لیکن آپ کی اس عادت سے آپ کے غلام ہر وقت سہمے رہتے تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ آپ نے اپنے ایک حبشی غلام کو بہت مارا۔ اس وقت آپ کا عنفوان شباب تھا۔ جب غلام خوب مار کھا چکا تو اس نے دل میں مصمم ارادہ کر لیا کہ عمر کے مزاج کی تیزی کو ختم کرنا چاہیے۔ چنانچہ ایک روز اس نے اس وقت جب کہ آپ خوشگوار موڈ میں تھے، آپ سے پوچھا: ''آپ نے کبھی کوئی ایسا قصور کیا ہے جس سے آپ کا آقا آپ سے ناراض ہو گیا ہو اور آپ کو فوری سزا دی ہو؟'' انہوں نے کہا: نہیں۔ غلام نے کہا: پھر آپ مجھے کیوں فوری سزا دیتے ہیں جب کہ آپ کو فوراً سزا نہیں دی گئی۔ یہ جملہ سن کر عمر ندامت و خجالت سے پانی پانی ہو گئے۔ قلب پر رقت طاری ہو گئی اور فرمایا: ''تو اللہ کی رضا کے لیے آزاد ہے''۔

مدینہ طیبہ کی گورنری

جیسا کہ عرض کیا گیا ہے سیدنا عمر بن عبدالعزیزؒ نے محدثین و فقہاء مدینہ سے تحصیل علم کر کے ایک نہایت اونچا مقام حاصل کر لیا تھا۔ علماء میں ان کا ایک نہایت اعلیٰ مقام ہو گیا تھا۔ افسوس یہ ہے کہ وہ شاہی خاندان کے ایک فرد ہونے کے ناطے ایوان

Marfat.com

حکومت میں براجمان ہوگئے اور علم کی وہ خدمت نہ کر سکے جو ان کا حق تھا۔ بڑے بڑے علماء اور فقہاء سے وہ علم و فقہ میں ممتاز تھے، لیکن حکومت کی مصروفیات نے انہیں علم کی خدمت سے روکے رکھا۔ چنانچہ تحصیل علم کے بعد وہ سب سے پہلے خناصرہ کے عامل مقرر ہوئے اور بعد میں عبدالملک بن مروانؒ کی وفات کے بعد ولید بن عبدالملک نے ان کو مدینہ کا گورنر مقرر کیا۔ ولید نے گورنر تو مقرر کر دیا لیکن آپ کا مزاج حکومت کرنے کے خلاف تھا لہذا قبول کرنے میں تامل ہوا۔ بعض روایات میں ہے کہ ایک بار خلیفہ عبدالملک بن مروانؒ کے ساتھ سفر میں تھے۔ کچھ ساتھیوں کے سامان پیچھے رہ گئے اس وجہ سے شاہی سواری پیچھے ٹھہر گئی۔ جن کے سامان روانہ ہو چکے تھے وہ آ رہے تھے لیکن جن کے سامان روانہ نہیں ہوئے تھے ان کے پاس کوئی سامان نہیں تھا۔ بس اتنی سی بات پر عمر بن عبدالعزیزؒ کو آخرت یاد آ گئی اور آپ فرط تاثر سے رو پڑے۔ خلیفہ عبدالملکؒ نے رونے کا سبب پوچھا؟ فرمایا: ''کل قیامت کے روز بھی ایسا ہی ہوگا جس نے یہاں سے کچھ بھیجا ہوگا اسے تو وہاں ملے گا اور جس نے نہ بھیجا ہوگا وہ محروم رہے گا''۔ بس اسی فکر نے ان کی دنیا تبدیل کر دی تھی اور پھر موت تک آخرت کی یاد سامنے رہی۔

جس شخص کی نہاد ذہنی آخرت رخی زندگی ہو وہ حکومت کے عہدہ کو کیسے قبول کر سکتا ہے، لہذا تقرری کے باوجود آپ مدینہ نہیں جا رہے تھے۔ ولید نے حاجب سے پوچھا: عمرؒ جا کیوں نہیں رہے؟'' اس نے کہا ''ان کی کچھ شرائط ہیں، جب تک وہ پوری نہ ہوں وہ اپنے عہدے کا چارج نہیں لیں گے۔ ولید نے آپ کو بلا کر پوچھا تو فرمایا: ''مجھے پہلے گورنروں کے ظلم پر مجبور نہ کیا جائے۔'' ولید نے ان کی یہ شرط فوری طور پر منظور کرتے ہوئے کہا: ''تم حق پر عمل کرنا خواہ ایک درہم بھی شاہی خزانہ میں نہ آئے''۔ (یعقوبی جلد۲ ص۳۳۹)

چونکہ عبدالملک بن مروانؒ کو عمر بن عبدالعزیزؒ سے انتہائی محبت تھی، اس لیے ولید بھی ان سے انتہائی محبت کرتا تھا اور ان کی شخصیت سے بہت متاثر تھا۔ پھر ولید کی ہمشیرہ فاطمہ بھی عمرؒ کے نکاح میں تھی۔ اس لحاظ سے عمر کا سسرالی تعلق بھی تھا۔ پھر جب ولید خلیفہ ہوا تو عمرؒ کی عمر اس وقت ۲۵ سال تھی۔ ان تمام تعلقات اور رشتوں کی وجہ سے ولید نے انہیں مدینہ کا گورنر بنایا لیکن جب انہیں مدینہ کی گورنری کے تقرر کا خط ملا تو انہوں نے اس کو قبول کرنے میں پس وپیش سے کام لیا کیونکہ انہیں مدینہ کے لوگوں پر ہشام کے مظالم معلوم

Marfat.com

تھے۔ ولید نے معلوم کرایا کہ عمرؒ کیوں اس عہدہ کو قبول نہیں کر رہے۔ پتہ چلا کہ تین باتوں کی وجہ سے عمرؒ یہ عہدہ قبول نہیں کر رہے۔ ولید نے ان کی تمام شرائط منظور کر لیں اور کہا کہ آپ اس عہدہ کو ضرور قبول کریں اگرچہ آپ ہمیں ایک درہم بھیجیں۔

(سیرت عمر بن عبدالعزیز ابن جوزی ص ۳۲)

جب ولید بن عبدالملک نے آپ کی یہ شرط مان لی تو عمر بن عبدالعزیز نے مدینہ طیبہ کے لیے رخت سفر باندھا۔ اس وقت کے عمر بن عبدالعزیز وہ نہ تھے جو خلیفہ عمر بن عبدالعزیز تھے۔ جب وہ خلیفہ اور امیر المومنین ہوئے تو تاریخ کے اوراق اور ان کا کردار دونوں اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ وہ امیرالمومنین نہیں اجیر المومنین تھے، وہ رئیس نہیں بلکہ درویش تھے' امیر نہیں بلکہ فقیر تھے، حاکم نہیں بلکہ رعایا کے اموال' اور بیت المال کے کسٹوڈین تھے۔ لیکن جب وہ گورنر ہو کر مدینہ طیبہ کے لیے روانہ ہوئے تو اس وقت وہ دوسرے گورنروں کی طرح ایک رئیس تھے جن کے خدم وحشم بھی تھے اور جن کا ذاتی سامان کثیر تعداد میں تھا چنانچہ روایات میں ہے کہ جب وہ مدینہ جا رہے تھے تو ان کا ذاتی سامان تیس اونٹوں پر بار تھا کیونکہ وہ شان وشکوہ والے شاہی خاندان کے ایک اہم رکن تھے۔ خلیفہ وقت کے چچا زاد بھائی اور ایک خلیفہ کے داماد' لیکن آپ کی فطرت سلیم تھی۔ حالات کے نشیب وفراز کے گرد وغبار نے ان کی سلیم فطرت کو ڈھانپ رکھا تھا جس کو اگر کوئی حادثہ صاف کر دے تو وہ سچے پکے شیدائی اسلام تھے۔

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ جونہی گورنر کی حیثیت سے مدینہ منورہ پہنچے تو سب سے پہلا کام جو آپ نے یہاں کیا، وہ یہ تھا کہ وہاں کے دس بڑے فقہاء اور علماء کو اپنے ہاں بلایا۔ ان علماء کے نام یہ ہیں:

(۱) عروہ بن زبیرؒ (۲) عبیداللہ بن عبداللہؒ
(۳) سلیمان بن یسارؒ (۴) قاسم بن محمد بن ابی بکرؒ
(۵) سالم بن عبداللہؒ (۶) خارجہ بن زیدؒ
(۷) ابوبکر بن عبدالرحمٰنؒ (۸) ابوبکر بن سلیمان بن ابی حثمہؒ
(۹) عبداللہ بن عامر بن ربیعہؒ (۱۰) سعید بن مسیّب

ذہبیؒ نے لکھا ہے کہ نماز ظہر پڑھ کر ان کو بلایا اور ان کو ایک مختصر سا خطاب کیا۔

Marfat.com

فرمایا کہ "میں نے آپ حضرات کو ایک ایسے کام کے لیے بلایا ہے جس میں ایک تو آپ ماجور ہوں گے اور دوسرے آپ کو حق کا ساتھی ہونے کا انعام ملے گا۔ میں آپ حضرات سے مشورہ کیے بغیر کوئی کام نہیں کرنا چاہتا۔ پس آپ کے ذمہ لازم ہے کہ جب آپ حضرات کسی کو ظلم کرتے ہوئے دیکھیں یا آپ کو کسی عامل کے ظلم کی اطلاع ملے تو میں آپ کو خدا کی قسم دیتا ہوں کہ آپ اس کی مجھے ضرور اطلاع دیں"۔ ایک گورنر کے منہ سے یہ کلمات سن کر ان حضرات کو حیرانگی بھی ہوئی اور خوشی اور مسرت بھی کیونکہ انہوں نے آج تک کسی گورنر کے منہ سے ایسی بات نہیں سنی تھی، لہذا یہ فقہاء ان کو دعائیں دیتے ہوئے واپس اپنے گھروں کو چلے گئے۔"

(سیر اعلام النبلاء جلد ۵ ص ۱۱۸، طبقات ابن سعد جلد ۶ ص ۲۴۶، البدایہ والنہایہ جلد ۹ ص ۱۹۴، تہذیب الکمال جلد ۲۱ ص ۴۳۹)

اور حافظ ابن کثیرؒ نے لکھا ہے کہ سعید بن مسیبؒ کسی خلیفہ کے پاس نہیں جاتے تھے۔ سوائے عمر بن عبدالعزیزؒ کے اور عمر بن عبدالعزیزؒ ان کی ہر بات پر عمل کرتے تھے۔

(البدایہ والنہایہ جلد ۹ ص ۱۹۴)

مدینہ کی گورنری کے زمانہ میں آپ قضا کے فرائض بھی انجام دیتے رہے اور ربیعہ فرماتے ہیں کہ آپ نے فیصلوں میں کبھی غلطی نہیں کی تھی۔

(سیر اعلام النبلاء جلد ۵ ص ۱۱۸)

ابوبکر بن عیاش کا بیان ہے کہ آپ نے کئی حج بھی اس زمانہ میں کیے اور سب سے پہلا حج آپ نے ۸۹ھ میں کیا۔ (سیر اعلام النبلاء جلد ۵ ص ۱۱۷)

سہیل بن ابی صالح کا بیان ہے کہ عرفہ کی صبح میں اپنے باپ کے ساتھ عرفات میں کھڑا تھا اور سیدنا عمر ثانیؒ امیر الحج تھے۔ میں نے اپنے والد سے کہا کہ میں انہیں دیکھنا چاہتا ہوں۔ چنانچہ جونہی میں نے انہیں دیکھا تو میں نے اپنے والد سے کہا کہ جب بھی کوئی شخص انہیں دیکھتا ہے تو اس کے دل میں ان کی محبت پیوست ہو جاتی ہے اور آپ نے تو سیدنا ابوہریرہؓ سے سنا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "اللہ تعالیٰ جب کسی شخص سے محبت فرماتے ہیں تو جبرئیل سے فرماتے ہیں کہ میں فلاں شخص سے محبت کرتا ہوں پس تم بھی اس سے محبت کرو۔ (سیر اعلام النبلاء جلد ۵ ص ۱۱۹)

عمرؒ نے ان علماء کو اس لیے بلایا تھا کہ یہ عمرؒ کی کاروبار حکومت میں اعانت کریں اور انہیں صحیح مشورہ دیں۔ چنانچہ علماء مجلس شوریٰ میں آ کر بیٹھ جاتے۔ عمرؒ انہیں اپنے عزائم سے آگاہ کرتے اور فرماتے کہ میں آپ سب حضرات کے مشورہ کے بعد ہی کسی کام کا فیصلہ کرسکتا ہوں، لہٰذا آپ حضرات مظالم کی چھان بین کریں۔

مسجد نبوی کی تعمیر نو

ولید بن عبدالملک نے بہت سی مساجد اور عمارتیں بنوائیں کیونکہ انہیں تعمیرات کا بہت شوق تھا۔ چنانچہ اس کے بارہ میں کتابوں میں لکھا ہے۔

کان شدید التکلف بالعمارات والابنیۃ و الاتخاذ المصانع والضیاع

(آداب السلطانیہ ص ۱۱۴)

عربی کا یہ ایک مشہور جملہ ہے کہ "الناس علیٰ دین ملوکھم" لوگ اپنے بادشاہوں کے دین پر ہوتے ہیں۔ جب صدر مملکت عمارتوں کی تعمیر کا شوقین ہو تو رعایا میں بھی ذوق وشوق سرایت کر جاتا ہے۔ چنانچہ ابن جریر طبریؒ نے لکھا ہے کہ ولید کے عہد کی تعمیرات کی وجہ سے یہ ذوق اتنا عام ہوگیا تھا کہ جب لوگ اپنی عام مجلسوں میں آپس میں بات کرتے تو وہ گفتگو اکثر و بیشتر عمارات ہی کے بارہ میں ہوتی تھی۔ (طبری جلد ۸ ص ۲۷۳) ولید نے یوں تو کئی عمارتیں تعمیر کیں لیکن اس کا سب سے بڑا تعمیری کارنامہ مسجدیں ہیں۔ ایک مسجد نبوی اور دوسری جامع الاموی، دمشق۔ تعمیر کے بعد ان دونوں مسجدوں کی تزئین و آرائش پر بھی اس نے بڑے حوصلے سے مال خرچ کیا اور ان کی آرائش میں اس زمانہ کی تمام صناعیاں اور کاریگریاں ختم کر دیں۔ اگرچہ ان سے قبل سیدنا عثمان بن عفانؓ نے اپنے عہد خلافت میں مسجد نبوی کی توسیع اور تعمیر کی کیونکہ اسلام کی روزافزوں ترقی کے باعث اہل اسلام کی تعداد میں چونکہ برابر اضافہ ہو رہا تھا اور مسجد کی تنگ دامانی شکوہ سنج تھی۔ اس لیے آپ نے مسجد کی توسیع اور اس کی پہلی عمارت کو گرا کر پوری عمارت کو ازسرنو تعمیر کرنے کا ارادہ فرمایا۔ اس کے لیے آپ نے اردگرد میں رہنے والوں سے کہا کہ وہ اپنے اپنے مکانات حکومت کے ہاتھ فروخت کر دیں تاکہ مسجد کی توسیع کی جا سکے۔ آپ نے

Marfat.com

انہیں کافی معاوضہ بھی پیش کیا لیکن وہ کسی صورت اپنے مکانات فروخت کرنے پر راضی نہ ہوئے۔ آپ نے انہیں اس بات پر آمادہ کرنے کے لیے ہر ممکن تدبیر کی لیکن ہر تدبیر بے سود رہی۔ لہٰذا توسیع و تعمیر کا معاملہ پانچ سال تک معطل و التوا میں رہا۔ جب آپ نے اپنے اس ارادے کو پورا ہوتے نہ دیکھا تو ایک جمعہ کو آپ نے نہایت موثر خطبہ دیا اور لوگوں کو نمازیوں کی کثرت اور مسجد کی تنگ دامانی کی طرف نہایت درد انگیز لہجے میں توجہ دلائی۔ جمعہ کی مبارک گھڑی اور امیر المومنینؒ کے درد انگیز لہجے نے حاضرین پر خاص اثر کیا اور وہ سب لوگ جو ابھی تک اپنے مکانات حکومت کے ہاتھ فروخت کرنے پر راضی نہ ہوئے تھے فوراً اپنے مکانات فروخت کرنے پر راضی ہوگئے۔ امیر المومنینؒ کو اس بات کی بڑی مسرت ہوئی چنانچہ انہیں منہ مانگے دام دے کر سارے مکانات خرید لیے۔

عثمان بن ابی العاص ثقفیؓ کا ایک مکان مسجد نبوی کے قریب واقع تھا۔ مسجد کی توسیع کے لیے اس کا خریدنا بھی نہایت ضروری تھا، لیکن وہ مکان فروخت کرنے پر راضی نہیں ہو رہے تھے۔ آخر آپ نے انہیں اس مکان کے بدلہ میں بصرہ میں نہر کے کنارے وہ مکان دے کر راضی کر لیا جو "شط عثمان" کے نام سے مشہور ہے۔

اب سیدنا عثمان نے مسجد کو منہدم کروایا اور اس کو اس طریقے سے پختہ بنوانا شروع کیا جس میں تزئین و آرائش کا پہلو بھی نمایاں ہو۔ مدینہ منورہ میں چونا نہیں ملتا تھا۔ وہ مدینہ طیبہ سے چند میل دور بطن نخلہ سے منگوایا۔ دیواروں کے لیے منقش پتھر منگوائے گئے۔ چھت کے لیے ساگوان کا انتظام کیا گیا۔ چنانچہ ابن اثیر کا بیان ہے۔

"چونا کو بطن نخلہ سے جو مدینہ کے قریب بصرہ کے راستہ پر ایک گاؤں ہے، لانے کا انتظام کیا گیا اور مسجد کو منقوش پتھروں سے بنایا گیا۔ اس کے ستون پتھر کے تھے جن میں سیسہ بھرا گیا تھا اور چھت ساگوان کی تھی"۔

(ابن اثیر جلد ۳ ص ۵۱، البدایہ والنہایہ جلد ۷ ص ۱۵۴)

مسجد کی تعمیر قریباً ۱۰ ماہ میں مکمل ہوئی۔ تعمیر کے دوران آپ اکثر اوقات وہاں رہتے اور بہ نفس نفیس کام کی نگرانی فرماتے، چنانچہ سیدہ صفیہؓ کے صاحبزادے سیدنا عبدالرحمٰنؒ فرماتے ہیں کہ جس زمانے میں سیدنا عثمانؓ مسجد نبوی کی تعمیر کروا رہے تھے، میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ امیر المومنین:

Marfat.com

"کام کی نگرانی کے لیے اپنے دونوں پاؤں پر کھڑے رہتے جب کہ کام کرنے والے مسجد میں کام کرتے ہوتے یہاں تک کہ نماز کا وقت آ جاتا۔ پھر آپ انہیں نماز پڑھاتے۔ بعض اوقات آپ گھر میں سو کر مسجد میں تشریف لے آتے اور بعض اوقات مسجد ہی میں سو جاتے۔" (وفاء الوفاء جلد۲ ص ۵۰۵)

اس دوران آپ صناعوں اور کاریگروں کو اپنی جیب خاص سے انعام واکرام سے نوازتے اور کھانے اور کپڑے سے بھی ان کو خوش وخرم رکھتے تاکہ وہ کام میں گہری دلچسپی لیں۔ اس طریقے سے ربیع الاول ۲۹ھ سے محرم الحرام ۳۰ھ تک برابر کام کی نگرانی فرماتے رہے اور کام کو پایہ تکمیل تک پہنچایا۔ سیدنا عمرؒ نے مسجد کے چھ دروازے رکھے۔ آپ نے بھی اتنے دروازے رکھوائے (ابن اثیر جلد ۳ ص ۵۱) سیدنا فاروق اعظمؓ نے اپنے عہد خلافت میں مسجد کی جو توسیع فرمائی تھی اس کے بعد مسجد کی لمبائی ۱۴۰ ہاتھ چوڑائی ۱۲۰ ہاتھ اور عرض ۱۵۰ ہاتھ ہو گیا۔ (ابن اثیر جلد ۳ ص ۵۱، البدایہ والنہایہ جلد ۷ ص ۱۵۴)

غرض کہ آپ نے شبانہ روز انتھک کوششوں سے اپنی نگرانی میں مسجد نبوی کی تعمیر نو اور توسیع کروائی اور اس کی تزئین وآرائش میں ذاتی دل چسپی لی۔ اس سے مسجد کی یہ عمارت اپنی مضبوطی، خوبصورتی اور تزئین وآرائش کے لحاظ سے اپنی مثال آپ ہو گئی تھی۔

ولید بن عبدالملک کے سامنے مسجد نبوی کی گزشتہ تعمیر کی یہ ساری باتیں تھیں۔ ان پچاس ساٹھ سالوں میں مدینہ کی آبادی بڑھ گئی تھی اور مسجد نبوی اپنی تنگ دامانی کی پھر شکوہ سنج تھی۔ چنانچہ ۸۸ھ میں سیدنا عمر بن عبدالعزیزؒ جونہی مدینہ کے گورنر ہوئے، ولید نے انہیں لکھا کہ مسجد نبوی کی پرانی عمارت کو گرا کر از سر نو تعمیر کیا جائے اور مسجد سے متصل امہات المومنینؓ کے حجرات کو اور اردگرد جو دوسرے مکانات ہیں انہیں بھی خرید کر مسجد میں شامل کر لیا جائے اور جو قیمت نہ لے اس کی قیمت خیرات کر دی جائے۔ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات کے نو حجرے تھے۔ ان کی چھتیں کھجور کی ٹہنیوں کی تھیں۔ جب امہات المومنینؓ انتقال فرما گئیں اور عبدالملک بن مروانؒ نے ان کے حجرے مسجد میں شامل کرنے چاہے تو مدینہ والے پھوٹ پھوٹ کر روئے جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات پر پھوٹ پھوٹ کر روئے تھے۔ آخر کار عبدالملک اس ارادے سے باز آ گئے اور اپنی رائے منسوخ کر دی۔ (مسالک الابصار جلد ۱ ص ۱۲۶ للعمری) پھر ولید بن عبدالملک کے حکم سے

Marfat.com

عمرؓ نے جب مسجد کی توسیع کرنا چاہی تو تمام حجروں کو گرا کر مسجد میں شامل کر لیا گیا اور مسجد کے چاروں طرف کی زمین خرید کر مسجد میں شامل کر دی گئی۔ عمر بن عبدالعزیزؒ نے اپنے معاونین کے ساتھ مسجد نبوی میں پہنچ کر مسجد کے طول و عرض کی نشان دہی کی اور اس کی بنیاد رکھی۔ (طبری جلد ۵ ص ۲۲۲) مسجد کی توسیع کے ساتھ ساتھ جوف محراب کو آگے بڑھایا اور بلند مینارہ بنوایا۔ عمر بن عبدالعزیزؒ پہلے شخص ہیں جنہوں نے مسجد میں محرابوں کی تجویف ایجاد کی (النجوم الزاہرہ جلد ا ص ۶۷، ص ۲۱۵) اور جب اذان دینے کا مینارہ بنایا گیا تو آپ کے بعد مسلمانوں کے شہروں میں بہت سے مینارے اذان کے لیے بنائے گئے اور شام کے میناروں کی نقل کی گئی۔ (تاریخ العرب المطول ص ۲۳۱)

سیدنا عمر بن عبدالعزیزؒ نے امیر المومنین ولید بن عبدالملک کے اس حکم کی پوری پوری تعمیل کی۔ جب انہوں نے مسجد نبوی کے اردگرد کے مکانات فروخت کرنے کے لیے لوگوں سے کہا تو انہیں اس کار خیر میں کوئی تامل نہ ہوا۔ سب لوگوں نے منہ مانگی قیمت لے کر اپنے مکانات فروخت کر دیے، چنانچہ علامہ طبری نے لکھا ہے:

فاجاب القوم الی الثمن فاعطا هم اياه (طبری جلد ۸ ص ۱۳۱۳)

لوگوں نے قیمت لے کر مکانات دینے کی رضامندی ظاہر کی جو انہیں دے دی گئی۔

لیکن بعض روایات میں ہے کہ بعض مکانات جبراً لیے گئے کیونکہ لوگ وہ مکانات دینے پر راضی نہ تھے۔ اگرچہ جبراً کسی شخص کی زمین اور مکان لینا جائز نہیں لیکن ہو سکتا ہے کہ وقت کا تقاضا وہی ہو جو سیدنا عمر بن عبدالعزیزؒ نے کیا یا پھر یہ روایات مخدوش ہوں۔

جب یہ مکانات خرید کر مسمار کر دیے گئے تو ولید نے قیصر روم کو لکھا کہ ہم اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مسجد بنوانا چاہتے ہیں لہٰذا تم اس کے لیے جو سامان بھیج سکتے ہو وہ بھیجو۔ اس خط کے جواب میں اس نے ایک لاکھ مثقال سونا، چالیس گٹھے منبت کاری کا سامان اور بہت سے کاریگر اور انجینئر بھیجے۔ اس کے علاوہ مدائن سے تزئین و آرائش اور نقش و نگار کا سامان منگوایا گیا۔ (خلاصۃ الوفاء ص ۱۳۹)

جب تعمیر کا تمام سامان مہیا ہو گیا تو سیدنا عمر بن عبدالعزیزؒ نے خود نہیں بلکہ اپنے وقت کے بڑے علماء اور فقہاء کو جن میں قاسم بن محمد بن ابی بکرؒ، سالم بن عبداللہ بن عمرؒ، ابوبکر بن عبدالرحمٰنؒ عبیداللہ بن عبداللہ، خارجہ بن زیدؒ اور عبداللہ بن عبداللہ بن عمرؓ خاص طور پر قابل

Marfat.com

ذکر ہیں۔ان کی موجودگی میں پرانی عمارت کو گرا کر ان بزرگوں اور فقہاء و محدثین کے ہاتھوں نئی عمارت کی بنیاد رکھوائی۔ (طبری جلد۸ ص۱۲۷۴) اور جب انہوں نے بنیاد رکھ دی تو پھر نہایت ذوق وشوق اور وفور جذبات سے تعمیر کا کام شروع کرایا۔ کاریگروں نے بھی نہایت جانفشانی اور تندہی سے کام کیا اور آپ نے بھی اس نظریہ کے پیش نظر کہ "مزدور خوش دل کند کار بیش" ان کو ہر قسم کی نوازشوں سے نوازا۔ روایات میں ہے کہ ایک ایک جھاڑ کے نقش پر کاریگر کو مزدوری کے علاوہ تیس درہم انعام کے طور پر عطا فرمائے (خلاصہ الوفا۔ص ۱۳۹) اسی کتاب میں ہے کہ صرف قبلہ کی دیوار اور اس کے طلائی کام پر پنتالیس (۴۵) ہزار دینار صرف ہوئے۔ (خلاصہ الوفاء ص ۱۴۰) جب ایک دیوار کے مصارف یہ تھے تو اس سے پوری مسجد کی عمارت کے مصارف اور اخراجات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ پوری عمارت پتھر کی تھی۔ تمام درو دیوار اور چھت پر طلائی کام اور اعلیٰ درجہ کی مینا کاری کی گئی۔ مسجد سے متعلق ایک فوارہ بھی تعمیر کیا گیا۔ غرضیکہ تین سال کی مدت میں مسجد کی تعمیر کی تکمیل ہوئی۔ جب مسجد مکمل ہوگئی۔ تو ۹۱ھ میں ولید خود اس کے افتتاح کے لیے دمشق سے مدینہ منورہ آیا۔ عمارت کو دیکھ کر اس کا دل باغ باغ ہو گیا۔ فوارے کی تنصیب نے اس کی مسرت و شادمانی میں مزید اضافہ کیا۔ افتتاح کے بعد مسجد کی خدمت، نگرانی اور انتظام کے لیے خادم مقرر کیے اور اہل مسجد کو اس کا پانی استعمال کرنے کا حکم دیا۔ (ابن اثیر جلد۴ ص ۲۰۴) اور روایات میں یہ بھی آیا ہے کہ اس مسجد کی تعمیر کی خوشی میں اہل مدینہ مین نقد روپیہ اور طلائی ونقرئی ظروف تقسیم کیے۔ (کتاب العیون والحدائق ص۱۱) ولید نے مسجد کی تعمیر کے سلسلہ میں سیدنا عمر بن عبدالعزیزؒ کی خدمات کی بھی تعریف و تحسین کی۔

روضہ نبوی کی مرمت

سیدنا عمر بن عبدالعزیزؒ جب گورنر مدینہ تھے اس وقت روضہ نبوی کی کوئی بڑی عمارت نہ تھی۔ مزار مبارک صرف ایک چار دیواری سے گھرا ہوا تھا۔ ولید بن عبدالملک کے عہد خلافت میں یہ دیواریں شکستہ ہوچکی تھیں۔ ولید نے ان کی مرمت کے لیے عمر بن عبدالعزیزؒ سے کہا: آپ نے چاروں طرف دوہری دیوار تعمیر کرا دی کہ ایک اگر منہدم ہو جائے تو دوسری سے روضہ مبارک کا پردہ قائم رہے۔ (کتاب العیون والحدائق ص۹)

Marfat.com

دیگر مساجد کی تعمیر

اطراف مدینہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاں جہاں نمازیں پڑھی تھیں، مسلمانوں نے وہاں تبرک اور یادگار کے طور پر مسجدیں بنوالی تھیں۔ وہ مسجدیں معمولی تھیں۔ سیدنا عمر بن عبدالعزیزؒ نے اپنی گورنری کے زمانہ میں اطراف مدینہ میں بہت سی مسجدیں بنوائیں۔ دوسرے ان یادگار مسجدوں کو مسمار کر کے منقش پتھروں سے انہیں تعمیر کرایا تاکہ یہ یادگار مسجدیں معمولی نہ رہیں۔ (فتح الباری جلد ا ص ۴۷۲)

کنوؤں اور راستوں کی تعمیر

خلیفہ مسلمین بھی چونکہ عمارتوں اور راستوں کی تعمیر کا خصوصی ذوق رکھتا تھا لہٰذا اس کے گورنر بھی رفاہ عامہ کے کاموں میں خصوصی دل چسپی لیتے تھے۔ سیدنا عمر بن عبدالعزیزؒ نے رفاہ عامہ کے سلسلہ میں ولید بن عبدالملک کے حکم سے مدینہ میں اور اطراف مدینہ میں بہت سے کنوئیں کھدوائے تاکہ لوگوں کو پینے کے پانی کی سہولت ہو اور دشوار گزار پہاڑی راستوں کو درست کرایا۔ اس سے لوگوں کو سفر میں نہایت آسانی ہوگئی۔

بعض روایات میں ہے کہ ولید نے سیدنا عمرؒ کو لکھا کہ گھاٹیاں آسان بنائی جائیں اور جگہ جگہ کنوئیں کھدوائے جائیں اور حاجیوں کے راستے میں ہوٹل اور سرائیں بنوائی جائیں اور خراسان کے راستہ میں سرائیں کثرت سے بنوائی جائیں۔ پھر فرمان بھیجا کہ مدینہ منورہ میں ایک فوارہ بنوایا جائے۔ سیدنا عمرؒ نے ان تمام احکامات کی تعمیل کی۔ فوارہ بھی بنوایا اس فوارہ میں جب پانی چھوڑا جاتا تو اس کا منظر دل خوش کن اور اپنی کاریگری میں حیرت زا اور مسرت انگیز تھا۔ (طبری جلد ۵ ص ۲۲۲)

پھر جب عمر بن عبدالعزیزؒ ان تمام کاموں سے فارغ ہوگئے تو ولید نے آپ کو ان کاموں کے صلہ میں مکہ اور طائف کا بھی گورنر بنا دیا۔ پھر سنہ ۹۰ھ میں آپ کو تمام صوبہ حجاز کا والی بنا دیا گیا۔

ولید بن عبدالملک کا حج کے لیے آنا

سنہ ۹۰ھ میں جب مسجد نبوی کی توسیع کا کام مکمل ہوگیا تو سنہ ۹۱ھ میں ولید نے

Marfat.com

حج بیت اللہ کا ارادہ کیا اور اپنی آمد کے بارہ میں سیدنا عمر بن عبدالعزیزؒ کو آگاہ کیا۔ جب ولید حج کے لیے دمشق سے نکلا تو عمرؒ ایک عظیم الشان جلوس کے ساتھ خلیفہ کے استقبال کے لیے روانہ ہوئے۔ اس جلوس میں مدینہ منورہ کے اکابر میں سے بیس حضرات بھی شامل تھے۔ اس جلوس میں اونٹوں اور گھوڑوں پر لدا ہوا کافی سامان بھی تھا۔ یہ جلوس سویدا تک گیا۔ خلیفہ مسلمین سواری پر تھے' خلفاء کے آداب میں یہ بات بھی تھی کہ اگر لوگ سوار ہوں تو خلیفہ کو دیکھ کر وہ سواریوں سے اتر جائیں اور اگر بیٹھے ہوں تو کھڑے ہو جائیں لیکن اس جلوس کے لوگ خلیفہ کو دیکھ کر سواریوں سے نہ اترے۔ (العقد الفرید جلد۴ ص ۹۲) ولید کے حاجب نے جب یہ دیکھا تو وہ تیزی سے آگے بڑھا اور لوگوں کے قریب آ کر اس نے کڑک دار آواز میں کہا: ''امیر المومنین کے آداب کے لیے اپنی سواریوں سے اتر جاؤ''۔ لوگ اس کی آواز سن کر سواریوں سے اتر پڑے لیکن ولید نے انہیں سوار ہونے کا اشارہ کیا، چنانچہ وہ پھر اپنی سواریوں پہ سوار ہو گئے۔ پھر ولید نے گورنر سیدنا عمرؒ کو اپنے پاس بلایا اور ان کے ساتھ چلتا رہا حتی کہ ذی خشب میں جو مدینہ سے ایک دن کے فاصلہ پر واقع ہے، اتر گیا (معجم البلدان جلد۳ ص ۴۴۰) پھر ولید نے مدینہ کے خواص و اکابر سے ملاقات کی اور تمام لوگوں کو دوپہر کے کھانے کی دعوت دی۔

ولید مدینہ میں جب داخل ہوا تو فوراً مسجد نبوی میں گیا تاکہ وہ مسجد کی توسیع کا معائنہ کرے۔ مسجد میں داخل ہو کر اس نے دیکھا کہ تمام مسجد لوگوں سے خالی ہے۔ صرف ایک شخص محراب کے پاس بیٹھا ہوا ہے۔ یہ مدینہ کے بہت بڑے عالم سعید بن المسیبؒ تھے۔ ہوا یہ کہ خلیفہ ولید جب مسجد نبوی دیکھنے کے لیے آیا تو اس کی آمد سے قبل مسجد نبوی کو لوگوں سے خالی کرالیا گیا۔ تمام لوگوں نے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے مسجد خالی کر دی سوائے سیدنا سعید بن المسیبؒ کے۔ سعیدؒ پہلی صف میں قبلہ رخ محراب کے قریب اپنی عادت کے مطابق بے پروائی سے بیٹھے رہے اور کسی پہرے دار کو بھی جرأت نہ ہوئی کہ وہ ان کو نکال سکے کیونکہ گزشتہ پچاس سالوں سے سعیدؒ نے اپنی کسی نماز کی تکبیر تحریمہ بھی کبھی قضا نہ کی تھی۔ سعیدؒ اپنی معمولی دو چادریں اوڑھے اپنی جگہ پر بیٹھے رہے۔ بعض حضرات انہیں آ کر کہتے کہ مسجد خالی کر دیں حتیٰ کہ خلیفہ آ کر چلا جائے لیکن سیدنا سعید بن المسیبؒ کا یہ جواب تھا کہ جب تک میرے کھڑے ہونے کا وقت نہیں آئے گا میں کھڑا نہیں ہوں گا۔

Marfat.com

ولید سیدنا سعید بن المسیبؒ سے بخوبی واقف و آشنا تھا۔ اسے یاد تھا کہ سعید ایک مرتبہ میری بیعت سے انکار کر چکے ہیں۔ ولید کی تو یہ خواہش تھی کہ مسجد میں تمام حضرات ہوتے لیکن سعیدؒ نہ ہوتے۔ اسی وجہ سے عمر بن عبدالعزیزؒ کی بھی یہی خواہش تھی کہ کاش خلیفہ ولید کی راہ سے سعید بن المسیبؒ ہٹ جائیں یہاں تک کہ خلیفہ مسجد کا معائنہ کر کے چلا جائے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ان دونوں کے درمیان کوئی تو تکار نہ ہو جائے، لیکن عمرؒ کی یہ خواہش پوری نہ ہو سکی۔ ولید مسجد میں آیا اور اس نے دیکھا کہ مسجد نبوی لوگوں سے بالکل خالی ہے۔ پھر اچانک اس کی سعید بن المسیبؒ پر نگاہ پڑی کہ وہ محراب کے پاس بیٹھے ہوئے ہیں۔ ولید جان گیا کہ سعیدؒ نے مسجد سے نکلنے سے انکار کر دیا ہے۔ ولید محراب دیکھنا چاہتا تھا کیونکہ محراب اور مینارہ اذان ولید اور عمرؒ دونوں کی جدت تھی اور یہ مینارہ شام کے میناروں کے مشابہ بنایا گیا تھا۔ ولید نے پوچھا: یہ شیخ کون ہیں؟ کیا یہ سعید بن المسیبؒ ہیں؟ عمرؒ نے جواب دیا: ہاں۔ سیدنا عمر سعیدؒ کی طرف سے عذر کرنے لگے کہ انہوں نے اٹھ کر آپ کو اس لیے سلام نہیں کیا کہ بڑھاپے نے ان کی نگاہ کو از حد کمزور کر دیا ہے۔ ولید نے یہ عذر سن کر کہا: ہمیں ان کا حال بخوبی معلوم ہے۔ ہم ہی ان کے پاس جاتے ہیں چنانچہ ولید مسجد میں گھوم گھام کر سعیدؒ کے پاس گیا اور کہا ''شیخ! آپ کا کیا حال ہے؟'' سعیدؒ نے اپنی جگہ سے کوئی حرکت نہیں کی، وہیں بیٹھے بیٹھے جواب دیا: الحمد للہ! خیریت سے ہوں۔ امیر المومنین کا کیا حال ہے؟'' ولید یہ کہتے ہوئے واپس آ گیا کہ لوگوں میں یہ باقی ہیں''۔

(النجوم الزاہرہ جلد ۱ ص ۲۲۳، یعقوبی جلد ۳ ص ۱۹، طبری جلد ۵ ص ۱۹)

ولید نے مدینہ میں آج جو کچھ دیکھا وہ اس سے نہایت خوش ہوا۔ چنانچہ اس نے خوب داد و دہش کی۔ پھر کافی دیر تک ٹھہر کر وہ فوارہ دیکھا جو سیدنا عمرؒ کے ذہن و فکر کا نتیجہ تھا۔ اس نے فوارے کے پانی کا حوض بھی دیکھا اور اس میں سے پانی کے اچھلنے کا مشاہدہ بھی کیا جو اسے بہت پسند آیا۔ اس نے حکم دیا کہ اس کی دیکھ بھال کے لیے ملازم رکھے جائیں اور مسجد والوں کو یہیں سے پانی پہنچایا جائے۔ (طبری جلد ۵ ص ۲۴)

ولید مدینہ والوں کے خیالات معلوم کرنا چاہتا تھا جس کے لیے وہ جمعہ کا منتظر رہا۔ جمعہ کا روز آیا تو اس نے مسجد میں جا کر لوگوں کو نماز پڑھائی۔ پھر تقریر کی جس میں مدینہ کے لوگوں کو دھمکایا اور خطبہ سنت و عادت کے خلاف منبر پر بیٹھ کر دیا اور پھر جلد ہی

مدینہ طیبہ سے واپس چلا گیا۔ ولید کے اس خطبہ نے اہل مدینہ کے جذبات کو بھڑکا دیا اور اب اہل مدینہ اس کو کھلم کھلا برا بھلا کہنے لگے کیونکہ اس نے خلاف سنت بیٹھ کر خطبہ دیا۔ اکابر مدینہ کو سواریوں سے اتارا اور انہیں اپنے پیچھے چلنے پر مجبور کیا حتیٰ کہ لوگوں کو ذوخشب میں لے جا کر کھانا کھلایا اور اپنے آنے کے لیے لوگوں کو مسجد نبوی سے نکلوا دیا۔ اس لیے سیدنا سعید بن المسیبؒ کے مسجد سے نہ نکلنے کو خوب سراہا گیا اور ان کے لیے تحسین و آفرین کے ڈونگرے برسائے گئے۔

اہل مدینہ کے بھڑکنے کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ ولید نے مدینہ میں جو داد و دہش کی اور سخاوت کا جو بازار گرم کیا وہ صرف امراء اور بڑے بڑے روساء کے لیے تھا۔ اس نے فقراء و مساکین کو کچھ بھی نہ دیا۔ جس سے اہل مدینہ نے یہ سمجھا کہ اس کو غرباء و فقراء کی کچھ پروا نہیں، وہ صرف بڑے بڑے لوگوں کو خوش رکھنا چاہتا ہے۔ مختصر یہ کہ مدینہ کے لوگوں کے غیظ و غضب کے شعلے بھڑک اٹھے اور مدینہ کے دروازے ان لوگوں کے لیے کھل گئے جن کو حجاج بن یوسف اپنے ظلم و ستم سے بھگا دیتا تھا۔ عمر بن عبدالعزیزؒ بھی لوگوں کے اس سیلاب میں بہ گئے اور اہل مدینہ کی طرح حجاج سے ناراض ہو گئے اور مدینہ میں واپس آنے والوں کو ترحم اور شفقت کی نگاہ سے دیکھنے لگے اور ولید کو ان تمام مظالم کی اطلاع دی جو حجاج نے اہل مدینہ پر کئے تھے اور اہل عراق سے جو کچھ کیا جا رہا ہے اس کے برے نتائج سے بھی ولید کو مطلع کیا۔ (النجوم الزاہر جلد ا ص ۲۲۶)

اس دوران ایک حادثہ اور ہو گیا کہ سنہ ۹۲ھ میں ولید نے حجاج بن یوسف ثقفی کو امیر الحج بنا کر بھیجا اور حکم دیا کہ وہ مدینہ بھی جائے۔ جب یہ خبر مدینہ کے لوگوں کو پہنچی تو وہ جوش میں آ گئے۔ سیدنا عمر بن عبدالعزیزؒ نے لوگوں کے بھڑکے ہوئے جذبات دیکھ کر خلیفہ مسلمین کو لکھا کہ حجاج کو مدینہ ہرگز نہ بھیجا جائے کیونکہ لوگوں کے جذبات اس کے سخت خلاف ہیں۔ سیدنا عمرؒ کے خط سے ولید کو اندیشہ ہوا کہ کہیں معاملہ بگڑ نہ جائے اس لیے اس نے حجاج کو لکھا کہ مدینہ کے راستے سے ہٹ کر جائے اور سیدھا مکہ جائے مدینہ میں ہرگز نہ جائے۔ (سیرۃ عمر بن عبدالعزیز لابن عبدالحکم ص ۲۴۲) ولید نے اگرچہ حجاج کو مدینہ جانے سے روک دیا لیکن حجاج کو امارت حج پر برقرار رکھا۔ سیدنا عمرؒ کے اس خط نے ولید کے دل میں ایک خلش پیدا کر دی اور وہ دل میں کچھ ناراضگی رکھنے لگا۔ سیدنا عمرؒ کے اس خط کے

Marfat.com

بارہ میں حجاج بن یوسف کو بھی پتہ چل گیا لہٰذا وہ بھی عمر بن العزیزؒ کے بارہ میں اپنے دل میں کدورت رکھنے لگا۔ اس وجہ سے وہ وقتاً فوقتاً ولید سے سیدنا عمرؒ کے بارہ میں شکایات کرنے لگا اور جب بھی موقع ملتا اس کے کان بھرتا یہاں تک کہ ولید نے سیدنا عمرؒ کو مدینہ کی گورنری سے معزول کرنے کا عزم کر لیا۔

اب ولید نے عمر بن عبدالعزیزؒ کو مختلف امور میں آزمانا شروع کیا کہ وہ میرے حکموں کی تعمیل کرتے ہیں کہ نہیں۔ اس نے حکم دیا کہ مدینہ طیبہ سے ایک دستہ ترتیب دے کر بھیجیں۔ سیدنا عمرؒ نے اس کی فوری تعمیل کی اور دو ہزار جوانوں پر مشتمل ایک دستہ ترتیب دے کر محاذ جنگ پر بھیج دیا۔ پھر ولید نے یہ حکم دیا کہ فلاں شخص کو سو کوڑے مارے جائیں۔ عمرؒ نے اس حکم کی بھی فوری طور پر تعمیل کی بلکہ باوجود اس بات کے کہ وہ آپ کا ایک رفیق اور دوست تھا، آپ نے اس کو سزا دینے میں ذرا سی بھی رورعایت نہ کی۔

اسی دوران ولید نے عمر بن عبدالعزیزؒ کو مسجد نبوی کی توسیع کا حکم دیا اور یہ بھی لکھا کہ امہات المومنینؓ کے حجرات کو گرا کر مسجد میں شامل کیا جائے۔ عمرؒ نے خلیفہ کے حکم کی فوراً تعمیل کی لیکن جب ان حجروں کو گرانا شروع کیا اس روز اہل مدینہ کو انتہائی صدمہ ہوا۔ اگرچہ سیدنا عمرؒ کے ساتھ بھی چوٹی کے علماء تھے جن کی رائے سے ان حجرات کو گرایا گیا لیکن خبیب بن عبداللہ بن زبیرؓ، عمرؒ کے پاس آئے اور کہا کہ خدارا تم قرآن حکیم کی یہ آیت "ان الذین ینادونک من وراء الحجرات، اکثرھم لایعقلون" یعنی جو لوگ آپ کو حجروں کے پیچھے سے آواز دیتے ہیں ان میں اکثر عقل سے کورے ہیں، نہ مٹاؤ۔ مطلب ان کا یہ تھا کہ ان حجروں کو باقی رکھا جائے لیکن ان کی یہ بات نہ مانی گئی، کیونکہ مدینہ کی گورنری کے زمانہ میں عمر بن عبدالعزیزؒ اس قدر پارسا اور نیک دل نہ تھے بلکہ ایک عیش و عشرت کی زندگی گزارنے والے نوجوان تھے۔ اس وقت آپ کا بدن شاداب اور موٹا تازہ تھا۔ چنانچہ یونس بن ابی شعیب کہتے ہیں کہ میں نے عمر بن عبدالعزیزؒ کو بیعت اللہ کا طواف کرتے ہوئے دیکھا۔ آپ کے پیٹ کی سلوٹ میں آپ کے تہ بند کا کنارا چھپا ہوا تھا۔

(تذکرۃ الحفاظ جلد ا ص ۱۱۲)

ولید بن عبدالملک کو جب خبیب کی ان باتوں کا علم ہوا کہ اس نے امہات المومنینؓ کے حجرات کے انہدام پر احتجاج کیا ہے اور اہل مدینہ نے بھی ان کا ساتھ دیا ہے تو

Marfat.com

وہ بے قرار ہوگیا اور اس نے خبیب کے لیے یہ سزا تجویز کی کہ اسے سو کوڑے لگوائے جائیں پھر انہیں پس دیوار زندان کر دیا جائے۔ عمر بن عبدالعزیزؒ کو اگر پتہ ہوتا کہ حجاج نے ولید کو انہیں معزول کرنے کا مشورہ دیا ہے تو وہ خبیب کو کبھی بھی خلیفہ کی تجویز کردہ سزا نہ دیتے۔ چنانچہ انہوں نے خبیب کو پٹوایا اور ان پر خلیفہ کی سزا جاری کرنے میں بے رحمی سے کام لیا کیونکہ انہیں علم تھا کہ خبیب شدت بخار میں مبتلا ہیں۔ انہیں بلایا گیا، ان کے لیے ایک گھڑے میں پانی ٹھنڈا کیا گیا اور موسم سرما کی ایک نہایت ٹھنڈی صبح کو مسجد کے آگے ان پر وہ ٹھنڈا پانی ڈالا گیا جس سے وہ ٹھٹھر گئے اور نزع کی حالت میں مبتلا ہوگئے اور اس عالم فانی سے عالم جاودانی کو انتقال کر گئے۔ عمرؒ کو جب ان کے انتقال کا علم ہوا تو مضطرب ہوگئے اور جو کچھ ہوگیا اس پر اظہار و ندامت کرنے لگے۔ یہاں تک کہ عمرؒ اس صدمہ کی وجہ سے خود ہلاکت کے قریب ہوگئے۔

گورنری سے معزولی

اگرچہ سیدنا عمر بن عبدالعزیزؒ نے گورنر مقرر ہونے سے قبل امیر المومنین سے یہ شرط کر لی تھی کہ وہ گزشتہ گورنروں کی طرح لوگوں پر ظلم نہیں کریں گے نہ مالی اور نہ بدنی، لیکن بنوامیہ کے عہد میں نظام حکومت ہی کچھ ایسا بن گیا تھا کہ آپ کی یہ شرط قائم نہ رہ سکتی تھی۔ اس لیے ایک روایت کے مطابق حجاج بن یوسف ثقفی کی شکایت پر آپ گورنری سے معزول کر دیے گئے (طبری جلد ۵ ص ۹۱) اور دوسری روایت یہ ہے کہ سیدنا عبداللہ بن زبیرؓ کے صاحبزادے خبیبؒ کو جو بنوامیہ کی حکومت کے سخت مخالف تھے، ولید نے انہیں سزا دینے کے لیے گورنر مدینہ کو لکھا۔ آپ دلی طور پر اس کو سزا نہیں دینا چاہتے تھے لیکن ولید کے حکم سے مجبور ہو کر اسے سزا دی جس سے وہ انتقال کر گئے۔ اس واقعہ کی ندامت کے طور پر آپ نے خود گورنری سے استعفاء دے دیا اور ساری زندگی اس واقعہ پر کف ندامت ملتے رہے۔ امام ذہبیؒ نے لکھا ہے کہ آپ نے اسے کوڑے لگوائے اور سخت سردی میں کھڑے رکھا جس سے ان کا انتقال ہوگیا۔ (سیر اعلام النبلاء جلد ۵ ص ۱۲۰) حافظ ابن کثیرؒ نے لکھا ہے کہ سنہ ۹۳ھ میں عمر بن عبدالعزیزؒ کو مدینہ کی گورنری سے معزول کیا گیا جب آپ مدینہ شہر سے باہر نکلے تو رو پڑے اور فرمایا: ''معلوم ہوتا ہے کہ ہم مدینہ کی میل کچیل ہیں تبھی تو مدینہ کو چھوڑ

Marfat.com

کر جا رہے ہیں کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ مدینہ میل کچیل کو اس طرح باہر نکال دیتا ہے جس طرح بھٹی لوہے کے میل کچیل کو نکال دیتی ہے۔ پھر جب آپ دمشق پہنچے تو ایک روز سننے والوں نے آپ کو یہ فرماتے سنا کہ جب میں مدینہ میں تھا تو کوئی مجھ سے زیادہ عالم نہ تھا اور جب میں شام آیا تو سب کچھ گلدستہ طاق نسیان ہوگیا۔"

(البدایہ والنہایہ جلد ۹ ص ۱۹۵)

سیدنا عمر بن عبدالعزیزؒ کی معزولی چونکہ حجاج کی سازش کے تحت ہوئی تھی اس لیے حجاج نے حجاز کی گورنری کے لیے ولید کو دو شخصیتوں کی طرف اشارہ کیا جو سیدنا عمرؒ کے بعد حجاز کی گورنری کی اہلیت رکھتے تھے۔ مکہ کی گورنری کے لیے خالد بن عبداللہ قسری اور مدینہ کی امارت کے لیے عثمان بن حیان مری کا نام تجویز کیا۔ ولید نے حجاج کے مشورہ کے مطابق ان دونوں کو مکہ اور مدینہ کا گورنر لگا دیا۔

جیسا کہ ذکر کیا گیا ہے کہ اہل مدینہ ولید سے پہلے ہی ناراض تھے۔ اب اس نئے گورنر عثمان بن حیان مری نے آتے ہی مدینہ والوں کو جو خطبہ دیا اس میں انہیں ڈرایا دھمکایا اور کہا کہ میں نے تمہاری مجلسوں اور محفلوں میں اپنے جاسوس چھوڑے ہوئے ہیں جو مجھے تمہاری ہر بات کی خبر دیتے ہیں۔ تم اپنے حاکموں پر عیب لگانا چھوڑ دو ورنہ تمہیں اس کی سخت سزا دی جائے گی۔ تم لوگ عراقیوں کو پناہ دینا چھوڑ دو۔ اگر تم میں سے کسی نے کسی عراقی کو اپنے مکان میں پناہ دی تو میں پناہ دینے والے کو قرار واقعی سزا دینے کے ساتھ ساتھ اس کے مکان کو بھی منہدم کردوں گا۔ (طبری جلد ۵ صفحہ ۲۵۸۔۲۵۹)

چنانچہ اس نے اپنے اس خطاب کو عملی جامہ بھی پہنایا۔ اس نے اپنے جاسوسوں کو لوگوں کی تفتیش کے لیے تعین کر دیا۔ اگر وہ کسی کے ہاں کسی عراقی کو پاتے تو اس پر یکا یک ٹوٹ پڑتے' اور پناہ دینے والے اور عراقی دونوں کو گرفتار کر کے پس دیوار زندان کر دیتے۔ عثمان بن حیان مری نے جو کچھ مدینہ منورہ میں لوگوں سے کیا' خالد قسری نے وہی کچھ اہل مکہ کے ساتھ کیا۔

عمر بن عبدالعزیزؒ دمشق کی راہ پر

ادھر مکہ اور مدینہ میں لوگوں کے ساتھ یہ کچھ ہو رہا تھا کہ ان کو ڈرا دھمکا کر ان پر

Marfat.com

عرصہ حیات تنگ کیا جا رہا تھا۔ ادھر سابق گورنر حجاز سیدنا عمر بن عبدالعزیزؒ شعبان سنہ ۹۳ھ کو اپنے ایک غلام مزاحم کے ساتھ رات کی تاریکی میں مدینہ سے نکلے۔ اس وقت اگرچہ پورا مدینہ تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا لیکن مدینہ اور مکہ کا یہ سابقہ گورنر جس کا سامان تیس اونٹوں پر مدینہ گیا تھا، اب صرف ایک غلام مزاحم کے ساتھ مدینہ سے نکلا تاکہ اس کے نکلنے کا کسی کو پتہ نہ چلے۔ مدینہ سے نکلتے وقت انہیں دو احادیث نبوی ذہن میں آئیں۔ ایک یہ کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے کہ کوئی مدینہ سے نہیں نکلے گا مگر اللہ تعالیٰ اس کے عوض اسے بہترین جگہ دے گا یا اس کے مثل کر دے گا اور دوسری حدیث یہ ذہن میں آئی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ مدینہ بھٹی کی طرح ہے کہ وہ میل کچیل اور گندگی نکال باہر کرتا ہے۔ آپ نے نہایت بے چینی کی حالت میں اپنے غلام مزاحم سے فرمایا: مزاحم، ہمیں خدشہ ہے کہ کہیں ہم ان میں سے نہ ہوں جن کو مدینہ نکال باہر کرتا ہے۔ (طبری جلد ۵ ص ۵۶)

عمر اور ان کا غلام مزاحم دونوں اس شاہراہ پر جا رہے تھے جو ملک شام کو جاتی ہے حتیٰ کہ دونوں مقام سویدا پر پہنچے۔ یہاں عمرؓ کا ایک مکان تھا۔ وہ یہاں ٹھہر گئے اور خلوت کے ایام میں ان تمام واقعات کو یاد کر کے غور و فکر کرنے لگے جو مدینہ کی زندگی میں آپ پر گزرے۔ مدینہ آپ کے لیے نیا نہیں تھا یہیں آپ کا بچپن اور لڑکپن گزرا تھا۔ یہیں کے اساتذہ سے آپ نے تربیت حاصل کی تھی اور یہیں گورنر کی حیثیت سے انہوں نے زندگی کے کئی سال گزارے۔ ان سب واقعات پر غور و فکر کرتے انہیں اپنے والد عبدالعزیز کی ایک نصیحت دیا آئی۔ انہوں نے کہا تھا: "بیٹا! ہر حال میں اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہنا اور حسن تدبیر سے اپنے مال کی حفاظت کرنا، اپنے معاملات میں نرمی سے کام لینا کیونکہ جس میں نرمی نہیں ہوتی اس کی زندگی خوشگوار نہیں ہوتی اور اپنی خواہش کو مختصر رکھنا کیونکہ جو اپنی خواہش کو مختصر نہیں رکھتا وہ، صاحب عقل و دانش نہیں ہوتا۔" (الحکمۃ الخالدہ ص ۱۸۵ المسکویہ)

اب عمرؓ نے اپنے دل کی اتھاہ گہرائیوں میں جھانک کر دیکھا کہ اس نے اپنے والد کی اس نصیحت پر کہاں تک عمل کیا ہے؟ اسے پتہ چلا کہ اس نے حسن تدبیر سے اپنے مال کی کبھی حفاظت نہیں کی بلکہ اس نے اپنا تمام مال کپڑوں اور خوشبویات پر خرچ کر دیا ہے حالانکہ جو روپیہ اس نے اپنی ذات پر خرچ کیا ہے وہ اس کا حق نہیں ہے۔ پھر انہوں نے

دوسری نصیحت پر غور و خوض کیا تو انہیں پتہ چلا کر انہوں نے جن لوگوں سے معاملہ کیا ہے ان سے نرمی کا سلوک نہیں کیا بلکہ سنگ دلی کی انتہا تک ان سے معاملہ کیا ہے۔ مدینہ پر لشکر بٹھا دیے، خبیب بن عبداللہ بن زبیرؓ کو نہایت سنگ دلی سے قتل کر دیا۔ پھر سوچا تو پتہ چلا کہ انہوں نے اپنی ضرورتوں کو مختصر نہیں کیا اور اپنی خواہش کو بھی نہیں دبایا۔ قرظی کی نصیحت پر بھی عمل نہیں کیا جب انہوں نے دامن گھسیٹنے پر مجھے نصیحت کی تھی بلکہ ولید کو خوش کرنے کے لیے ہر قسم کی قربانی دی لیکن خوش وہ بھی نہ ہوا۔

اب انہوں نے تصور کی آنکھ سے نہ صرف مدینہ منورہ کو بلکہ پوری اسلامی مملکت کو دیکھا تو پتہ چلا کہ تمام شہروں میں مظالم کی ایک ہولناک آگ بھڑک رہی ہے اور تمام لوگوں کو مصائب کی تاریکیوں نے ڈھانپا ہوا ہے اور پورا عالم اسلام ان مظالم اور مصائب سے بلبلا رہا ہے۔ امراء ولید کو خوش کرنے کے لیے تمام لوگوں کو ناخوش کر رہے ہیں۔ ولید عمرؒ سے خوش نہیں ہوا جب کہ عمرؒ لوگوں کو اس کی خاطر ناراض کر چکا ہے۔ اب ولید کا ایک ایک ظلم ایک فلم کی طرح ان کی آنکھوں کے سامنے گھومنے لگا کہ اس نے شام میں اہل حمص پر اپنی اولاد کو مسلط کر رکھا ہے جو لوگوں کا مال ناحق کھا رہے ہیں۔ ان کی زمینیں لوٹ رہے ہیں اور ان کی جائیدادوں پر قبضہ کر رہے ہیں۔ ولید کی اولاد نے ہر شہر کے لوگوں کا ناک میں دم کر رکھا ہے اور حالت یہ ہے کہ ان کا باپ ان تمام ناپسندیدہ افعال پر ان کی حوصلہ افزائی کر رہا ہے۔ ولید نے نہ صرف اپنے حق میں بلکہ اپنی اولاد کے حق میں بھی برا کیا ہے اور ان کی راہ میں کانٹے بوئے ہیں۔ اپنی اولاد کو سرکش، مغرور اور نخوت پسند بنایا ہے اور نہ صرف عوام پر بلکہ فوجوں پر بھی اپنی نااہل اولاد کو مسلط کر رکھا ہے بلکہ فوجوں کا سپہ سالار بنا رکھا ہے۔ اس پر مستزاد یہ کہ حجاج بن یوسف ثقفی جیسے ظالم شخص کو عراق اور اس کے علاوہ دوسرے علاقوں کا حاکم اور امیر بنا رکھا ہے جو مال حرام جمع کر رہا ہے اور ناحق خونوں سے اپنے ہاتھوں کو رنگین کر رہا ہے اور لوگ آئے روز اس کے مظالم کا شکار رہتے ہیں۔

صرف حجاج ہی نہیں بلکہ ولید نے قرہ بن شریک کو جو ایک ٹھیٹھ دیہاتی اور اکھڑ گنوار ہے، مصر پر مسلط کر رکھا ہے جو مختلف قسم کے لہو ولعب میں مشغول رہ کر داد عیش دیتا ہے اور مصریوں کے اموال کو اپنے لیے حلال وطیب سمجھے ہوئے ہے اور یمن پر حجاج بن یوسف ثقفی کے بھائی محمد بن یوسف ثقفی کو گورنر بنا رکھا ہے۔ ان سب امراء اور حاکموں نے

Marfat.com

عوام کو اپنے ظلم وستم کا نشانہ بنایا ہوا ہے اور ان کے مالوں کو اپنے عیش وعشرت کے لیے ناحق کھا رہے ہیں۔ (عیون الاخبار جلد۳ ص ۱۸۲ لابن قتیبہ الدینوری) مختصر یہ کہ عمر بن عبدالعزیزؒ کا جس شہر تک بھی تصور جاتا آپ دیکھتے کہ عوام وخواص ظالم حکمرانوں کے مظالم سے کراہ رہے ہیں اور کسی متنفس کو کوئی راحت نصیب نہیں ہو رہی۔

(النجوم الزاہرہ جلد ا ص ۲۱۸، ۲۲۳)

سویداء کے مقام پر تنہائی کے لمحوں میں عمر بن عبدالعزیزؒ نے جب مسائل کا گہری نگاہ سے مطالعہ کیا تو انہیں پتہ چلا کہ اللہ کی زمین ان لوگوں کے مظالم سے بھرپور ہے اور ان خرابیوں کو دور کرنے کے لیے میں عاجز ہوں۔ ہاں اگر تخت خلافت پر کوئی ایسا شخص متمکن ہو جس کی سیرت سیدنا فاروق اعظمؓ سے ملتی ہو اور وہ ظالم کو نہایت سختی سے روکے تو پھر حالات بہتر ہو سکتے ہیں وگرنہ اللہ کی مخلوق اسی طرح کراہتی رہے گی۔ اب انہوں نے اپنے اندر جھانکا تو پتہ چلا کہ وہ کسی کے لیے نمونہ نہیں بن سکتے کیونکہ ان کے اپنے اندر وہ ساری خرابیاں موجود ہیں جن کو ختم کرنے کا وہ عزم کیے ہوئے ہیں اور جب تک وہ خود اپنی اصلاح نہ کریں گے۔ دوسروں کی کوئی اصلاح نہیں کر سکتے۔ اب ان کے اندر خیر وصلاح کے جذبات پیدا ہوئے اور انہوں نے ان تمام خرابیوں سے توبہ کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا جو اب تک ان میں موجود تھیں۔ توبہ تو انہوں نے پہلے بھی کئی بار کی تھی لیکن مدینہ کی گورنری سے معزولی کے بعد انہوں نے جو توبہ کی وہ توبۃ النصوح ثابت ہوئی۔

اب انہوں نے ان مظالم کو ختم کرنے کے منصوبے بنانے شروع کیے۔ اب ان کے دل میں خلافت کی تمنا پیدا ہوئی کہ کاش میں خلیفہ ہوتا اور اپنے نانا فاروق اعظمؓ کی طرح ملک کی ساری خرابیاں دور کر سکتا اور اپنی عیش وعشرت کی زندگی سے دست بردار ہوتا کیونکہ وہ دیکھتے تھے کہ میرا لباس اعلیٰ قسم کا ہوتا ہے جس لباس پر کسی کی نگاہ پڑ جائے وہ بھی میرے نزدیک پرانا ہو جاتا ہے۔ بیش قیمت اور عمدہ قسم کی غذا استعمال کرتا ہوں۔ مال ودولت کی میرے ہاں فراوانی ہے۔ خوشبویات کا استعمال میرے ہاں وافر ہے غرضیکہ اپنی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے پانی کی طرح روپیہ بہاتا ہوں لیکن اسی ملک میں بے شمار لوگ ایسے ہیں جن کو عریانی کا لباس میسر ہے، دن رات فاقہ کرتے ہیں اور نان شبینہ کے محتاج ہیں، پینے کا پانی بھی صحیح طور پر انہیں میسر نہیں ہوتا۔ یہ ساری باتیں ذہن میں رکھ کر انہوں نے مستقبل

کے منصوبے بنانے شروع کیے۔

عمرؒ چونکہ پختہ ارادے اور فہم و فراست کے مالک تھے لہٰذا انہوں نے سب سے پہلے اپنی اصلاح کا عزم کیا اور عیش و عشرت کی تمام اشیاء کو یک قلم ترک کر دیا۔ ارباب دانش و بینش بخوبی جانتے ہیں کہ انسان کا دفعتاً پارسا بن جانا کس قدر مشکل ہے لیکن عمرؒ نے فطری طریقہ اختیار کیا اور آہستہ آہستہ اپنے نفس کو بلند حوصلے اور عالی عزم کے ساتھ اعتدال اور عفت کا عادی بنانے لگے اور اس طرح انہوں نے غلط راستہ چھوڑ کر صحیح راہ اختیار کی۔ مختصر یہ کہ خبیب بن عبداللہ بن زبیرؓ کا قتل اور عمرؒ کی مدینہ کی گورنری سے معزولی ایک اچھا شگون ثابت ہوئی اور انہوں نے اپنا نفس عدالت و رحمت کے لیے تیار کر لیا۔ جب عمرؒ نے دیکھا کہ ان کا عزم درست ہو گیا ہے تو اب انہوں نے مزاحم کے ساتھ سویدا چھوڑنے کا ارادہ کیا اور چاہا کہ دمشق میں رہائش پذیر ہو کر دربار خلافت تک رسائی حاصل کریں اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ ولید کی مجلس میں گھس جایا کریں اور اس کے لیے مارآستین یا بغلی گھونسا ثابت ہوں۔ آپ کو یہ یقین تھا کہ دمشق میں رہ کر وہ ولید کے مقرب ہو جائیں گے کیونکہ آخرکار وہ اس کے عزیز اور بہنوئی ہیں۔ ولید نے عمرؒ سے پورے تعلقات ختم نہیں کیے تھے، صرف ان سے قدرے بگڑ گیا تھا اور عمرؒ نہ صرف گورنر تھے بلکہ ایک فقیہ، محدث اور مجتہد بھی تھے۔ شام کے علماء نے ان سے ملاقات کرنے کے بعد یہی فیصلہ کیا تھا کہ وہ علم میں آپ کے شاگرد ہیں۔ جس کی وجہ سے ولید نے انہیں مشیر و مفتی کی حیثیت سے اپنا مقرب بنا لیا تھا اور دربار خلافت میں ان کو پوری رسائی حاصل ہو گئی تھی۔

دارالخلافت دمشق میں آپ ولید کی مجلس شوریٰ کے ایک رکن مقرر ہو گئے۔ چنانچہ اب حالت یہ تھی کہ عمرؒ کو جب بھی موقع ملتا تو آپ ولید کو اس کے عمال و حکام کے سلسلہ میں آڑے ہاتھوں لیتے اور "الدین النصیحۃ" کے طور پر اس کی خیر خواہی کرتے ہوئے اس کو بعض دفعہ ڈانٹ بھی لیتے۔ چنانچہ ایک روز ولید سے فرمایا: "امیر المومنین! میں آپ کو ایک نصیحت کرنا چاہتا ہوں، لہٰذا جب آپ کاروبار خلافت سے مکمل طور پر سکون و اطمینان کی حالت میں ہوں تو آپ مجھ سے وہ نصیحت معلوم کر لیں۔ ولید نے پوچھا: اب اس نصیحت سے کون سی شے مانع ہے۔ فرمایا' مانع تو کچھ نہیں لیکن آپ کا قلب چونکہ اس وقت سکون سے عاری ہے لہٰذا آپ اطمینان اور دل جمعی کے ساتھ اس کو سن نہیں پائیں

Marfat.com

گے۔ ایک روز سیدنا عمرؒ شامیوں کی ایک جماعت کے ساتھ بارگاہ خلافت میں حاضر ہوئے۔ولید نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کہا: ''ابوحفص! آپ وہ نصیحت فرمائیں۔ سیدنا عمرؒ نے فرمایا: ''امیر المومنین! سنیں،اللہ تعالیٰ کے نزدیک شرک کے بعد سب سے بڑا گناہ خون ناحق ہے۔آپ کے گورنر اور امراء لوگوں کو ناحق قتل کر ڈالتے ہیں اور آپ کو اس کا سچا جھوٹا جرم لکھ کر بھیج دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس گناہ عظیم کے بارہ میں آپ ہی سے باز پرس کرے گا۔ اللہ کے ہاں پکڑے آپ ہی جائیں گے کیونکہ آپ نے انہیں گورنر مقرر کیا ہے،لہٰذا آپ انہیں لکھ دیں کہ کوئی گورنر کسی کو قتل نہ کرے جب تک کہ اس جرم کی آپ کو اطلاع نہ دی جائے اور پھر اس کے اس جرم پر شرعی شہادت پیش نہ کی جائے۔ پھر آپ خود اس کے بارہ میں اپنا حکم صادر فرمائیں کہ وہ واجب القتل ہے یا نہیں۔ بات درست تھی لیکن نازک مزاج شاہاں تاب سخن ندارد کے اصول کے تحت ولید کو غصہ تو بہت آیا لیکن وہ اپنا غصہ پی گیا اور بولا: ''ابوحفص! اللہ تعالیٰ آپ پر اپنی برکات نچھاور فرمائے۔''

سیدنا عمر بن عبدالعزیزؒ کوئی معمولی شخص نہ تھے۔آخر ولید کے بہنوئی تھے، مروانؒ کے پوتے اور علم وعمل کا کوہ گراں لہٰذا ولید نے ان کی اس نصیحت کا تجربہ کرنا چاہا اور عمرؒ کی یہ نصیحت تمام شہروں کے حکام کو اور خصوصی طور پر حجاج بن یوسف ثقفی کو لکھ بھیجی۔ حجاج نے اس کے جواب میں ایک خارجی کو ولید کے پاس بھیجا جو بنوامیہ کے خلفاء کو گالیاں بکتا تھا یہاں تک کہ ولید بھی اس کی گالیوں اور سب وشتم سے محفوظ نہ تھا بلکہ ولید کو تو وہ دل کھول کر گالیاں دیتا تھا کیونکہ اس کی نگاہ میں ولید ان تمام خلفاء میں سب سے زیادہ ظالم اور ستم گر تھا اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اس نے حجاج جیسے ظالم شخص کو عراق کا گورنر مقرر کیا ہوا تھا۔

ولید نے عین دوپہر کے وقت خلاف معمول عمر بن عبدالعزیزؒ کو بلوایا۔ جب وہ بارگاہ خلافت میں پہنچے تو دیکھا کہ خلیفہ کی پیشانی پر بل پڑے ہوئے ہیں۔ ولید نے اشارہ کر کے انہیں اپنے قریب بٹھایا۔عمرؒ نے دیکھا کہ ایک بے رحم جلاد خالد بن ریان برہنہ تلوار لیے ولید کے پاس کھڑا ہے۔ پھر ولید نے اس خارجی سے پوچھا جس کو حجاج نے ولید کے دربار میں بھیجا تھا کہ فلاں فلاں خلیفہ کے بارہ میں تیری کیا رائے ہے؟ خارجی نے ان خلفاء کی مذمت کرنا شروع کر دی۔ ولید نے پھر پوچھا کہ میرے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے؟ اس خارجی نے صاف جواب دیا: تو ایک ظالم اور ستم گر شخص ہے۔ اللہ تعالیٰ تجھ پر لعنت

کرے۔ ولید نے اسی وقت جلاد خالد بن ریان کو حکم دیا کہ اس کا سر اس کے جسم سے جدا کر دیا جائے۔ جلاد نے اسی وقت حکم کی تعمیل کی۔ اب ولید نے عمرؒ سے پوچھا: جو لوگ خلفاء کو گالیاں دیتے ہیں۔ ان کو قتل کرنا چاہیے یا نہ؟ عمرؒ خاموش رہے اور کوئی جواب نہ دیا۔ دو تین دفعہ پوچھنے پر بھی عمرؒ خاموش ہی رہے۔ جب ولید نے بار بار پوچھا تو عمرؒ نے مہر خاموشی توڑتے ہوئے جواب دیا کہ اسے سزا دی جائے۔ اس جواب سے ولید کو سخت غصہ آیا، وہ عمرؒ کے منہ سے قتل کا فتویٰ کہلوانا چاہتا تھا کیونکہ آخر عمرؒ ایک محدث وفقیہ بھی تھے۔ اسی غصہ کی حالت میں ولید گھر چلا گیا اور جلاد نے عمرؒ کو واپس جانے کا کہا۔ عمرؒ فرماتے ہیں کہ میں دربار خلافت سے واپس آ گیا لیکن نہایت ڈرا ہوا کہ شاید خلیفہ کی نازک مزاجی میرے متعلق بھی کوئی غلط حکم نہ دے دے۔ میں گھر آ کر ابھی بیٹھا ہی تھا کہ ولید نے عمرؒ کو اپنے گھر بلوایا اور پھر اس خارجی کے بارہ میں ان کی رائے طلب کی کہ میں نے جو اس کے قتل کا حکم دیا تھا وہ درست تھا یا نہیں؟ اب عمرؒ نے جواب دیا: ''امیر المومنین! اس کا قتل درست نہیں تھا، البتہ اسے کوئی سزا دی جا سکتی تھی اور اگر آپ چاہتے تو اس کو معاف بھی کیا جا سکتا تھا ورنہ پھر قید کر دیتے۔'' ولید کی طبع نازک پر یہ بات گراں گزری وہ اپنے اس فعل کے جواز پر ان سے فتویٰ چاہتا تھا جو انہوں نے نہ دیا۔ لہٰذا وہ غصے سے بھڑک اٹھا۔ عمرؒ نے اس کے غصہ کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے ایک مخلص و صادق خیر خواہ کے انداز سے اٹھ کر اپنے گھر کی طرف بڑھے۔ ان کے پیچھے پیچھے جلاد خالد بن ریان بھی نکلا جو اپنے آقا ولید کے غصہ کو کئی بار دیکھ چکا تھا اور اس کے سامنے عمرؒ کا فتویٰ بھی سن چکا تھا۔ وہ عمرؒ سے بولا: ''ابو حفص! اللہ تعالیٰ آپ کو معاف فرمائے۔ آپ نے امیر المومنین سے بحث کی جس سے مجھے خطرہ لاحق ہو گیا کہ کہیں امیر المومنین آپ کے بارہ میں بھی وہ حکم نہ دے دیں جو انہوں نے اس خارجی کے بارہ میں دیا تھا۔'' سیدنا عمرؒ کو جلاد کی یہ بات سخت ناگوار گزری لیکن آپ نے مصلحت کے پیش نظر اپنا غصہ ضبط کر لیا اور جلاد سے پوچھا: اگر امیر المومنین تجھے میرے قتل کا حکم دیتے تو کیا تو اس کی تعمیل کرتا؟ اس نے کڑک کر جواب دیا واللہ! ضرور تعمیل کرتا۔ عمرؒ اس کے جواب پر خاموش ہو گئے لیکن جلاد کی اس بات کو انہوں نے نہاں خانہ دل میں محفوظ کر لیا۔ (سیرۃ عمر بن عبدالعزیز لابن عبدالحکم ص ۱۳۹)

اب ولید نے عمر بن عبدالعزیزؒ کو ایک اور مسئلہ میں الجھانا چاہا۔ وہ مسئلہ یہ تھا کہ

Marfat.com

وہ اپنے بھائی سلیمان کو ولی عہدی سے ہٹا کر اپنی اولاد کو خلافت منتقل کرنا چاہتا تھا۔ اس کے لیے اسے عمرؒ کے تعاون کی ضرورت تھی۔ جب اس نے اس بارہ میں عمرؒ سے بات کی تو انہوں نے جواب دیا "امیر المومنین! ہم نے آپ دونوں بھائیوں کی ایک ہی وقت میں بیعت کی تھی، لہذا آپ سلیمان کو کیسے الگ کر سکتے ہیں؟ (سیرۃ عمر بن عبدالعزیز لا بن جوزی ص ۴۱) اس بات نے ولید اور عمرؒ کے درمیان اختلافات کی خلیج کو اور زیادہ کر دیا اور دونوں طرف نفرت کے جذبات بڑھنے شروع ہو گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ولید نے عمرؒ کو تین روز کے لیے نظر بند کر دیا، ان کا دانہ پانی بند کر دیا گیا۔ پھر حکم دیا کہ عمرؒ اگر زندہ ہوں تو رہا کر دیے جائیں۔ آپ کی اہلیہ جب اس مکان میں داخل ہوئیں تو عمرؒ کو زندہ پایا صرف گردن میں سخت درد تھا جو بعد میں علاج سے درست ہو گیا۔ (سیرۃ ابن جوزی ص ۲۴۸)

ایک مہینہ میں دو ظالموں کی موت

ادھر حالات اس طرح کروٹیں بدل رہے تھے ادھر سنہ ۹۵ھ میں حجاج موت کے آہنی شکنجہ میں جکڑا گیا۔ اس کے بعد ایک ماہ کے اندر اندر قرہ بن شریک عبسی گورنر مصر بھی موت کی آغوش میں چلا گیا۔ ان دو ظالموں کی موت عوام کے لیے بڑی راحت کا سبب بنی۔ (ابن اثیر جلد ۵ ص ۹) ان دونوں کی موت نہ صرف عمرؒ کے لیے بلکہ پورے ملک کے لیے مسرت کا باعث ہوئی۔ عمرؒ حجاج کے بارہ میں اسکے مظالم کی وجہ سے فرمایا کرتے تھے کہ اگر قیامت کے روز دوسری قومیں اپنے سب سے زیادہ خبیث شخص کو پیش کریں گی تو ہم حجاج کو ان کے سامنے پیش کریں گے۔ مجھے یقین ہے کہ ہم ان سب قوموں پر غالب آئیں گے۔ (سیرۃ ابن جوزی ص ۸۹)

ادھر عوام میں ان دونوں ظالموں کی موت سے خوشی اور مسرت کے شادیانے بج رہے تھے، دوسری طرف ان دونوں کی موت ولید کے لیے سخت صدمے کا باعث بنی کیونکہ ان کی موت نے تخت خلافت کو ہلا کر رکھ دیا۔ اس نے لوگوں کے سامنے اپنا بھرم رکھنے کے لیے لوگوں کو اکٹھا کیا اور اس عورت کی طرح جس کا بچہ مر گیا ہو، سر کھول کر منبر پر چڑھ گیا۔ اس نے پہلے تو لوگوں کو ان دونوں کی موت کی خبر دی۔ پھر کہا: "بخدا! میں ان دونوں کی ایسی شفاعت کروں گا جو انہیں مفید اور نافع ہو گی۔" ولید جب اس قسم کی باتیں کر رہا تھا تو عمرؒ جو

Marfat.com

حاضرین میں موجود تھے، اس کی ان لایعنی باتوں کو سن کر مسکرا رہے تھے اور اپنے ساتھ بیٹھے لوگوں سے فرما رہے تھے: ''اس خبیث کو دیکھو، اللہ کرے اسے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت نہ ہو، اور اللہ اسے بھی ان دونوں خبیثوں کے ساتھ ملا دے''۔ (النجوم الزاہرہ جلد ۱ ص ۱۸) ولید جب یہ تعزیتی خطبہ دے کر منبر سے نیچے اترا تو لوگ اس سے تعزیت کے لیے آگے بڑھے کیونکہ اس کی سلطنت کے دو اہم ستون گر گئے تھے۔ لیکن عمرؒ تعزیت کے لیے کھڑے نہیں ہوئے۔ ولید نے عمرؒ سے تعزیت کے لیے کھڑے نہ ہونے کا سبب پوچھا تو انہوں نے جواب دیا: ''امیر المومنین! حجاج ہمارا آدمی تھا لہٰذا اس کی تعزیت ہم سے کرنی چاہیے''۔ ولید نے کہا: ''ٹھیک کہتے ہو''۔

ولید کی موت

ان دونوں ظالموں کو مرے ابھی تھوڑا عرصہ ہی گزرا تھا کہ ولید فلسطین کے شہر رملہ گیا جہاں مسلمانوں کی فوج رہتی تھی۔ ولید وہاں بیمار ہوگیا اور چند ہی روز میں اس بیماری سے مر گیا۔ اس کے مرنے کے بعد حسب وصیت ان کا بھائی سلیمان سریر آرائے خلافت ہوا۔ سلیمان کے تخت نشین ہونے سے عمرؒ نہایت خوش ہوئے۔ چنانچہ دمشق میں انہوں نے خود کھڑے ہو کر لوگوں سے سلیمان کے بیعت لی۔ (تاریخ یعقوبی جلد ۳ ص ۳۷)

ولید اور سلیمان اگرچہ دونوں حقیقی بھائی تھے۔ دونوں عبدالملک بن مروانؒ کے بیٹے تھے لیکن دونوں کی طبیعتوں میں بڑا فرق تھا۔ ولید میں بھی بڑی خوبیاں تھیں لیکن اس کی سنگدلی نے اس کی تمام صفات پر پانی پھیر دیا تھا۔ ولید کے مقابلہ میں سلیمان رحم دل' نرم طبع' صائب الرائے اور نصیحت کو بغور سننے والا تھا۔ ولید کی طرح وہ زود رنج نہیں تھا۔ سلیمان نے وزارت اور مشورے کے لیے عمر بن عبدالعزیزؒ کو اپنا مشیر منتخب کیا۔ عمرؒ بھی یہ سمجھتے تھے کہ سلیمان میں بہت سی خوبیاں ہیں۔ اس کے دل کی مٹی بہت زرخیز ہے صرف نصیحت کی نمی کی ضرورت ہے۔ لہٰذا انہوں نے بھی اس سے اپنا تعلق استوار رکھا۔ اس کی صحیح صحیح راہ نمائی کی۔ سلیمان بھی عمرؒ کو اپنا خیر خواہ اور مخلص دوست سمجھتے تھے۔ پھر نہایت قریبی رشتہ داری کا تعلق بھی تھا اس وجہ سے وہ ان سے ہر مسئلہ میں مشورہ لیتے رہتے۔ سلیمان جب کسی وجہ سے غصہ میں آجاتا تو عمرؒ اپنی نصیحت اور مشورہ سے اس کے غصہ کی آگ کو بجھا دیتے۔

Marfat.com

سلیمان بن عبدالملک کے مزاج میں اثر ورسوخ

ولید عبدالملک کا بڑا لڑکا تھا۔ اس نے اس کی تعلیم کے لیے بڑی کوشش کی لیکن ولید کی طبیعت تحصیل علم کی جانب راغب نہ ہوئی۔ اس لیے اگرچہ وہ علم سے بے گانہ تھا لیکن جہاں بانی کے تمام اوصاف اس میں بدرجہ کمال موجود تھے اور وہ بنوامیہ کا ایک کامیاب ترین خلیفہ تھا جیسا کہ اس کے عہد خلافت کے کارناموں سے ظاہر ہے۔ اس کی دینی زندگی بھی بڑی اچھی تھی۔ تین روز میں ایک قرآن ختم کرتا تھا۔ (دول الاسلام ذہبی جلد ا ص ۴۸) دوشنبہ اور پنج شنبہ کو باقاعدگی سے روزہ رکھتا تھا (یعقوبی جلد ۲ ص ۳۴۸) پورا رمضان روزہ داروں کے لیے کھانا بھجواتا تھا (یعقوبی جلد ۲ ص ۳۴۸) صلحاء، اخیار اور فقہاء ومحدثین میں روپیہ تقسیم کراتا تھا۔ (دول الاسلام جلد ا ص ۴۸) اور یعقوبی نے لکھا ہے کہ اپنے دور حکومت میں اس نے دو مرتبہ حج کیا۔ (یعقوبی جلد ۲ ص ۳۴۹) سیدنا عمر بن عبدالعزیزؒ کو گورنر مدینہ مقرر کرنا اس کی سلیم الفطرتی کی ایک واضح دلیل تھی۔ اس کا سلوک اپنے بھائیوں کے ساتھ بھی نہایت مشفقانہ تھا اور وہ ان سے بے پناہ محبت کرتا تھا اور ان کے حقوق کا بڑا لحاظ رکھتا تھا۔ (مروج الذہب مسعودی جلد ۲ ص ۵۹۹) خوبیوں کے ساتھ اس میں ایک عیب یہ تھا کہ وہ بڑا سخت گیر تھا اور اپنی اس سخت گیری کی وجہ سے ہزاروں انسانوں کو قید وبند میں ڈال رکھا تھا۔

ولید کے بعد اس کا حقیقی بھائی سلیمان بن عبدالملک مسند خلافت پر بیٹھا۔ اس کو اس کے باپ عبدالملک نے ولید کے بعد خلافت کے لیے نامزد کیا تھا۔ بعض روایات میں ہے کہ ایک مرتبہ ولید نے سلیمان کے بجائے اپنے لڑکے کو اپنا ولی عہد بنانے کا ارادہ کیا تھا۔ بعض امراء نے اس کے اس ارادہ کی پرزور حمایت بھی کی کیونکہ بادشاہوں کو اپنے حمایتی اکثر مل جاتے ہیں لیکن وہ اپنے اس ارادہ سے باز آ گیا۔ ولید کی وفات کے بعد جمادی الآخرۃ ۹۶ھ میں سلیمان نے زمام خلافت ہاتھ میں لی۔ سلیمان فطری طور پر ایک صالح اور سعید شخص تھا اور اس کی صالحیت اور سعادت مندی پر ایک بین دلیل یہ ہے کہ سیدنا عمر بن عبدالعزیزؒ اس کے ہم جلیس اور مشیر تھے کیونکہ وہ اپنے نیک اوصاف، حسن اخلاق اور خصائل حمیدہ کے باعث اپنے پورے خاندان میں محبوب تھے۔ سلیمان بھی ان کا نہایت معتقد تھا۔ اس وجہ سے اس نے ان کو اپنا وزیر ومشیر بنا لیا تھا اور وہ امور خیر اور رفاہ عامہ کی

Marfat.com

اصلاحات میں ان کے مشوروں پر عمل کرتا تھا۔

''اور عمر بن عبدالعزیزؒ بھی انہیں ہر وقت رعایا اور عوام الناس کے بارہ میں قیامت کے روز جواب طلبی سے ڈراتے رہتے تھے۔ چنانچہ بعض روایات میں ہے کہ سلیمان اور عمر بن عبدالعزیزؒ ایک مرتبہ دونوں منیٰ میں کھڑے تھے۔ حج کی وجہ سے لوگوں کا ایک ازدحام تھا۔ موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے سیدنا عمرؒ نے سلیمان سے کہا: ''یہ سب لوگ آپ کی رعایا ہیں، یہ اتنی تعداد میں ہیں کہ آپ لوگ انہیں گن نہیں سکتے، ان سب کے بارہ میں قیامت کے روز آپ سے پوچھا جائے گا۔ ایک روایت میں ہے کہ یہ سب قیامت کے روز آپ کے دشمن ہوں گے اور آپ کے خلاف گواہی دیں گے۔ سلیمان یہ سن کر رونے لگا''۔

(البدایہ والنہایہ جلد ۹ ص ۱۹۵۔۱۹۶)

بعض روایات سے پتہ چلتا ہے کہ کبھی کبھی عمرؒ اور سلیمان میں رنجش بھی ہو جاتی۔ چنانچہ ایک مرتبہ عمرؒ اور سلیمان گرمی کے موسم میں جہاد کے لیے نکلے۔ اتفاقاً ان دونوں کے غلام پانی پر لڑ پڑے اور عمرؒ کے غلاموں نے سلیمان کے غلاموں کو پیٹا۔ سلیمان کے غلاموں نے اپنے آقا سے اس بارہ میں شکایت کی۔ سلیمان نے عمرؒ سے کہا کہ آپ کے غلاموں نے میرے غلاموں کو پیٹا ہے۔ عمرؒ نے کہا مجھے علم نہیں۔ سلیمان نے اس بارہ میں کچھ تلخ کلامی کی۔ اس پر عمرؒ ناراض ہو کر کہنے لگے کہ جب سے میں ہوشیار ہوا ہوں، میں نے کبھی جھوٹ نہیں بولا۔ پھر عمر یہ کہتے ہوئے سلیمان کی مجلس سے اٹھ کھڑے ہوئے کہ ''آپ کی مجلس سے خدا کی زمین وسیع ہے''۔ (سیرۃ ابن جوزی ص ۳۶) اس کے ساتھ ہی آپ نے مصر جانے کی تیار کر لی۔ جب سلیمان کو عمرؒ کے مصر جانے کا پتہ چلا تو انہیں ناگوار گزرا۔ بعد میں ان کی پھوپھی نے ان دونوں کی صلح کرادی اور پھر پھوپھی کے کہنے پر عمرؒ سلیمان کے پاس چلے گئے۔ سلیمان نے ان سے معذرت کر لی اور کہا: ''ابوحفص! جب کبھی مجھے کوئی غم یا پریشانی لاحق ہوتی ہے تو مجھے آپ ہی یاد آتے ہیں''۔ چنانچہ سیدنا عمرؒ نے مصر جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔ (قصص العرب جلد ۱ ص ۲۳۲ لجاد المولیٰ)

سنہ ۹۷ھ میں عمرؒ نے سلیمان کے ساتھ حج بیت اللہ کیا (ابن اثیر جلد ۵ ص ۱۲)

جب یہ دونوں عرفات پہنچے تو سلیمان نے دیکھا کہ حاجیوں کا ایک ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر

Marfat.com

ہے۔ اتنے بڑے ہجوم کو دیکھ کر سلیمان فرط مسرت سے کھل گیا اور سمجھا کہ میرے عہد خلافت میں لوگ نہایت امن وسکون سے ہیں، لیکن عمرؒ حج میں لوگوں کی بھیڑ اور کعبہ کے پردہ کے پاس لوگوں کے آنسوؤں کا بہنا دیکھ چکے تھے۔ عمرؒ ان سب چیزوں کو خلیفہ کی آنکھ سے نہیں کسی اور آنکھ سے دیکھ رہے تھے۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ لوگ ان ہولناک مظالم کے نیچے دبے ہوئے رو اور بلبلا رہے ہیں اور وہ طواف وسعی میں گڑگڑا کر اللہ سے دعا مانگ رہے ہیں کہ اللہ انہیں ان مظالم سے نجات دلائے۔ چنانچہ مورخین نے لکھا ہے کہ سلیمان کے عہد خلافت کی تمام اصلاحات درحقیقت سیدنا عمر بن عبدالعزیزؒ کی صحبت اور ان کی ہم نشینی کا نتیجہ ہیں۔ انہی اصلاحات اور امور خیر کے باعث مورخین کی نگاہ میں بعض حیثیتوں سے وہ اپنے پیش رووں سے زیادہ بہتر حکمران ثابت ہوا۔ اس کی تخت نشینی کے ساتھ ہی اس کی نیک طبعی کے باعث اموی حکومت کی سیاست یک قلم تبدیل ہوگئی جس کا اندازہ اس کی اس تقریر سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے جو اس نے مسند خلافت پر بیٹھنے کے بعد کی۔ اس نے کہا:

"الحمدللہ! دنیا دھوکے کی جگہ اور باطل کا گھر ہے۔ یہ ایسی ہے کہ رونے والے کو ہنساتی ہے اور ہنسنے والے کو رولاتی ہے۔ بے خوف کو خوف زدہ اور خوف زدہ کو بے خوف کرتی ہے دولت مند کو محتاج اور محتاج کو مال و دولت سے مالا مال کرتی ہے۔ یہ ایسی ہے کہ اہل دنیا کو مائل کرنے والی۔ دھوکہ دینے والی اور اپنے چاہنے والے کے ساتھ کھیلنے والی ہے۔ اے اللہ کے بندو! کتاب اللہ کو اپنا امام بناؤ اور اس کے فیصلوں کے سامنے سر تسلیم خم کردو۔ اسے اپنا راہ نما مانو کیونکہ وہ اپنے سے پہلی کتابوں کی ناسخ ہے اور خود اس کو کسی کتاب اور صحیفہ نے منسوخ نہیں کیا۔ اے اللہ کے بندو! قرآن حکیم شیطان کے مکر وفریب کو اسی طرح کھول دیتا ہے جس طرح صبح صادق کی روشنی رات کی تاریکی کو کافور کر دیتی ہے"۔ (مسعودی جلد۲ ص۲۶۰، البیان والتبیین جلد۱ ص۱۶۶)

یہ خطبہ اس کی طبیعت کی سلامتی اور فطرت کی پاکیزگی پر دلالت کرتا ہے، لیکن اس پر مستزاد یہ کہ سیدنا عمر بن عبدالعزیزؒ اس کے مشیر تھے، لہذا عملی طور پر بھی اس کے محاسن کا ظہور ہوا۔ چنانچہ مسند خلافت پر بیٹھنے کے ساتھ ہی سب سے پہلا کام اس نے جو کیا وہ یہ تھا کہ ولید بن عبدالملک کے دور کے ان تمام لوگوں کو جن کو اس نے ناحق پس دیوار زنداں

کر رکھا تھا، فوری طور پر رہا کر دیا جس کا یہ اثر ہوا کہ تمام جیل خانے یک قلم خالی ہو گئے۔اس سے ایک تو لوگوں کے دلوں میں سلیمان کی عزت وتوقیر پیدا ہوئی اور دوسرے حکومت کے اخراجات میں کمی ہوئی۔

اگرچہ سیدنا عمر بن عبدالعزیزؒ سلیمان کے مشیر خاص تھے، لیکن وہ ان کے کسی ایسے مشورہ کو نہیں مانتا تھا جو اس کی طبیعت کے خلاف ہو۔مورخین نے اس کے بارہ میں لکھا ہے "احسن السیرۃ والمظالم" (ابوالفداء جلد ا ص ۲۰۰) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جہاں اس میں فطری طور پر کچھ خوبیاں تھیں وہاں کچھ مظالم اور برائیاں بھی نہاں تھیں۔ چنانچہ مورخین نے لکھا ہے کہ اس میں انتقام کا مادہ بہت زیادہ تھا۔ وہ اپنی مخالفت کرنے والوں کو کبھی بھی انتقام لیے بغیر نہیں چھوڑتا تھا۔ چنانچہ جن جن لوگوں سے ولی عہدی کے زمانہ میں اس کو کسی قسم کی شکایت تھی، مسند نشین خلافت ہونے کے بعد ان کا انجام اچھا نہ ہوا جن میں بعض بڑے بڑے فاتحین اور اموی حکومت کے ستون تھے جن کی شمشیر خارا شگاف نے اپنی عسکری مہارت کا نہ صرف لوہا منوایا بلکہ اموی حکومت کے تحفظ اور اس کی وسعت کا باعث بھی بنیں۔ چنانچہ اس نے مسند نشین ہوتے ہی فاتح ترکستان قتیبہ بن مسلم، محمد بن قاسم فاتح ہند کو قتل کروا دیا۔ فاتح اندلس موسیٰ بن نصیر اور اس کے بیٹے عبدالعزیز بن موسیٰ کو جو شجاعت وشہامت میں اپنے باپ موسیٰ کی طرح تھا، ذلیل اور قتل کرایا، لہذا سیدنا عمر بن عبدالعزیزؒ کو مشیر مقرر کرنے کے باوجود اس کی سیرت میں محاسن ومظالم دونوں کے مظاہر نظر آتے ہیں۔ لیکن ان سب باتوں کے باوجود یہ حقیقت بھی اپنی جگہ مسلم ہے کہ سلیمان کے عہد خلافت کی اصلاحات دراصل عمر بن عبدالعزیزؒ کے مشورے کی مرہون منت ہیں۔

خلافت

(سلیمان بن عبدالملک دابق میں مقیم تھا کہ یہیں مرض الموت میں مبتلا ہو گیا۔ اس وقت تک ولی عہد کا کوئی فیصلہ نہیں ہوا تھا۔ جب حالت زیادہ خراب ہوئی اور وہ زندگی سے مایوس ہو گیا تو اس نے اپنے نابالغ بیٹے ایوب کو اپنا ولی عہد نامزد کیا۔ اس وقت محدث رجاء بن حیوۃ کندی اس کے ساتھ تھے۔ انہوں نے کہا: "امیرالمومنین! خلیفہ کسی صالح، نیک اور امین و دیانت دار شخص کو بنانا چاہیے تا کہ قبر میں امن اور قیامت کے روز خجالت نہ اٹھانی

پڑے"۔ سلیمان چونکہ نیک فطرت اور سلیم الطبع شخص تھا لہذا محدث رجاء کی یہ بات اس کے قلب کی اتھاہ گہرائیوں میں گھر کر گئی۔ وہ اس مسئلہ پر غور کرنے لگا۔ دو دن کے بعد اس نے اپنا وصیت نامہ چاک کر ڈالا اور رجاء بن حیوۃ سے پوچھا: "میرے لڑکے داؤد کے بارہ میں آپ کی کیا رائے ہے؟" انہوں نے کہا: "وہ اس وقت قسطنطنیہ کی مہم پر ہے اور یہ بھی معلوم نہیں کہ وہ زندہ بھی ہے یا مر گیا ہے"۔ کیونکہ قسطنطنیہ کی فوج کا ایک بہت بڑا حصہ ہلاک ہو گیا تھا اور داؤد کے بارہ میں کوئی پتہ نہیں تھا کہ وہ زندہ ہے یا وہ بھی ہلاک ہو گیا ہے"۔ سلیمان نے کہا: "اب آپ کی کیا رائے ہے؟ کس کو خلیفہ نامزد کیا جائے؟" رجاء نے کہا: "امیر المومنین! نامزدگی تو آپ نے کرنی ہے لہذا اصل رائے تو آپ کی ہے۔ آپ نام لیجئے میں غور کروں گا"۔ سلیمان نے کہا "عمر بن عبدالعزیزؒ کے بارہ میں آپ کا کیا خیال ہے؟" رجاء نے جواب دیا: "میرے نزدیک وہ نہایت فاضل، نیک، سلیم الفطرت، دیانت دار اور برگزیدہ مسلمان ہیں"۔ سلیمان نے کہا: "بخدا! میرا بھی ان کے بارہ میں یہی خیال ہے لیکن اگر عبدالملک کی اولاد کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا اور ان کی بجائے عمر بن عبدالعزیزؒ کو خلیفہ بنا دیا گیا تو ایک بڑا فتنہ پیدا ہو جائے گا اور لوگ ان کو خلافت پر قائم نہ رہنے دیں گے، لہذا میں عمر بن عبدالعزیزؒ کو خلیفہ اور ان کے بعد یزید بن عبدالملک کو ولی عہد نامزد کرتا ہوں۔ اس سے لوگ کافی حد تک مطمئن ہو جائیں گے اور عمر بن عبدالعزیزؒ کی خلافت تسلیم کر لیں گے۔ بات کافی حد تک معقول تھی کیونکہ اس نظام حکومت میں عبدالملک کی اولاد اپنے کو عمر بن عبدالعزیز سے زیادہ خلافت کا مستحق سمجھتی تھی۔ رجاء نے سلیمان کی اس بات کی تائید کی۔ چنانچہ اس وقت سلیمان نے خود اپنے ہاتھ سے یہ وصیت نامہ تحریر کیا:

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم: یہ تحریر خدا کے بندے سلیمان بن عبدالملک امیر المومنین کی طرف سے عمر بن عبدالعزیز کے لیے ہے۔ میں اپنے بعد آپ کو خلیفہ بناتا ہوں اور آپ کے بعد یزید بن عبدالملک کو۔ لہذا مسلمانو! ان کا کہنا سننا اور ان کے احکام کی اطاعت کرنا، اللہ تعالیٰ سے ہر حالت میں ڈرنا اور آپس میں اختلاف نہ کرنا کہ دوسرے لوگ آپ پر حرص و آز کی نگاہ ڈالیں"۔

یہ وصیت نامہ سر بمہر کر کے محدث رجاء بن حیوۃ کے حوالے کیا اور حکم دیا کہ وہ

Marfat.com

خاندان کے لوگوں کو اکٹھا کر کے بغیر نام کے ظاہر کیے ان سے نامزد خلیفہ کی بیعت لے لیں۔ چنانچہ انہوں نے اس حکم کی تعمیل کی۔ سب نے بالاتفاق سمعنا واطعنا کہا۔ اس کے بعد پھر سب اہل خاندان سلیمان کو دیکھنے کے لیے گئے اور ان کے سامنے سب نے فرداً فرداً بیعت کی۔ (یہ تمام تفصیلات طبقات ابن سعد جلد ۵ میں مذکور ہیں) اس مرحلہ سے فراغت کے بعد ماہ صفر ۹۹ ھ میں سلیمان اس دارفانی سے عالم باقی کو انتقال کر گیا۔ ایک روایت میں ہے کہ جب خاندان کے لوگ سلیمان کو دیکھنے کے لیے گئے تو سلیمان نے وصیت نامہ کی طرف جو محدث رجاء بن حیوۃ کے ہاتھ میں تھا، اشارہ کر کے ان لوگوں سے کہا: "اس وصیت نامہ میں میں نے جس کو خلیفہ بنایا ہے اس کی بیعت کرو اور اس کی اطاعت کرتے رہو۔ سلیمان کے کہنے پر دوبارہ سب نے فرداً فرداً بیعت کی۔

(البدایہ والنہایہ جلد ۹ ص ۱۹۵)

بعض روایات میں ہے کہ موت جب سلیمان کو جھانکنے لگی اور اس کی بے قراری میں اضافہ ہوا تو اس نے اس خواہش کا اظہار کیا کہ میرے بچے میرے سامنے مسلح پیش کیے جائیں یعنی تلواریں لگی ہوئی ہوں، زرہیں پہنی ہوئی ہوں اور لڑائی کی چادریں اوڑھے ہوئے ہوں۔ شاید میں اپنے کسی بچے میں شجاعت کے آثار دیکھوں اور اس کے حق میں خلافت کی وصیت کر جاؤں۔ رجاء بن حیوۃ نے حکم کی فوری طور پر تعمیل کی اور اس کے سب بچے مسلح حالت میں اس کے سامنے پیش کیے گئے۔ سلیمان نے انہیں دیکھ کر کہا:

ان بنی صبیة صغار افلح من کان له کبار

"میرے بچے چھوٹے ہیں، وہ کامیاب ہے جس کے بڑے ہوں۔"

اس وقت عمر بن عبدالعزیزؒ بھی وہاں موجود تھے۔ وہ بولے:

قدافلح من تزکی، وذکر اسم ربه فصلّی

وہ کامیاب ہوا جو پاک ہوا اور اس نے اپنے رب کا نام لیا اور نماز پڑھی۔

یہ آیت سُن کر سلیمان تاڑ گیا۔ پھر اس نے اپنے دل میں کہا وہ خلافت کی گرہ اس طرح باندھے گا کہ اس میں شیطان کا حصہ نہ ہوگا۔ (سیرۃ ابن عبدالحکم ص ۳۰)

سیدنا عمرؒ اگرچہ خلافت کے خواہاں نہ تھے اور نہ انہوں نے اس کے لیے کوئی دوڑ دھوپ کی لیکن ان کا ظن غالب تھا کہ سلیمان انہی کو خلیفہ نامزد کریں گے۔ یہ گمان اسی روز

Marfat.com

سے تھا جس روز سلیمان خلیفہ بنے تھے۔نوروز اور مہرجان کے دن سلیمان کے پاس سونے کے برتنوں میں تحائف کی بھرمار ہوتی تھی۔ جب لوگ تحائف لے کر آتے اور عمرؒ وہاں موجود ہوتے تو جب بھی کوئی تحفہ لے کر گزرتا تو سلیمان پوچھتے "عمر! کہو یہ کیسا ہے؟" عمرؒ جواب دیتے: "امیرالمومنین! یہ تو دنیوی زندگی کی پونجی ہے۔سلیمان پوچھتے: "اچھا اگر تمہیں خلیفہ بنا دیا جائے تو تم ان کا کیا کرو گے؟" عمرؒ جواب دیتے: "امیرالمومنین! اللہ گواہ ہے کہ میں انہیں بانٹ دوں گا اور ایک بھی اپنے پاس نہیں رکھوں گا"۔

(سیرۃ ابن عبدالحکم ص ۱۲۱)

بعض روایات میں ہے کہ سلیمان کی وفات کے بعد محدث رجاء بن حیوۃ اس اندیشے کے تحت کہ سلیمان کی وفات کی خبر سننے کے بعد کہیں اہل خاندان سیدنا عمر بن عبدالعزیزؒ کی بیعت میں کچھ لیت ولعل نہ کریں، موت کی خبر کو مخفی رکھا اور دوبارہ خاندان کے تمام افراد کو جمع کر کے ان سے امیرالمومنین کے وصیت نامہ پر پھر فرداً فرداً بیعت لی اور اس طرح بیعت کو مستحکم کرنے کے بعد سلیمان کی موت کا اعلان کیا اور وصیت نامہ پڑھ کر سُنایا۔ سیدنا عمر بن عبدالعزیزؒ کی نامزدگی کا سن کر تمام افراد نے سمعنا واطعنا کہا لیکن ہشام بن عبدالملک نے بیعت سے انکار کر دیا۔ رجاء نے حالات کی نزاکت کا احساس کرتے ہوئے ہشام سے کہا کہ خاموشی سے بیعت کر لو ورنہ تمہارا سر قلم کر دوں گا۔ اور عمر بن عبدالعزیز کا ہاتھ پکڑ کر انہیں منبر پر بٹھا دیا اور پھر کسی نے چون و چرا نہ کی۔خلافت کا بارگراں سر پر آتے ہی عمر بن عبدالعزیزؒ کی زندگی ہی بالکل بدل گئی۔ وہ عمرؒ جن کی گورنری پر تقرر کے وقت تیس اونٹ ان کا ذاتی سامان اٹھا کر لائے تھے۔ (یعقوبی جلد۲ ص ۲۳۹) جن کی خوش لباسی اور نفاست طبعی کا یہ حال تھا کہ جس لباس پر ایک مرتبہ کسی کی نظر پڑ جاتی تھی پھر اسے زیب تن نہ فرماتے تھے (سیرۃ عمر بن عبدالعزیزؒ لابن جوزی ص ۶۶) خوشبویات کے شوق کی وجہ سے داڑھی پر عنبر کا سفوف چھڑکتے تھے۔ (سیرۃ عمر بن عبدالعزیز ص ۱۵۱) مورخین نے لکھا ہے کہ آپ اپنے زمانہ کے سب سے زیادہ خوش لباس آدمی تصور کیے جاتے تھے، اور محدث رجاء بن حیوۃ کا بیان ہے کہ آپ اپنے زمانہ کے سب سے زیادہ خوس لباس، خوشبویات کے دلدادہ اور تبختر کی چال چلنے والے تھے۔ (سیرۃ عمر بن عبدالعزیز ص ۱۵۱) لیکن جونہی خلافت کی ذمہ داریوں کا بوجھ پڑا اور مسند خلافت پر قدم رکھنے کے

ساتھ ہی سیدنا ابوذر غفاریؓ اور سیدنا ابوہریرہؓ اور دیگر درویش صحابہ کرامؓ کا قالب اختیار کر لیا۔ دل کی دنیا بدلنے کے ساتھ ظاہری دنیا بھی بدل گئی۔ اب نہ وہ زرق برق کا لباس تھا اور نہ وہ مشک وعنبر کی خوشبویات تھیں۔ بار خلافت نے آخری ضرب لگائی تو یکا یک آنکھیں کھل گئیں اور اب دوسرے ہی عالم کی ہوش ربائیاں تھیں، نہ وہ آسمان تھا، نہ زمین تھی، نہ وہ آفاق تھا نہ انفس۔ انقلاب قوموں میں ہو یا افراد میں پہلے سطح پر نہیں بلکہ دل ودماغ کی گہرائیوں میں پیدا ہوتا ہے اور دل ودماغ میں انقلاب آنے کے بعد پھر انسان یوں سمجھتا ہے کہ زندگی کا مزہ انہی کو ملتا ہے جو اس کی شیرینیوں کے ساتھ اس کی تلخیوں کے گھونٹ بھی لیتے رہتے ہیں۔ کیونکہ یہاں پانے کا مزہ انہی کو ملتا ہے جو کھونا جانتے ہیں۔ جنہوں نے کچھ کھویا نہیں انہیں کیا معلوم کہ پانے کے معنی کیا ہوتے ہیں۔ مختصر یہ کہ سیدنا عمر بن عبدالعزیزؒ کی زندگی میں ایک انقلاب آ گیا۔ چنانچہ سلیمان بن عبدالملکؒ کی تجہیز وتکفین سے فراغت کے بعد حسب معمول جب آپ کو شاہی سواری پیش کی گئی تو آپ نے وہ واپس کر دی اور فرمایا: ''میرے لیے میرا خچر کافی ہے''۔

(طبقات ابن سعد جلد ۵ ص ۲۴۷، البدایہ والنہایہ جلد ۹ ص ۲۰۸)

ابھی سلیمان کے اہل وعیال قصر خلافت ہی میں تھے اس وجہ سے آپ اپنے خیمہ میں فروکش ہو گئے۔ (سیرۃ عمر بن عبدالعزیز ص ۵۲) گھر پہنچے تو اس بارگراں کی ذمہ داری سے چہرہ پریشان تھا کیونکہ اب عمر بن عبدالعزیزؒ فکری، نظری اور عملی ہر لحاظ سے بدل چکے تھے۔ دلوں کی اقلیم میں منٹوں اور لمحوں کے اندر انقلاب پیدا ہو جاتا ہے اور اس کے انقلاب سے اس دنیا کے انقلابات وابستہ ہیں۔ قلب کی سرزمین میں امید وطلب کے بے شمار درخت اُگتے ہیں اور بہار کی آمد آمد کی راہ تکتے رہتے ہیں لیکن جن ٹہنیوں کی جڑ کٹ گئی ہو ان کے لیے بہار وخزاں کی تبدیلیاں کوئی اثر نہیں رکھتیں، کوئی موسم بھی انہیں شادابی کا پیغام نہیں پہنچا سکتا۔ عمر بن عبدالعزیزؒ کے قلب کی جڑیں مضبوط وتوانا تھیں اس وجہ سے خلافت کا بارگراں پڑتے ہیں پریشانی اور رنج وغم کی گھنگور گھٹائیں قلب کی اتھاہ گہرائیوں میں امنڈ آئیں اور اس کے آثار چہرہ پر بھی نظر آنے لگے۔ یہ سب کچھ اس لیے تھا کہ وہ اگرچہ نامزد تھے لیکن اپنے کو خلیفہ سمجھتے تھے۔ شخصی حکمران نہیں سمجھتے تھے جس کو نہ دنیا کی فکر ہوتی ہے اور نہ آخرت میں مسئولیت کا کچھ خوف کیونکہ شخصی حکمرانوں کے سر پر تاج ہوتا ہے لیکن

Marfat.com

پہلو میں دل نہیں ہوتا۔ ان کے تمام جذبات تاج کی حفاظت کے تحت ہوتے ہیں اور اس بارے میں وہ گویا انسان کی عام فطری جبلت کے علاوہ ایک ہی جنس خاص بن جاتے ہیں۔

علامہ ابن جوزیؒ نے لکھا ہے کہ جونہی گھر پہنچے تو پریشان حال اور کبیدہ خاطر تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی کوہ گراں آپ پر ڈال دیا گیا ہے۔ خادمہ نے پوچھا: خیر ہے، آپ اس قدر متفکر کیوں ہیں۔ فرمایا! اس سے بڑھ کر فکر وتشویش کی کیا بات ہوگی کہ مشرق ومغرب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کا کوئی ایسا فرد نہیں ہے جس کا حق مجھ پر نہ ہو اور بغیر مطالبہ اور اطلاع کے اس کا ادا کرنا مجھ پر فرض نہ ہو۔ (سیرۃ عمر بن عبدالعزیز ص ۵۲) یہ سارے واقعات حافظ ذہبیؒ نے اپنی کتاب سیر اعلام النبلاء جلد ۵ ص ۱۱۷ سے ص ۱۲۶ تک نقل کیے ہیں۔

خلیفہ مقرر ہونے کے بعد یہی جذبات آپ کے ننھیالی جدامجد سیدنا فاروق اعظمؓ کے تھے۔ چنانچہ روایات میں ہے کہ سیدنا صدیق اکبرؓ نے مرض الموت میں سیدنا عمرؓ کو خلیفہ مقرر فرمایا اور ان کے وہ فرائض یاد دلائے جو ایک خلیفہ پر عائد ہوتے ہیں۔ پھر انہیں اللہ تعالیٰ کی رحمت کے حصول کی ترغیب دلائی اور اللہ تعالیٰ کے غضب سے ڈرایا تاکہ بندہ اپنے اللہ سے رغبت بھی رکھے اور اس سے خوف بھی کھائے۔ پھر کچھ اور کارآمد اور ضروری وصیتیں کیں جن میں مملکت کے دستور العمل کے بارہ میں کچھ مفید باتیں بھی تھیں۔ جب سیدنا ابوبکرؓ یہ وصیتیں فرما چکے تو سیدنا عمرؓ باہر تشریف لائے۔ گردن جھکی ہوئی تھی اور ذہن غور وفکر میں مصروف، شاید وہ یہ سوچ رہے تھے کہ میں اس گراں بار ذمہ داری کے بار دوش سے کیسے سبک دوش ہوں گا اور کاش سیدنا ابوبکرؓ صحت یاب ہو جائیں اور خلافت کی یہ عظیم ذمہ داری مجھ سے ٹل جائے لیکن ابوبکرؓ تو صحت یاب نہ ہوئے مگر یہ گرانبار ذمہ داری سیدنا عمر فاروقؓ پر پڑ گئی۔ وہ بڑی اہم اور غیر معمولی ذمہ داری تھی جس کے اٹھانے سے بڑے بڑے دل گردے والے اعراض برتتے ہیں اگر ان کے دلوں میں اللہ کا خوف ہو۔ سیدنا عمرؓ نے اس بوجھ کو اس طرح اٹھایا اور آپ ان ذمہ داریوں سے اس طرح عہدہ برآ ہوئے کہ دنیا آج تک انگشت بدندان ہے۔ کچھ یہی حالت خلیفہ بننے کے بعد عمر ثانیؒ کی ہوئی، کیونکہ وہ فطرتاً خلافت کی عظیم الشان اور گراں بار ذمہ داریوں سے گھبراتے تھے۔ پھر خلافت کے بارہ میں آپ کا جو نقطۂ نظر تھا وہ وہی تھا جو خلفائے راشدین کا تھا۔ وہ شروع ہی سے

Marfat.com

خلافت کے اس بارِ عظیم کو اٹھانا چاہتے تھے اور ان کو اپنے بارہ میں قوی شبہ تھا کہ سلیمان انہیں ہی خلیفہ نامزد کرے گا۔ چنانچہ روایات میں ہے کہ انہوں نے رجاء بن حیوۃ سے کہا کہ میرے اوپر سلیمان کی جو شفقتیں اور نوازشیں ہیں ان سے مجھے خطرہ ہے کہ انہوں نے خلافت کی وصیت میرے متعلق ہی نہ کر دی ہو۔ اگر ایسا ہو تو براہ نوازش آپ مجھے بتا دیں تاکہ قبل اس کے کہ میں مجبور ہو جاؤں ابھی اس سے استعفاء دے دوں لیکن محدث رجاء نے انہیں اس بارہ میں بتانے سے انکار کر دیا کیونکہ ایک روایت کے مطابق رجاء ہی نے ان کا نام خلافت کے لیے تجویز کیا تھا۔ (سیر اعلام النبلاء جلد ۵ ص ۱۲۴)

بعض حضرات نے لکھا ہے کہ آپ کچھ اس وجہ سے بھی پریشان تھے کہ آپ کو نامزد کیا گیا تھا، شوریٰ نے آپ کو منتخب نہیں کیا تھا، لیکن یہ وجہ ہمارے نزدیک اتنی معتبر نہیں کیونکہ اسلام میں نامزدگی بھی جائز ہے۔ یہ شبہ بعض ذہنوں میں صرف اس لیے پیدا ہوتا ہے کہ آج کل لوگوں کے ذہنوں پر جمہوریت کا بھوت سوار ہے اور جمہوری ذہن رکھنے والے لوگ نامزدگی کو جائز نہیں سمجھتے۔ جب کہ اسلام میں جائز ہے۔ (ملاحظہ مقدمہ ابن خلدون ص ۲۴۰) جیسا کہ اس کی تفصیل ہم نے اپنی کتاب سیرت حضرت عمر فاروقؓ ص ۱۵۹۔۱۶۱) میں کی ہے۔ سیدنا عمر بن عبدالعزیزؒ میں جب زیادہ اضطراب پیدا ہوا تو آپ غور وفکر کے بعد اس سے دست برداری کے لیے آمادہ ہو گئے۔ چنانچہ آپ نے لوگوں کو جمع کر کے ان سے فرمایا:

"لوگو! میری خواہش اور عوام الناس کی رائے لیے بغیر مجھ پر خلافت کی گرانبار ذمہ داریاں ڈال دی گئی ہیں، اس لیے میری بیعت کا جو طوق آپ حضرات کی گردن پر ہے میں اسے خود اُتار دیتا ہوں۔ تم جسے چاہو اپنا خلیفہ منتخب کر لو"۔

یہ کلمات کہے تھے کہ لوگوں نے شور بلند کیا کہ ہم نے آپ کو خلیفہ بنایا ہے اور ہم سب آپ کی خلافت سے راضی ہیں۔ آپ اللہ کا نام لے کر امور خلافت کو انجام دیں۔ جب آپ کو اس بات کا پورا پورا یقین ہو گیا کہ کسی شخص کو آپ کی خلافت سے کوئی اختلاف نہیں اور ہر شخص میری خلافت کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتا ہے تو آپ نے اس بارگراں کو قبول فرما لیا اور پھر مسلمانوں کے سامنے خطاب فرمایا جس میں انہیں تقویٰ اور یوم آخرت کے بارہ میں تلقین فرمائی اور پھر خلیفہ اسلام کی اصلی حیثیت اور حقیقت کو واضح فرمایا جسے بعض

Marfat.com

اموی فرماں رواؤں نے ملوکیت کے دبیز پردوں میں گم کر دیا تھا۔ آپ نے اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر درود و سلام کے بعد فرمایا:

"اے لوگو! تمہارے نبی کے بعد کوئی دوسرا رسول اور نبی آنے والا نہیں ہے اور جو کتاب اللہ تعالیٰ نے ان پر اُتاری ہے اس کے بعد اب کوئی دوسری کتاب آنے والی نہیں ہے اللہ تعالیٰ نے جو شے حلال کر دی ہے۔ وہ اب قیامت تک کے لیے حلال ہے اور جو حرام کر دی ہے وہ قیامت تک کے لیے حرام ہے۔ میں اپنی طرف سے کوئی فیصلہ کرنے والا نہیں ہوں بلکہ صرف اللہ تعالیٰ کے احکام کو نافذ کرنے والا ہوں۔ خود اپنی طرف سے نئی بات پیدا کرنے والا نہیں ہوں بلکہ محض اتباع اور پیروی کرنے والا ہوں۔ (ولست بمبتدع ولکنی متبع) کسی کو یہ حق حاصل نہیں کہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی میں اس کی اطاعت کی جائے۔ میں تم میں سے کوئی ممتاز شخص نہیں ہوں بلکہ ایک معمولی فرد ہوں البتہ تمہارے مقابلہ میں اللہ تعالیٰ نے مجھے زیادہ گراں بار کیا ہے"۔

(سیرت عمر بن عبدالعزیز لا بن جوزی ص ۱۰۸، سیر اعلام النبلاء جلد ۵ ص ۱۲۶، البدایہ والنہایہ جلد ۹ ص ۱۹۹، ۲۱۲، طبقات ابن سعد جلد ۵ ص ۲۵۰۔۲۵۱)

بعض روایات میں ہے کہ جس وقت دمشق میں سیدنا عمر بن عبدالعزیزؒ کی بیعت ہو رہی تھی اور لوگ ان کو اپنے دل کی گہرائیوں سے اپنا خلیفہ تسلیم کر چکے تھے کیونکہ وہ ان کی نیکی اور طبیعت کی پاکیزگی سے بخوبی آشنا تھے اور سمجھتے تھے کہ ایسا شخص رعایا کے مفاد کو مدّ نظر رکھے گا نہ کہ اپنے ذاتی مفاد کو، اس وقت عبدالعزیز بن عبدالملک جو کہیں باہر تھا اور اس کو سلیمان کی عمر بن عبدالعزیزؒ کے بارہ میں وصیت کا کوئی علم نہ تھا، اس نے سلیمان کی موت کی خبر سُن کر اپنے ساتھیوں سے اپنی بیعت لے لی کیونکہ وہ بھی اپنے آپ کو خلافت کا ایک امیدوار سمجھتا تھا۔ ساتھیوں سے بیعت لے کر وہ دمشق کے ارادے سے بڑھا۔ راستہ میں اسے سلیمان کی وصیت اور سیدنا عمر بن عبدالعزیزؒ کی بیعت کا حال معلوم ہو گیا۔ یہ سن کر وہ سیدھا عمر ثانیؒ کے پاس پہنچا۔ ان کو اس کے بیعت لینے کی خبر ہو چکی تھی۔ چنانچہ انہوں نے اس سے کہا: مجھے پتہ چلا ہے کہ تم اپنی بیعت لے کر دمشق میں داخل ہونا چاہتے تھے۔ عبدالعزیز نے کہا: مجھے اس بات کا علم نہ تھا کہ سلیمان نے آپ کو خلیفہ نامزد کر دیا

Marfat.com

ہے۔ اس لیے مجھے اندیشہ تھا کہ لوگ خزانہ وغیرہ لوٹ لیں گے۔ سیدنا عمر بن عبدالعزیزؒ نے فرمایا: اگر لوگ تمہارے ہاتھ پر بیعت کر لیتے اور تم بار خلافت کو سنبھال لیتے تو میں تم سے کوئی جھگڑا نہ کرتا اور خلافت کے بار دوش سے سبکدوش ہو کر اپنے گھر میں بیٹھ جاتا۔ عبدالعزیزؒ نے کہا: خدا گواہ ہے کہ آپ کے ہوتے ہوئے میں دوسرے کا خلیفہ ہونا پسند ہی نہیں کرتا۔ چنانچہ اس نے آپ کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔

سلیمان کی تجہیز و تکفین

سلیمان انتقال کر گیا۔ اس کی تجہیز و تکفین کر دی گئی۔ جب تدفین کا وقت آیا تو لوگوں نے اس کی میت قبر تک پہنچائی اور انہیں دابق کے ٹیلہ سلیمان پر عبداللہ بن مسافع قرشی کے پاس دفن کر دیا گیا۔ یہ جمعہ کا دن تھا۔ سلیمان کی قبر میں اس کے تین بیٹے اور عمرؒ اُترے۔ جب انہوں نے سلیمان کی میت دفن کے لیے اٹھائی تو ایسا محسوس ہوا کہ سلیمان اپنے ہاتھ ہلا رہے ہیں۔ ان کا ایک بیٹا بولا: اللہ کی قسم! میرے والد زندہ ہو گئے۔ عمرؒ بولے نہیں، نہیں، لیکن آپ کے باپ سے جلدی کی گئی۔ امراء اور عوام نے عمرؒ کے بارہ میں یہ افواہ اُڑا دی کہ انہوں نے سلیمان کو زندہ دفن کر دیا۔ کیونکہ موت اور دفن کی درمیانی مقررہ مدت نہیں گزری تھی۔ ہو سکتا ہے کہ وہ بے ہوش ہوں اور فوت نہ ہوئے ہوں، لیکن یہ سب کچھ عمرؒ کے خلاف ایک پراپیگنڈہ تھا۔

Marfat.com

خلافت علیٰ منہاج النبوت کا احیاء

خلافت کا احیاء

آپ خلیفہ تو ہو گئے اور تمام خاندان اور ارباب حل وعقد نے آپ کے ہاتھ پر بیعت بھی کر لی، لیکن آپ ایسا خلیفہ نہیں بننا چاہتے تھے جیسے کہ بنوامیہ کے دوسرے خلفاء تھے۔ آپ خلافت کو شوریٰ کی بنیاد پر استوار کر کے چلانا چاہتے تھے کیونکہ عہد نبوت سے جوں جوں دوری ہوتی جا رہی تھی دوں دوں خلافت میں مختلف خرابیاں پیدا ہوتی جا رہی تھیں۔ اسلامی خلافت جس کو ابوبکرؓ، عمرؓ اور عثمانؓ وعلیؓ نے شوریٰ کی بنیادوں پر چلایا تھا اب شخصی حکومت کا قالب اختیار کر رہی تھی اور شخصی حکومت میں جیسا کہ گذشتہ سطور میں بیان کیا جا چکا ہے شخصی حکمرانوں کے سر پر تاج ہوتا ہے لیکن پہلو میں دل نہیں ہوتا۔ ان کی ساری تگ و دو اور جد و جہد تاج کی حفاظت کے لیے ہوتی ہیں رعایا کی ترقی اور مرفہ حالی کے لیے نہیں ہوتی۔ چنانچہ تاریخ کی روایات سے پتہ چلتا ہے کہ ایک مستبد حکومت کی خرابیاں خلافت اسلامی میں دھیرے دھیرے پیدا ہو رہی تھیں۔ دینی روح کمزور ہوتی جا رہی تھی، جمہور اور رعایا کی آواز دب گئی تھی۔ خلیفہ جو بیت المال کا کسٹوڈین ہوتا تھا، اب خلفاء کا ذاتی خزانہ بن چکا تھا، شاہی خاندان کے لوگوں کو جاگیریں دے دے کر انہیں ایک جاگیردار طبقہ بنا دیا گیا تھا، یہاں تک کہ خلیفہ بھی اپنے کو ان کا محتاج سمجھتا تھا۔ خلافت کی وہ سادگی اور فطری حیثیت جو ابوبکرؓ اور عمرؓ کے زمانوں میں تھی بالکل قصہ پارینہ ہو کر رہ گئی تھی جس کے

Marfat.com

نتیجہ میں اسلامی خلافت کی حقیقی روح دم واپسیں پر تھی۔ ان حالات میں سید نا عمر بن عبدالعزیزؒ کا مطمح نظر اپنے پیش رووں سے بالکل مختلف تھا۔ آپ خلافت کے پورے نظام میں انقلاب لا کر خلفائے راشدین کا نظام خلافت لانا چاہتے تھے۔ جس میں ایک بڑھیا بھی برسر عام خلیفہ وقت کو ٹوک سکتی ہے اور جس نظام میں رعایا کو اپنی جان ومال اور عزت وآبرو کا پورا پورا تحفظ ہو۔ ان کی آواز سنی جائے، ان کے مسائل حل ہوں کیونکہ جو خلافت رعایا کی بہی خواہ نہ ہو وہ خلافت نہیں ایک مستبدانہ حکومت ہے۔ چنانچہ وہ ان تمام برائیوں کو جو خلافت کے نظام میں در آئی تھیں، ختم کر کے طرز جہاں بانی اور طریق حکمرانی میں اسے خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کے قریب تر کر دینا چاہتے تھے۔ لیکن ان حالات میں نظام حکومت کا یہ انقلاب جتنا اہم تھا اتنا ہی خطرناک اور نازک بھی تھا۔ مگر آپ نے ان تمام حالات اور مشکلات کو نظر انداز کر کے اپنا کام شروع کر دیا اور نتائج کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دیا۔

اموی خلافت کی کوتاہیاں

یہ درست ہے کہ اموی خلافت میں بہت سی کوتاہیاں اور خرابیاں واقع ہو گئی تھیں لیکن پھر بھی خلفاء اور رعایا میں بہت زیادہ دین داری تھی۔ سیدنا مروان بن الحکمؓ کے بارہ میں تو ہم نے گذشتہ صفحات میں وضاحت کر دی ہے کہ وہ صحابی رسول ہونے کے ساتھ ساتھ بہت زیادہ دیندار اور مذہب کے پابند تھے۔ ایک فرقہ نے پراپیگنڈہ کر کے ان کے شخصیت کو داغدار کرنے کی کوشش کی۔ جہاں تک عبدالملک بن مروان کا تعلق ہے تو جس وقت عبدالملک کے ہاتھ میں زمام حکومت آئی اس وقت ساری دنیائے اسلام پر آشوب ہو رہی تھی۔ لیکن عبدالملک نے اپنے عزم واستقلال اور تدبیر وشجاعت سے ان تمام مخالف حالات پر قابو پا لیا۔ اپنے دور حکومت میں بے شمار نئی مساجد تعمیر کروائیں۔ پرانی مساجد کی توسیع ومرمت کی۔ ۶۵ھ میں جامع دمشق بنوائی اور صخرہ پر عظیم الشان گنبد بنوایا۔ نئے شہر آباد کئے پرانے شہروں کو جو ویران ہو چکے تھے دوبارہ آباد کروایا۔ علاوہ ازیں رفاہ عامہ کے بہت سے کام کیے جن سے لوگوں کو بڑا فائدہ ہوا۔

اور جہاں تک اس کی ذاتی زندگی کا تعلق ہے تو لکھا ہے کہ عبدالملک عقل ودانش، تدبیر وسیاست، شجاعت وشہامت اور علم وفضل کے جملہ اوصاف میں کامل تھا۔ علم وفضل

Marfat.com

کے اعتبار سے اپنے عہد کے اکابر علماء میں سے تھا۔ اگر وہ حکومت کی آزمائشوں میں نہ پڑ گیا ہوتا تو مسند علم کی زینت ہوتا۔ اس کا شمار مدینہ کے ممتاز فقہاء میں سے تھا۔ (ابن اثیر جلد ۲ ص ۱۹۹) کتاب البدء والتاریخ میں ہے کہ سیدنا زید بن ثابت انصاریؓ کے بعد مدینہ الرسول کے منصب قضاء والفتا پر فائز ہوتا۔ اس عہد کے اکابر علماء اور ائمہ اس کے علمی کمالات کے معترف تھے۔ سیدنا عبداللہ بن عمرؓ کے آخری ایام میں لوگوں نے ان سے پوچھا کہ آپ کے بعد ہم کس شخص کی طرف رجوع کریں؟ فرمایا: "مروانؒ کا بیٹا عبدالملک فقیہ ہے، اس سے پوچھنا۔ (تاریخ الخلفاء سیوطی ص ۲۱۶) امام شعبیؒ فرماتے ہیں کہ میں جن علماء سے ملا، عبدالملک کے سوا اپنے کو سب پر فائق پایا۔ اس سے جب حدیث یا شاعری وغیرہ پر گفتگو ہوتی تھی تو وہ معلومات میں کچھ اضافہ ہی کر دیتا تھا۔ (طبقات ابن سعد جلد ۵ ص ۱۷۴)

ابن سعد ہی نے لکھا ہے کہ وہ بڑا متقی اور پرہیز گار تھا۔ دن رات عبادت وریاضت اور تلاوت قرآن حکیم سے کام رکھتا تھا۔ (طبقات ابن سعد جلد ۵ ص ۱۷۴) امام شعبیؒ جیسے عالم اس کے ہم نشین اور ہم جلیس تھے۔ امام زہریؒ اس کے عمل کے مطابق فتویٰ دیتے تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ ان سے کسی نے سونے کے تار سے دانت کسنے کے متعلق فتویٰ پوچھا۔ فرمایا: "کوئی مضائقہ نہیں کیونکہ عبدالملک ایسا کرتا تھا۔ (طبقات ابن سعد جلد ۵ ص ۱۷۴) اگر عبدالملک کی زندگی غیر مذہبی ہوتی تو امام زہریؒ اس کے فعل کو ہرگز سند جواز نہ بناتے۔

عبدالملک بن مروان کے بعد اس کا بڑا بیٹا ولید بن عبدالملک مسند خلافت پر بیٹھا اس کا دور فتوحات کی کثرت، دولت کی فراوانی، امن ورفاہیت کی ارزانی اور دوسری تمدنی اور ملکی ترقیوں کے لحاظ سے بنوامیہ کا عہد زریں تھا۔ اس کے زمانہ میں سندھ اور اسپین تک اسلام کا علم لہرانے لگا اس کے زمانہ میں جو جو ملک فتح ہوئے ان کی کایا پلٹ گئی اور وہ دفعتاً پستی کی حالت سے ابھر کر آسمان کی رفعتوں کو چھونے لگے۔ اس کی ذاتی زندگی بھی مذہبی تھی۔ تین دن میں قرآن ختم کرتا تھا۔ اگرچہ وہ خود عالم نہیں تھا لیکن علماء اور فقہاء سے اسے بہت محبت تھی۔ صلحاء واخیار میں خوب روپیہ تقسیم کرتا اور ان کو بڑے بڑے عطیات سے نوازتا۔ البتہ بڑا سخت گیر تھا۔

اس کے بعد اس کا بھائی سلیمان جس کو عبدالملک نے ولید کے بعد ولی عہد بنایا

Marfat.com

تھا، تخت نشین ہوا۔ وہ فطرتاً صالح اور سعید تھا۔ اس کے زمانہ میں بھی حکومت کے رقبہ کی وسعت اور تمدنی ترقی میں خاطر خواہ اضافہ ہوا۔ وہ خود بھی مصلحانہ خیالات کا حامل تھا۔ پھر عمر بن عبدالعزیزؒ جیسا نیک شخص اس کا وزیر و مشیر تھا۔ چنانچہ سلیمان نے ان خرابیوں کی کافی حد تک اصلاح کی جو اموی خلفاء کی وجہ سے ان کے بعض عمال میں پیدا ہو گئی تھیں۔ اس نے تمام ناحق قید کیے گئے لوگوں کو رہا کر دیا۔ جلا وطن اشخاص کو واپسی کی اجازت دی۔ اس نے رعایا کی مرفہ حالی کے لیے بہت سے کام کیے، اور اس کا سب سے بڑا کارنامہ جو سینکڑوں کارناموں اور اصلاحوں سے بڑھ کر ہے، وہ سیدنا عمر بن عبدالعزیزؒ کی ولی عہدی ہے۔ جنہوں نے اموی خلافت کی خرابیوں کو دور کرنے کی پوری پوری کوشش کی خصوصاً ایسی حالت میں جب کہ خود سلیمان کے بیٹے اور حقیقی بھائی موجود تھے۔ چنانچہ عمر بن عبدالعزیزؒ کے عہد خلافت میں جو بھی اصلاحات ہوئیں اس کی سعادت سلیمان کا بھی حصہ ہے۔

۶۴ ھ میں سیدنا مروان بن الحکم سریر آرائے خلافت ہوئے اور ۹۹ ھ میں سیدنا عمر بن عبدالعزیز مسند نشین خلافت ہوئے۔ اس ۳۵ سال کے عرصہ میں کتنی خرابیاں خلفاء اور عمال حکومت میں پیدا ہو چکی تھیں؟ خرابیاں اتنی تو نہیں تھیں جتنی ہمارے مورخین نے بیان کی ہیں۔ اسی وجہ سے کہا جاتا ہے کہ خلفائے بنوامیہ کے متعلق عام طور پر سے یہ غلط شہرت ہے کہ مذہب کی جانب ان کا رجحان کم تھا، اس کی کوئی حقیقت نہیں۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پھر مورخین نے ایسا کیوں لکھا ہے؟ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ تاریخ کی تدوین بنو عباس کے دور میں ہوئی جنہوں نے حکومت بنوامیہ سے چھینی تھی۔ اور یہ ایک قدرتی بات ہے کہ ایک گروہ جب کسی دوسرے گروہ سے حکومت چھینتا ہے تو وہ اپنا استحقاق ثابت کرنے کے لیے سابقہ حکومت میں ہر قسم کے کیڑے نکالتا ہے۔ اس کی خوبیوں کو برائیوں میں، مناقب کو مثالب میں اور فضائل کو رذائل میں ظاہر کرنے کے لیے اپنے پراپیگنڈے کی پوری مشینری کو کام پر لگائے رکھتا ہے تاکہ لوگوں کے قلوب کو ان سے ہٹا کر اپنی طرف مائل کر سکے اور ان کی ہمدردیوں کا کانٹا ادھر سے موڑ کر اپنی طرف کر سکے اور لوگوں کے ذہنوں میں یہ بات اُتار سکے کہ وہ لوگ واقعی اس قابل تھے کہ حکومت ان کے پاس نہ رہتی اور ان کے مقابلہ میں ہم بہت اچھے ہیں۔ چنانچہ بنو عباس نے حکومت پر قبضہ کرنے کے ساتھ ساتھ جہاں بنوامیہ کو قتل اور سولی چڑھا کر نیست و نابود کیا وہاں علمی انداز

Marfat.com

میں ان کے خلاف ایسا پراپیگنڈہ بھی کیا کہ آج تک عوام اور خواص کے قلوب میں بنوامیہ کے لیے ہمدردی اور رحم کا کوئی جذبہ اور گوشہ پیدا نہ ہو سکا بلکہ ان کے خلاف نفرت اور حقارت کے جذبات کو تقویت ملتی رہی۔ چنانچہ مصر کے ایک فاضل اور محقق علامہ محب الدین الخطیبؒ نے بھی ایسے ہی خیالات کا اظہار کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

''تاریخ اسلامی کی تدوین بنوامیہ کے زوال کے بعد شروع ہوئی اور ان حکومتوں کے قیام کے زمانہ میں ہوئی جن کا برسراقتدار طبقہ اپنے اس ماضی کے مفاخر اور اس وقت کے ارباب اقتدار کے محاسن سے خوش نہیں تھا۔ چنانچہ تاریخ اسلام کی تدوین تین قسم کے گروہوں نے کی۔ پہلا گروہ وہ تھا جس کی زندگی کا مقصد وحید بنوامیہ کے بغض اور مخالفت میں کتابیں تالیف کرنا اور ان کے کارناموں میں کیڑے نکال کر ان کے دشمنوں (بنوعباس) کی نگاہ میں تقرب حاصل کرنا تھا''۔

(العواصم بن القواصم ص ۱۷۷ تعلیقہ)

اسی طرح کے خیالات ندوہ کے فاضل شاہ معین الدین ندوی نے تحریر فرمائے ہیں کہ:

''بنوعباس کی حکومت قائم ہوئی۔ یہ سب بنوامیہ کے سخت دشمن تھے۔ اسی زمانہ میں تاریخ نویسی کا آغاز ہوا۔ اس لیے ایسی بہت سی غلط روایتیں جو عرصہ سے زبانوں پر چڑھی چلی آرہی تھیں، تاریخوں میں داخل ہو گئیں کیونکہ ایسے ابتدائی دور میں جب کہ تاریخ نویسی کا آغاز ہوا تھا روایات کی اتنی تحقیق وتنقید جس سے افسانہ وحقائق میں پورا امتیاز ہو سکے، مشکل تھی۔ گو بہت سی بے سر و پا روایتیں جن کا غلط ہونا بالکل عیاں تھا، تنقید سے مسترد ہو گئیں، لیکن پھر بھی بہت سے غلط واقعات تاریخ کا جزو بن گئے، حتی کہ مورخ ابن جریر اپنی محدثانہ تنقید کے باوجود اپنی کتاب کو غلط روایات سے محفوظ نہ رکھ سکا، اور آغاز تاریخ اسلام میں جو واقعات پولٹیکل مقاصد کے لیے تراشے گئے تھے، ان میں داخل ہو گئے''۔ (سیر الصحابہ جلد ۶ ص ۹۲)

تاریخ کی اکثر روایات محمد بن اسحاق، واقدی، ابومخنف لوط بن یحییٰ اور ہشام کلبی وغیرہ راویوں سے مروی ہیں جن کے کذب پر بڑے بڑے ائمہ حدیث کا اتفاق واجماع

Marfat.com

ہے۔ چنانچہ محمد ابن اسحاقؒ کے بارہ میں امام نسائی ، دار قطنی ، یحییٰ قطان ، امام مالک ، امام احمد بن حنبل ، سلیمان تیمی ، علی بن المدینی ، یحییٰ بن معین رحمہم اللہ اور دیگر ائمہ حدیث نے کذاب ، ضعیف اور لیس بحجۃ کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ (ملاحظہ ہو ضعفاء صغیر ص ۵۲ کتاب العلل جلد ۱ ص ۴۳۳ ، میزان الاعتدال جلد ۳ ص ۲۱ ، تہذیب التہذیب جلد ۹ ص ۴۴ ، ۴۵ ، نیل الاوطار جلد ۱ ص ۲۳۳ ، دلیل الطالب ص ۲۳۹ وغیرہ) بلکہ امام مالکؒ نے تو یہاں تک فرمایا ہے کہ " وہ دجالوں میں سے ایک دجال تھا "۔ (تہذیب التہذیب جلد ۹ ص ۴۶ ، میزان الاعتدال جلد ۳ ص ۲۱)

اسی طرح محمد بن عمر الواقدی کے بارے میں بھی ائمہ جرح وتعدیل نے کذاب اور متروک ہونے کا دعویٰ کیا ہے۔ چنانچہ امام احمد بن حنبلؒ فرماتے ہیں کہ وہ کذاب تھا ، حدیثوں کو الٹ پلٹ کر دیتا تھا۔ یحییٰ بن معین فرماتے ہیں کہ اس سے حدیث نہ لکھی جائے "۔

اور امام بخاریؒ فرماتے ہیں کہ وہ متروک الحدیث تھا۔ امام ابو حاتمؒ اور امام نسائیؒ فرماتے ہیں کہ وہ حدیث گھڑا کرتا تھا "۔ (میزان الاعتدال جلد ۳ ص ۱۱۰ ، تہذیب التہذیب جلد ۹ ص ۳۶۴) ایسا ہی لسان المیزان جلد ۶ ص ۸۵۲ اور المغنی للذہبیؒ میں ہے۔

لوط بن یحییٰ اور ہشام کلبی کے بارہ میں بھی کتابوں میں ایسا ہی لکھا ہے۔ (ملاحظہ ہو میزان الاعتدال جلد ۲ ص ۳۲۰ ، تذکرۃ الموضوعات ص ۲۸۶ ، کشف الاحوال فی نقد الرجال ص ۹۲ ، البدایہ والنہایہ جلد ۸ ص ۲۰۲ ، میزان الاعتدال جلد ۳ ص ۶۲ ، ص ۲۵۶ ، لسان المیزان جلد ۶ ص ۱۹۶ ، منہاج السنہ جلد ۱ ص ۱۴)

اس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ان راویوں کی مرویات کیسی ہوں گی۔ کذب اور دروغ گوئی کا مرقع ، صحابہ کرامؓ پر الزام تراشی اور افترا پردازی ، بنوامیہ کے مناقب کو مثالب میں تبدیل کرنا اور دین اسلام کے خلاف ایک سازش جس کی فصل آج تک کاٹی جا رہی ہے۔

کتب تواریخ کی روایات اکثر بے سند ہوتی ہیں۔ کسی کو " ذکروا " اور کسی کو " قیل " یا " یقال " یا " روی عن اصحابنا " یا پھر اسی طرح کے دوسرے مبہم اور غیر واضح الفاظ کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔ اب ایسی روایات کی حقیقت قرآن اور حدیث کی صحیح روایات کے مقابلہ میں کوئی حقیقت نہیں رکھتیں۔ چنانچہ شیخ العرب والعجم حضرت مولانا سید حسین احمد

صاحب مدنی قدس سرہ فرماتے ہیں:

"مورخین کی روایتیں تو عموماً بے سروپا ہوتی ہیں۔ نہ راویوں کا پتہ ہوتا ہے اور نہ ان کی تخریج وتوثیق کی خبر ہوتی ہے، نہ انفصال وانقطاع سے بحث ہوتی ہے۔ اگر بعض متقدمین نے سند کا التزام بھی کیا ہے تو عموماً اس میں ہر نمث وثمین سے ارسال وانقطاع سے کام لیا گیا ہے، خواہ وہ ابن اثیر ہوں یا ابن قتیبہ، ابن ابی الحدید ہوں یا ابن سعد"۔ (مکتوبات شیخ الاسلام جلد ا ص ۲۶۶)

پھر بنوامیہ کے بارہ میں تو خاص طور پر مورخین نے جھوٹ بولا ہے اور ایسی روایات اپنی کتابوں میں رواج کر دیں ہے جن میں ان کی مذمت اور برائی پائی جاتی ہے۔ اور یہ ساری روایات من گھڑت ہیں کوئی بھی ان میں سے صحیح نہیں۔ چنانچہ مشہور محدث وفقیہ ملا علی القاریؒ فرماتے ہیں:

ومن ذالک الاحادیث فی ذم معاویة وذم عمرو بن العاص وذم بنی امیة و مدح المنصور السفاح وکذا ذم یزید والولید ومروان بن الحکم.

"اور وہ احادیث روایات بھی موضوعات میں سے ہیں جن میں معاویہؓ، عمرو بن العاصؓ اور دیگر بنوامیہ کی مذمت اور منصور اور سفاح (عباسی خلفاء) کی تعریف پائی جاتی ہے اور اسی طرح یزید، مروان ابن الحکم اور ولید کی مذمت میں جو روایت ہیں وہ بھی موضوعات میں سے ہیں۔"

(الموضوعات الکبیر ص ۱۶۹۔۱۷۰، المنار المنیف فی الصحیح والضعیف لابن قیم ص ۱۱۷)

اس ساری بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ بنوامیہ کے بارہ میں اکثر روایات موضوع اور من گھڑت ہیں۔ حقیقت سے ان کا کوئی واسطہ نہیں اور یہ سب بنوامیہ کو بدنام کرنے کے لیے وضع کی گئی تھیں تا کہ عباسیوں کی خلافت صحیح ثابت ہو۔ لیکن اس کے باوجود اموی خلافت میں کچھ خرابیاں پیدا ہوگئی تھیں۔ اور وہ فطری خرابیاں تھیں کیونکہ عہد نبوت سے بعد کی وجہ سے یہ خرابیاں پیدا ہوئیں اور سیدنا عمر بن عبدالعزیزؒ نے ہر ممکن کوشش کی کہ ان کو دور کیا جائے اور وہ کافی حد تک اپنی کوشش میں کامیاب بھی ہوئے۔ اس سلسلہ میں آپ نے جو اصلاحات کیں وہ حسب ذیل ہیں

Marfat.com

ا۔غصب شدہ اموال کی واپسی

مسند خلافت پر بیٹھتے ہی آپ نے سب سے پہلا کام جو کیا وہ غصب شدہ اموال اور جائدادوں کی واپسی کا تھا۔ بعض اموی عمال نے غریبوں اور زیر دستوں کے جو اموال اور جائیدادیں غصب کر رکھی تھیں اور شاہی خاندان کے افراد، بعض اموی عمال اور عمائدین سلطنت نے غریبوں کی زمینوں کو اپنی جاگیر بنا لیا ہوا تھا۔ یہ کام دیکھنے میں تو نہایت آسان تھا لیکن دراصل یہ بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈالنا تھا۔ سارے خاندان، عمائدین سلطنت اور عمال بنوامیہ سے مخالفت مول لینا تھا، لیکن تاریخ کے اوراق سے پتہ چلتا ہے کہ آپ نے اس نازک کام کو جو ایک کار خیر تھا اور زیردستوں اور غریبوں کی دعائیں لینا تھا، آپ نے اپنی اصلاحات میں اس کو ایک نمبر پر رکھا۔ خود آپ کے پاس بڑی موروثی جاگیر تھی جس کے بارہ میں آپ سمجھتے تھے کہ اس کو اپنے پاس رکھنا میرے لیے جائز نہیں ہے۔ چنانچہ آپ نے جب اس کو واپس کرنے کا ارادہ کیا تو بعض خیر خواہوں اور دوستوں نے عرض کیا کہ اگر آپ جاگیر واپس کر دیں گے تو اپنی اولاد کے لیے کیا انتظام کریں گے۔ فرمایا! میں ان کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کرتا ہوں"۔ (سیرۃ عمر بن عبدالعزیز ص ۱۰۸)

روایات میں ہے کہ اس کے بعد آپ نے اپنے خاندان کے افراد کو جمع کیا اور فرمایا:

"بنی مروان! تم کو شرف اور دولت کا ایک حظ وافر عطا ہوا ہے اور میرے خیال میں امت کا نصف یا دو تہائی مال تمہارے قبضہ میں ہے"۔

یہ دراصل آپ نے ان لوگوں کو اشارتاً بتایا کہ تم غصب شدہ اموال اور جائدادیں واپس کر دو۔ وہ لوگ آپ کے اس اشارہ کو سمجھ گئے اور کہا: "خدا کی قسم! جب تک ہمارے سر ہمارے جسموں سے جدا نہ ہو جائیں اس وقت تک ہم یہ اموال اور جائدادیں واپس نہیں کریں گے۔ خدا کی قسم! ہم نہ اپنے آباء و اجداد کو کافر بنا سکتے ہیں اور نہ اپنی اولادوں کو مفلس"۔ (سیدنا عمر بن عبدالعزیزؒ اپنے اسلاف کے افعال کو ناجائز اور حرام کہتے تھے) ان کا یہ جواب سُن کر آپ نے فرمایا! "خدا کی قسم! اگر اس معاملہ میں تم میری مدد نہیں کرو گے تو میں تم لوگوں کو ذلیل و رسوا کر دوں گا۔ میرے پاس سے چلے جاؤ"۔

(سیرۃ عمر بن عبدالعزیز ص ۱۱۵)

Marfat.com

اس کے بعد آپ نے عام مسلمانوں کو مسجد میں جمع کیا اور فرمایا!

"ان لوگوں (خلفاء بنی امیہ) نے ہمیں ایسی جاگیریں اور عطایا دیئے جو بخدا! انہیں دینے کا کوئی حق نہیں تھا اور نہ ہمیں ان کے لینے کا۔ اب میں ان سب کو ان کے حقیقی اور اصلی حق داروں کو واپس کرتا ہوں۔ اور اس کام کو اپنی ذات اور اپنے خاندان سے شروع کرتا ہوں"۔

یہ کہہ کر اسناد شاہی کا رجسٹر منگوایا۔ مزاحم ان اسناد کو نکال کر پڑھ پڑھ کر سناتے جاتے اور سیدنا عمر بن عبدالعزیزؒ انہیں قینچی سے کاٹ کاٹ کر پھینکتے جاتے۔ صبح سے لے کا نماز ظہر تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ (سیرۃ عمر بن عبدالعزیز ص ۲۰۸) اور آپ نے اپنی اور اپنے خاندان کی ایک ایک جاگیر واپس کر دی حتی کہ اپنے پاس ایک نگینہ تک نہ رہنے دیا۔

(طبقات ابن سعد جلد ۵ ص ۲۵۲، البدایہ ولنہایہ جلد ۹ ص ۲۰۰)

آپ کی اہلیہ فاطمہ کو ان کے والد عبدالملک نے ایک بیش قیمت پتھر دیا تھا اس کے بارہ میں بھی آپ نے اپنی اہلیہ سے فرمایا کہ اس کو بیت المال میں داخل کر دو یا پھر مجھے چھوڑنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ آپ کی اہلیہ اگر چہ ایک خلیفہ کی بیٹی تھی لیکن بڑی وفاشعار تھی۔ اس نے وہ ہیرا فوراً بیت المال میں داخل کر دیا۔

(تاریخ الخلفاء سیوطی ص ۲۳۳، سیرۃ ابن عبدالحکم ص ۱۵۱)

روایات میں ہے کہ عمرؒ آندھی کی طرح چاروں طرف گھوم رہے تھے اور باطل کی جڑیں اکھاڑ رہے تھے اور غرور ونخوت کے آثار مٹا رہے تھے۔ آپ نے عزم کر لیا کہ ورثہ میں ملی ہوئی جائدادیں اور جمع شدہ ناجائز مال لوگوں میں بانٹ دیں گے اور ہبہ کیے ہوئے قطعات اراضی عوام کو دے دیں گے تا کہ عوام کے دلوں میں حق کا رعب بٹھا دیا جائے جسے پہلے حکمران برباد کر گئے تھے۔ اور اسلامی تہذیب وتمدن کو نکھارا جائے جسے حوادث نے لوگوں کے دل ودماغ سے مٹا دیا تھا۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ امت ایسی گندگیوں میں لتھڑی ہوئی ہے جن سے اس کو پاک کرنا مشکل ہے۔ سیدنا عمرؒ نے سب سے پہلے اپنے کپڑے اتار پھینکے اور خوشبو دھو ڈالی اور آٹھ درہم قیمت کی چادر اوڑھ لی۔ پھر حکم فرمایا کہ میرے پاس جو برتنے کی اشیاء ہیں ان سب کو اور سواریوں اور کپڑوں کو اور عطر وغیرہ کو فروخت کر دیا جائے۔ چنانچہ یہ سب اشیاء ۲۳ یا ۲۴ ہزار اشرفیوں میں فروخت ہوئیں اور وہ سارا روپیہ

Marfat.com

بیت المال میں جمع کرادیا گیا۔ گویا اصلاح کا عمل اپنے گھر سے شروع کیا۔

پھر خلافت کی سرکاری سواریوں کو لایا گیا۔ گھوڑے زین کسے ہوئے قطار در قطار کھڑے تھے۔ اور ان پر سوار تلواریں سونتے ہوئے تھے۔ قناتیں تنی ہوئی اور خیمے گرے ہوئے تھے ان سب کے آگے محافظ دستہ کا افسر چل رہا تھا۔ سیدنا عمرؒ نے اس سے کہا: مجھے تمہاری کوئی ضرورت نہیں، میں نے تم سب کو سبکدوش کر دیا۔ (صفۃ الصفوۃ جلد۲ ص ۶۴، حیاۃ الحیوان جلد ا ص ۶۸) پھر آپ اپنے خچر کی تلاش میں قطاروں میں گھس گئے اور اسے پکڑ کر اس پر سوار ہو گئے بہت سے پہرے داروں اور سپاہیوں کو فارغ کر دیا جن کی تعداد چھ سو سے زیادہ تھی۔ (سیرۃ ابن جوزی ص ۹۸)

پھر ان قناتوں اور فرشوں کو ٹھوکر مار کر اپنے راستہ سے ہٹا دیا۔ پھر اپنے غلام مزاحم کو بلا کر فرمایا: یہ خچر، گھوڑے اور قناتیں وغیرہ اور دیگر آرائشی سامان بیت المال میں جمع کر آؤ۔ (سیرۃ ابن عبدالحکم ص ۱۶۸)

اب حالت یہ تھی کہ خود سیدنا عمرؒ کے گھر میں غربت ناچنے لگی۔ ان کی اہلیہ فاطمہ بنت عبدالملک نے درخواست کی کہ اس کا اور اس کے بچوں کا ماہانہ مقرر کر دیا جائے۔ فرمایا: بیت المال میں گنجائش نہیں وہ بولی: آپ قبل از خلافت دوسروں سے کیوں لیا کرتے تھے۔ فرمایا: جب تو وہ مال میرے لیے حلال اور طیب تھا اس کا وبال اور گناہ انہیں پر تھا جنہوں نے اس کو ناجائز طریقے سے حاصل کیا لیکن خلیفہ بنائے جانے کے بعد میں ایسا نہیں کر سکتا۔ اس طرح عمرؒ اپنی اہلیہ کو برابر سمجھاتے رہے یہاں تک کہ وہ بھی اسی تقویٰ اور پرہیز گاری کے سانچے میں ڈھل گئی۔

بعض روایات میں ہے کہ عمرؒ خلیفہ ہونے کے بعد تین دن لوگوں سے غائب رہے۔ اس عرصہ میں عمر اپنے غلام مزاحم کے ساتھ دستاویزات جمع کرنے میں مصروف تھے۔ اپنی ذاتی جاگیروں اور جائدادوں کی بھی اور امراء کی جائدادوں اور عطیات کے اقرارنامے بھی۔ جب آپ نے تمام دستاویزات اور اقرار نامے جمع کر لیے تو منادی کر کے لوگوں کو اکٹھا کیا۔ جب لوگ جمع ہو گئے تو عمرؒ منبر پر چڑھ گئے۔ مزاحم آپ کے پیچھے تھے۔ آج عمرؒ نے زندگی میں پہلی بار معمولی کپڑے پہنے ہوئے تھے جن کی قیمت صرف ۱۲ درہم تھی۔ (وفیات الاعیان جلد۲ ص ۶۱، صفۃ الصفوۃ جلد۲ ص ۶۷) آپ نے بنوامیہ اور بنومروان

Marfat.com

کے ممتاز حضرات اور فوج کے رؤساء سے فرمایا:

"لوگوں نے ہمیں عطیات دیے جن کو قبول کرنا ہمارے لیے جائز نہ تھا اور نہ انہیں ان کا دینا جائز تھا۔ میرے خیال میں ان عطیات میں ہم سے اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی حساب لینے والا نہیں۔ میں نے یہ کام اپنی اور اپنے گھر والوں کی ذاتی جائیداد سے شروع کیا ہے۔ مزاحم انہیں پڑھ کر سناؤ۔ مزاحم نے وہ سب کچھ پڑھ کر سنایا۔ پھر عمرؒ نے ان تمام کاغذات کو لیا اور قینچی لے کر اسے کتر کر پھینک دیا۔ آپ ظہر کی اذان تک یہی کام کرتے رہے۔

(سیرۃ ابن جوزی ص ۱۰۶)

کچھ جائدادیں بغیر تحریر کے تھیں یعنی غصب شدہ تھیں ان کے بارہ میں اعلان کرا دیا کہ کوئی شخص غصب شدہ زمین سے فائدہ نہ اٹھائے۔ پھر آپ نے ظلم سے حاصل کیے ہوئے کھیت اور جاگیریں جس پر کسی کا مطالبہ تھا حق داروں کو دلوا دیں اور خود آپ کے قبضہ میں جس قدر کھیت، غلام اور لونڈیاں تھیں وہ سب آپ نے بیت المال میں دے دیں۔

آل بلال میں رباح نے عمرؒ کے خلاف ایک مقدمہ دائر کیا کہ انہوں نے آپ کو ایک کھیت فروخت کیا تھا۔ پھر اس میں کانیں نکل آئیں۔ مقدمہ میں کہا گیا کہ ہم نے آپ کو کھیت فروخت کیا تھا کانیں نہیں کی تھیں۔ اور انہوں نے آپ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک تحریر دکھائی۔ عمرؒ نے لپک کر وہ تحریر چوم لی اور اسے اپنی آنکھوں سے لگایا اور اپنے منتظم سے فرمایا: اس کی آمدنی اور خرچ کا اندازہ لگاؤ۔ پھر آپ نے خرچ وضع کر کے باقی رقم انہیں دے دی۔ (فتوح البلدان ص ۲۲)

عمرؒ نے اپنی وہ زمین جو یمامہ میں تھی وہ بھی بیت المال میں لوٹا دی اور یمن میں مکیدس اور درّس والے پہاڑ بھی بیت المال کو لوٹا دیئے اور جس اراضی کے آپ کے پاس کاغذات نہ تھے اس کا منافع بیت المال کو دے دیا اور یہ فیصلہ کیا کہ وہ کبھی بیت المال سے ایک حبہ بھی نہ لیں گے کیونکہ ان کے ذاتی اخراجات کے لیے کچھ زمین ہے۔ کہ آمدنی دو سو دینار کے قریب ہو جاتی ہے۔ جب آپ سے یہ کہا گیا کہ آپ بھی فاروق اعظمؓ کی طرح بیت المال سے وظیفہ لے لیا کریں۔ تو فرمایا: میرے پاس مال ہے جو مجھے کافی ہے اور فاروق اعظمؓ کے پاس مال نہ تھا۔

(العقد الفرید جلد ۴ ص ۴۳۴، تذکرۃ الحفاظ جلد ۱ ص ۱۱۳)

Marfat.com

فدک کا فیصلہ

اس سلسلہ میں سب سے اہم مسئلہ فدک کا تھا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے انتقال کے بعد ہی سے خلفاء اور اہل بیت کے درمیان متنازعہ فیہ چلا آ رہا تھا۔ اب یہ سیدنا عمر بن عبدالعزیزؒ کے قبضہ میں تھا۔ اس بارہ میں انہوں نے وہی فیصلہ کیا جو سیدنا صدیق اکبرؓ نے اپنے عہد خلافت میں کیا تھا۔

فدک ہے کیا؟

سب سے پہلے یہ معلوم ہونا چاہیے کہ فدک ہے کیا؟ کتابوں میں اس بارہ میں لکھا ہے کہ فدک مدینہ طیبہ سے دو یا تین دن کے مسافت پر واقع ایک باغ تھا جس میں چشمے اور کھجور کے درخت تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لڑائی کے بغیر اس کو فتح کیا تھا۔ (تفصیل کے لیے ملا خطہ ہو فتح الباری جلد ۲ ص ۱۴۰، مراصد الا طلاع علی اسماء الا مکنہ والبقاع جلد ۶ ص ۳۳۷، مجالس المومنین جلد ۱ ص ۴۸ اور معجم البلدان وغیرہ)

لیکن ملا باقر مجلسی نے اس باغ کی جو حقیقت اور حدود اربعہ بیان کیا ہے، انسانی عقل اس کو سُن کر دنگ رہ جاتی ہے۔ کیونکہ انہوں نے اس کا جو حدود اربعہ بیان کیا ہے۔ اس میں قریباً نصف کرۂ ارض آ جاتا ہے۔ چنانچہ ملا باقر نے مناقب ابن شہر آشوب سے بڑی ثقاہت کے ساتھ نقل کیا ہے کہ ایک مرتبہ ہارون الرشید نے سیدنا موسیٰ کاظمؒ سے کہا کہ میں آپ سے استدعا کرتا ہوں کہ آپ وہ "فدک" لے لیجئے (جس کے بارہ میں آپ اور آپ کے آباء و اجداد یہ سمجھتے آئے ہیں کہ وہ ہم سے غصب کر لیا گیا ہے) آپ نے ہارون الرشید کی اس استدعا کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔ ہارون الرشید نے کئی مرتبہ سیدنا موسیٰ کاظمؒ سے اس بارہ میں کہا لیکن آپ نے مثبت اور منفی میں اس کا کوئی جواب نہ دیا۔ آخر جب ہارون الرشید نے اصرار کیا۔ تو آپ نے فرمایا کہ میں اسے ہرگز لینے کے لیے تیار نہیں ہوں جب تک کہ وہ مجھے صحیح حدود کے ساتھ نہ دیا جائے۔ ہارون الرشید نے کہا آپ مجھے اس کا حدود اربعہ بتایئے؟ سیدنا موسیٰ کاظمؒ نے فرمایا کہ اگر میں نے اس کے حدود بتلائے تو پھر آپ مجھے وہ ہرگز دینے کے لیے تیار نہیں ہوں گے۔ ہارون الرشید نے حلفاً کہا کہ میں آپ کو وہ ضرور دوں گا۔ خلیفہ کے اس اقرار پر سیدنا موسیٰ کاظمؒ نے اس کے حدود بیان کیے

کہ اس کی ایک حد عدن ہے۔ یہ سُن کر ہارون الرشید کا چہرہ متغیر ہو گیا۔ پھر دوسری حد سمرقند بتلائی۔ یہ سُن کر ہارون الرشید کا چہرہ ٹمٹمانے لگا۔ پھر سیدنا موسیٰ کاظمؒ نے کہا کہ اس کی تیسری حد افریقہ ہے۔ موسیٰ کاظمؒ کے منہ سے یہ الفاظ سُن کر ہارون کا چہرہ سیاہ ہو گیا۔ پھر موسیٰ کاظمؒ نے کہا کہ اس کی چوتھی حد سمندر کا وہ کنارہ ہے جو آرمینیہ سے ملا ہوا ہے۔ تب ہارون الرشید نے کہا "حضرت! آپ نے ہمارے لیے تو کچھ بھی نہیں چھوڑا۔ سیدنا موسیٰ کاظمؒ نے فرمایا کہ میں تم سے یہ نہیں کہتا تھا کہ "اگر میں تمہیں اس کے حدود بتاؤں گا تو تم وہ مجھے ہرگز نہیں دو گے"۔ اس پر ہارون الرشید نے سیدنا موسیٰ کاظمؒ کے قتل کا ارادہ کر لیا۔

ملا باقر مجلسی نے لکھا ہے کہ ابن ساباط نے لکھا ہے: فدک کی پہلی حد عریش مصر، دوسری دومۃ الجندل، تیسری اور چوتھی حد سمندر ہے۔

(بحارالانوار جلد ۲ ص ۱۰۱، اصول کافی جلد ۱ ص ۵۴۳، تہران)

یہ روایت نہایت مضحکہ خیز ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں اتنا علاقہ فتح ہی نہیں ہوا تھا کہ اس کو مال فئے شمار کر کے سیدہ فاطمہؓ کو دے دیا جاتا۔ یہ سارا علاقہ تو سیدنا ابوبکر صدیقؓ اور سیدنا فاروق اعظمؓ کے زمانوں میں فتح ہوا تھا۔ اس سارے علاقے کا مطالبہ کرنا دوسروں معنوں میں یہی تھا کہ سیدنا موسیٰ کاظمؒ ہارون الرشید سے اس کی ساری سلطنت کا مطالبہ کر رہے تھے۔

یہ باغ فدک اصل میں مال فئے میں سے تھا اور مال فئے کیا ہوتا ہے؟ اس بارہ میں صاحب لسان العرب نے لکھا ہے:

"فئے اس غنیمت اور خراج کو کہتے ہیں جو مسلمانوں کو کفار سے جنگ اور جہاد کے بغیر حاصل ہو۔ فئے کے حقیقی معنی رجوع کے ہیں۔ گویا دراصل یہ مال مسلمانوں ہی کا تھا اور انہیں کی طرف لوٹ آیا۔ اسی وجہ سے فئے اس سایہ کو بھی کہتے ہیں جو زوال کے بعد ہوتا ہے کیونکہ وہ بھی مغرب کی طرف سے مشرق کی طرف لوٹتا ہے"۔ (لسان العرب زیر لفظ فئے)

فئے کے یہی معنی فقہائے اسلام نے ذکر کیے ہیں۔ چنانچہ ابوعبیدؒ نے کتاب الاموال ص ۵۹، یحییٰ بن آدمؒ نے کتاب الخراج ص ۲۷۔ ۲۸ اور امام یوسفؒ نے کتاب الخراج ص ۱۸ پر اس کو ذکر کیا ہے۔ امام ابوعبیدؒ نے ایک مقام پر لکھا ہے:

Marfat.com

مانيل من اهل الشرك عنوة فسرأ وا لحرب قائمة فهو غنيمة ومانيل منهم بعد ماتضع الحرب اوزارها تصير الدار دار الا سلام فهو فئے يكون للناس عاماً ولا خمس فيه

(کتاب الاموال ص ۲۵۴)

"جو مال مشرکین اور کفار سے بزور شمشیر حاصل ہو جب کہ ابھی جنگ ہو رہی ہو تو وہ مال "مال غنیمت" ہے اور جب جنگ کے ختم ہونے اور اس ملک کے دارالاسلام بننے کے بعد حاصل ہو تو وہ مال فئے ہے جو اس ملک کے عوام کے لیے ہوتا ہے اور اس میں خمس نہیں ہوتا۔"

قرآن حکیم میں بھی مال فئے کا ذکر آیا ہے اور یہ بھی ذکر کیا گیا ہے کہ اس مال کا مصرف کیا ہے۔ چنانچہ سورۂ حشر کی آیات نمبر ۶۔۷ میں ہے۔

"اور جو مال کہ لوٹا دیا اللہ نے اپنے رسول پر ان سے سو تم نے ان پر گھوڑے اور اونٹ نہیں دوڑائے لیکن اللہ غلبہ دیتا ہے اپنے رسولوں کو جس پر چاہیے، اور اللہ ہر شے پر قادر ہے اور جو مال لوٹا دیا اللہ نے اپنے رسول پر بستیوں والوں سے سو وہ اللہ کے لیے اور رسول کے لیے اور قرابت والوں کے لیے اور یتیموں کے لیے اور محتاجوں کے لیے اور مسافروں کے لیے ہے"۔ (حشر ۶۔۷)

اس آیت کی تفسیر میں امام فخر الدین رازی قدس سرہ نے اپنی تفسیر کبیر میں بہت کچھ لکھا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ صحابہ کرامؓ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے استدعا کی کہ آپ نے جس طرح مال غنیمت ہم لوگوں میں تقسیم کر دیا اسی طرح فئے بھی ہم میں تقسیم فرما دیجئے۔ اس درخواست کے جواب میں اللہ جل شانہ نے مال غنیمت اور مال فئے میں فرق بیان فرما دیا کہ مال غنیمت تو وہ ہے جس کے حصول کے لیے تم لوگوں نے محنت اور جدوجہد کی اور گھوڑوں اور اونٹوں سے حملہ کر کے اس کو حاصل کیا، اور فئے کا مال اس کے برعکس ہے اس کے حصول میں تمہیں کوئی جدوجہد نہیں کرنا پڑی اور نہ تمہیں اونٹوں اور گھوڑوں سے چڑھائی کرنا پڑی، لہذا یہ مال جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سپردگی اور تولیت میں رہے گا یعنی آپ اس مال کے کسٹوڈین ہیں۔ آپ جہاں چاہیں اسے خرچ

Marfat.com

کریں"۔ (تفسیر کبیر جلد ۸ ص)

اس آیت کریمہ میں "للہ وللرسول" کے جو الفاظ آئے ہیں ان سے مراد یہ نہیں ہے کہ نصف مال اللہ کا ہے اور نصف جناب رسول اللہ صلی علیہ وسلم کا ہے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ مال تو اللہ تعالیٰ کا ہے اور رسول اس کا امین اور تقسیم کرنے والا ہے اور یہ رسول کی ذاتی ملکیت نہیں ہے بلکہ اس کی ملکیت صرف اللہ تعالیٰ کی ہے۔ آگے اس کا مصرف بیان فرمایا کہ وہ مال ذوی القربیٰ، یتامیٰ، مساکین اور مسافروں کی ضروریات پورا کرنے کے لیے ہے۔ گویا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا تصرف اس مال میں متولیانہ ہے مالکانہ نہیں۔

یہاں ایک بات خاص طور پر ذہن میں رکھنے کے قابل ہے کہ اس آیت میں "رسول" کا لفظ استعمال فرمایا "محمد بن عبداللہ" کا لفظ استعمال نہیں فرمایا، اس لیے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دو حیثیتیں تھیں۔ ایک "رسول اللہ" کی حیثیت اور دوسری "محمد بن عبداللہ" کی حیثیت۔ اعلان نبوت تک آپ محمد بن عبداللہ تھے لیکن جب آپ نے اعلان نبوت فرمایا تو آپ کی پہلی حیثیت دوسری حیثیت کے ماتحت ہوگئی۔ اس وجہ سے اب بارگاہ ایزدی میں وہی نسبت قبول ہوگی جو محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) سے ہوگی اور جو نسبتیں رسول اللہ سے ہٹ کو ابولہب کی طرح صرف محمد بن عبداللہ سے ہوں گی، وہ مفید بارگاہ ایزدی نہ ہوں گی۔ اس لیے یہاں لفظ رسول استعمال فرما کر یہ بتادیا کہ مال "محمد بن عبداللہ" کی ملکیت نہیں بلکہ "رسول اللہ" کی ملکیت ہے اور ملکیت بھی نہیں بلکہ متولیانہ تصرف کا حق اللہ تعالیٰ نے آپ کو عطا فرمایا اور آپ اس کو اللہ کے حکم سے استعمال فرماتے ہیں:

وما اعطیکم شیئاً ولا منعکم انما انا خازن اضع
حیث امرت

"میں نہ تو تمہیں کچھ دیتا ہوں اور نہ روکتا ہوں بلکہ میری حیثیت تو صرف ایک خازن کی ہے جہاں حق تعالیٰ حکم دیتے ہیں وہاں خرچ کرتا ہوں۔"

جب مال فئے کا یہ حکم ہے اور فدک بھی چونکہ مال فئے میں سے تھا اس وجہ سے وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتی ملکیت نہ تھا کہ اس میں آپ کی نسبی اور دیگر رشتہ داروں میں وراثت جاری ہوتی کیونکہ وراثت جاری ہونے کے لیے ملک شرط ہے، لیکن

Marfat.com

آپ اس کے صرف کسٹوڈین اور متولی تھے، اور آپ حق تعالیٰ شانہ کے حکم سے اسے وہیں صرف کرتے جہاں صرف کرنے کے لیے حق تعالیٰ شانہ حکم فرماتے۔ آپ کے انتقال کے بعد جو شخص آپ کا جانشین بنتا، شرعی طور پر اس کے ذمہ لازم تھا کہ وہ اموال فئے کو وہیں صرف کرے جہاں اللہ کا رسول صرف کیا کرتا تھا۔ چنانچہ سیدنا جعفر صادقؒ سے اس سلسلہ میں ایک روایت منقول ہے کہ:

"انفال میں ہر وہ مال داخل ہے جو بغیر لڑائی کے دارالحرب سے حاصل ہو اور ہر وہ زمین جس کے رہنے والے جلا وطن کر دیے گئے ہوں اور بغیر جنگ اور قتال کے ہاتھ آئی ہو، اور زمین اور جنگل اور بادشاہوں کی جاگیریں اور لاوارث کا مال یہ سب فئے میں داخل ہیں اور خدا اور اس کے رسولؐ کے ہیں، اور رسولؐ کے انتقال کے بعد جو اس کا قائم مقام ہو"۔ (تفسیر صافی جلد ۶ ص ۳۷۷)

اسی طرح کے اور بہت سے اقوال تفاسیر کی کتابوں میں منقول ہیں۔ چنانچہ تفسیر منہج الصادقین میں ہے:

"تیسرا مال فئے ہے، اور وہ وہ مال ہے جو کافروں سے مسلمانوں کو بغیر جنگ وقتال کیے اور بغیر اونٹ اور گھوڑے دوڑائے حاصل ہو، اور وہ مال صرف رسول کا ہوتا ہے اس کی حیات دنیوی میں، اور اس کے بعد ائمہ دین میں جو اس کا قائم مقام ہو، اس کو اس کے متصرفانہ حقوق حاصل ہوتے ہیں۔ اور جس کو وہ چاہے دے اور جس جگہ بہتر سمجھے اسے صرف کرے، اور یہ قول امیرالمومنین علی بن ابی طالب صلواۃ اللہ وسلامہ علیہ کا ہے"۔ (منہج الصادقین جلد ۹ ص ۶۸۳)

یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم میں جہاں مال فئے کا مصرف بیان کیا وہاں کسی نسبی تعلق کا ذکر نہیں کیا بلکہ ذوی القربیٰ، یتامیٰ، مساکین اور مسافروں کا ذکر کیا تاکہ واضح ہو جائے کہ یہ محمد بن عبداللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ملکیت نہیں کہ اس میں وراثت جاری ہو بلکہ اس کے خرچ کی تمام مدات حق تعالیٰ شانہ نے خود بیان فرما دی ہیں۔

حکیم الامت حضرہ شاہ ولی اللہؒ اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

"اللہ تعالیٰ نص قرآن میں اس مال کو جو بطور فئے کے حاصل ہو یعنی اونٹ گھوڑے دوڑائے بغیر اور بغیر جنگ وقتال کے حاصل ہو، ان مصارف کے لیے

Marfat.com

متعین فرماتا ہے جو اس آیت میں مذکور ہیں۔ اور وہ مصارف یہ ہیں، خدا اور اس کا رسولؐ، رسولؐ کے قرابت دار، یتامیٰ، مساکین اور مسافر۔ اس کے بعد فرمایا: "للفقراء" یعنی وہ مال فقراء مہاجرین و انصار اور جوان کی اتباع کرتے ہیں احسان کے ساتھ، اور گذشتہ لوگوں کے لیے خلوص، خیر خواہی اور دعائے خیر کرتے ہیں۔ جب مال فئے ایک محدود جماعت کے لیے قرار پایا تو معلوم ہوا کہ یہ مال کسی کی مِلک نہیں ہوتا بلکہ اس کو مسلمانوں کے بیت المال میں رکھنا چاہیے اور اس میں ہر مسلمان کو اس کی ضرورت کے مطابق دینا چاہیے۔ اور یہ بات سب کے نزدیک مسلم ہے کہ خلیفہ رسول کا بڑا کام یہ ہے کہ مسلمانوں کے بیت المال میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے مطابق آپ کا نائب ہونے کی حیثیت سے تصرف کرے، لہذا ثابت ہوا کہ خلیفہ مال فئے تصرف کرے گا، اور یہ بھی ثابت ہوگیا کہ مال فئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مِلک نہ تھا کہ اس میں وارثت کی بحث پیدا ہوتی۔ اور جب مِلک نہ تھا تو آپ اپنے قرابت داروں میں کسی کو ہبہ بھی نہ کر سکتے تھے۔ (وآں لیے مِلک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نبود تا مبحث میراث درآں جاری باشد و نیز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم شخصے خاص را از اقارب خود ہبہ او نتواند کرد)

(ازالۃ الخفا عن خلافۃ الخلفاء مقصد اول فصل ششم)

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر پیغمبر کی کوئی ذاتی ملکیت ہو بھی تو کیا اس میں وارثت جاری ہو سکتی ہے؟ شریعت اسلامیہ کی روشنی میں اس کا سیدھا اور صاف جواب یہ ہے کہ نہیں ہو سکتی۔ اس سلسلہ میں ہم نے اپنی کتاب "سیدنا علی بن ابی طالبؓ شخصیت و کردار" میں دلائل پیش کیے ہیں وہاں ملاحظہ فرمالیں۔ اس سلسلہ میں ایک مشہور حدیث ہے جس کو امام بخاریؒ اور دیگر محدثین نے اپنی کتابوں میں نقل کیا ہے۔

لانورث ماترکنا صدقته (بخاری جلد ا ص ۵۲۶، طحاوی جلد ا ص ۲۹۸)

"ہم انبیاء کا کوئی وارث نہیں ہوتا۔ ہم جو کچھ چھوڑ جاتے ہیں وہ صدقہ (یعنی عام مسلمانوں کا حق) ہوتا ہے۔"

اس ساری بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ فدک جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی

Marfat.com

ملکیت نہ تھا بلکہ آپ کی تولیت میں تھا۔ نہ اس میں میراث جاری ہو سکتی تھی کیونکہ میراث کے لیے ذاتی ملکیت ہونا ضروری ہے اور نہ ہی اس کا ہبہ ہو سکتا تھا کیونکہ ہبہ بھی اپنی ملکیت میں ہو سکتا ہے۔ پھر ہبہ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زندگی میں کیا تھا تو سیدہ فاطمہؓ نے دوبارہ سیدنا ابوبکر صدیقؓ سے فدک کا کیوں مطالبہ کیا تھا؟ کیونکہ ہبہ نامہ تو پہلے ہی آپ کے پاس موجود تھا اور ہبہ میں قبضہ بھی شرط ہے۔ معلوم ہوا کہ فدک پر پہلے ہی سیدہ فاطمہ سلام اللہ علیہا کا قبضہ تھا۔ پھر صدیق اکبرؓ سے مطالبہ فدک کی کیا ضرورت تھی؟ اگر فدک ہبہ یا میراث میں سیدہ فاطمہؓ کو ملتا تھا اور خلفائے راشدینؓ نے وہ روک لیا تو سیدنا علیؓ نے اپنے عہد خلافت میں کیوں نہ سیدہ فاطمہؓ کی اولاد کو وہ دے دیا؟

حقیقت یہ ہے کہ روایات کی رو سے سیدہ فاطمہؓ نے سیدنا صدیق اکبرؓ سے امہات المومنینؓ کی طرح میراث نبوی کا مطالبہ کیا تھا لیکن صدیق اکبرؓ نے جواب میں فرمایا کہ میں نے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ سُنا ہے کہ "ہم گروہ انبیاء نہ کسی کے مال کے وارث ہوتے ہیں اور نہ ہمارا کوئی وارث ہوتا ہے۔ ہم جو کچھ چھوڑ جائیں وہ صدقہ ہوتا ہے"۔ نیز فرمایا کہ "میں اس کی آمدنی اسی طرح خرچ کروں گا جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خرچ کیا کرتے تھے اور آل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس مال سے اسی طرح کھائے گی جس طرح جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں کھاتی تھی اور بخدا! جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قراب داروں کے ساتھ سلوک اور احسان مجھے اپنے قرابت داروں کے ساتھ سلوک اور احسان سے کہیں زیادہ محبوب ہے"۔

(بخاری جلد ا ص ۵۲۶، شرح معانی الآثار جلد ا ص ۲۹۸، ابن میثم جلد ۵ ص ۱۰۷)

یہ ایک نہایت معقول جواب تھا۔ سیدہ خاموش ہو گئیں اور پھر اس کے بعد انہوں نے میراث رسول کا کبھی مطالبہ نہ کیا بلکہ اپنے پہلے مطالبہ پر افسوس کرنے لگیں، کیونکہ آپ نے فرمایا تھا!

ا۔ آل محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اس مال میں سے حسب سابق اخراجات زندگی لیتی رہے گی۔ (انما یاکل آل محمد من ھذا المال)

ب۔ میں اس مال کے خرچ کرنے میں وہی کچھ کروں گا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کرتے تھے۔ (لاعملن فیھا بما عمل فیھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم)

Marfat.com

ج۔ سیدہ فاطمہؓ کو مزید یقین دلانے کے لیے سیدنا ابوبکرؓ نے حلفاً فرمایا: اے فاطمہؓ! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قرابت اور رشتہ داری مجھے اپنی قرابت اور رشتہ داری سے زیادہ عزیز ہے۔ (واللہ لقرابتہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم احب الی من قرابتی)

یہ تین باتیں جو سیدنا ابوبکرؓ نے بنت رسولؐ کو کہیں اس سے سیدہ ناراض نہیں ہوئیں بلکہ نادم ہوئیں کہ میں نے وارثت کے عمومی مسئلہ کے تحت اپنے ابا کی وارثت کے بارہ میں پوچھا اور سیدنا ابوبکرؓ کے جواب سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وراثت کے اس عمومی مسئلہ سے خارج ہیں اور یہی جواب سیدنا ابوبکرؓ نے اپنی بیٹی سیدہ عائشہ صدیقہؓ اور دیگر امہات المومنینؓ کو بھی دیا تھا جب انہوں نے اپنے حصہ وارثت کا مطالبہ کیا۔ اس وجہ سے سیدہ فاطمہؓ اپنے مطالبہ سے نادم ہوئیں کہ مجھے سیدنا ابوبکرؓ سے ایسا مطالبہ نہیں کرنا چاہیے تھا کیونکہ وہ تو آل محمدؐ کے لیے اسی طرح شفیق وکریم ہیں جس طرح خود جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مہربان اور کریم تھے اور انہوں نے مجھے یقین دلایا ہے کہ اس کی آمدنی کو انہی مدات میں خرچ کریں گے جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خرچ کیا کرتے تھے۔ چنانچہ حافظ ابن کثیرؒ نے لکھا ہے:

"جو کچھ ہم نے روایت کیا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ سیدہ فاطمہؓ نے پہلے قیاس اور آیت کریمہ کے عموم سے احتجاج اور استدلال کیا۔ پس صدیق اکبرؓ نے اس کا جواب نص سے دیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس عموم سے خارج ہیں اور ان کے لیے ایک مخصوص حکم ہے۔ سیدہ فاطمہؓ نے اس جواب کو تسلیم کر لیا اور ان کے بارہ میں یہی ہمارا حسن ظن ہے"۔ (البدایہ والنہایہ جلد ۵ ص ۲۸۹)

روایات میں یہ بھی مرقوم ہے کہ اموال فئے جن میں باغ فدک بھی شامل تھا، ان کا انتظام سیدنا علی بن ابی طالبؓ کے ہاتھ میں دے دیا گیا۔ ان کے بعد سیدنا حسنؓ، ان کے بعد سیدنا حسینؓ، پھر سیدنا علی بن حسینؓ اور حسن بن حسنؓ، پھر زید بن حسنؓ کے ہاتھوں میں اس کا انتظام رہا۔ (ملاحظہ ہو بخاری جلد ۲ ص ۵۷۶، السنن الکبریٰ بیہقی جلد ۶ ص ۲۹۹ ابن ابی الحدید جلد ۴ ص ۱۱۸ وغیرہ)

چنانچہ اس حسن سلوک کی وجہ سے سیدہ فاطمہؓ بھی خوش رہیں اور ان کی اولاد بھی بعد بھی خوش وخرم رہی۔ یہی وجہ تھی کہ جب ایک مرتبہ کسی پوچھنے والے نے سیدنا محمد باقرؒ

Marfat.com

بن علی بن الحسینؓ سے پوچھا:

أرأیت ابابکر وعمر هل ظلماکم من حقکم شئیاً

''کیا تم سمجھتے ہو کہ ابوبکرؓ اور عمرؓ نے تمہارے حق میں کسی بارہ میں کسی قسم کی کوئی زیادتی یا ظلم کیا؟''

آپ نے جواب میں فرمایا:

''بالکل نہیں، قسم ہے اس ذات کی جس نے اپنے بندے پر قرآن حکیم کو نازل فرمایا، ہمارے حق میں ان دونوں نے رائی کے دانے کے برابر بھی ظلم نہیں کیا''۔

پوچھنے والے نے پھر پوچھا کہ کیا میں ان سے دوستی اور محبت رکھوں؟ آپ نے جواب میں فرمایا: ہاں۔ پھر فرمایا: ''تو ان دونوں کے ساتھ دنیا وآخرت دونوں میں محبت رکھ اور اگر کوئی وبال پیش آئے تو میری گردن پر ہوگا''۔

(ابن ابی الحدید جلد۴ ص۱۱۳، وفاء الوفاء ص۱۱۰، فضائل ابی بکر عشاری ص۵)

بعض روایات میں آتا ہے کہ سیدنا علی بن ابی طالبؓ کے عہد خلافت میں بعض حضرات نے باغ فدک اولاد فاطمہ کو واپس کرنے کے لیے کہا تو سیدنا علیؓ نے نہایت عمدہ اور خوب صورت جواب دیا!

انی لاستحیی من الله ان ارد شئیاً منع منه ابوبکر وامضاه عمر

''مجھے اللہ تعالیٰ سے حیاء آتی ہے کہ میں اس شے کو لوٹا دوں جس کو ابوبکرؓ نے منع کیا اور عمرؓ نے ان کے اس فرمان کو جاری رکھا۔'' (ابن ابی الحدید جلد۴ ص۱۳۰)

اسی وجہ سے سیدنا زین العابدینؓ کے صاحبزادے سیدنا محمد باقرؒ کے بھائی سیدنا زید بن علی بن الحسینؓ فرماتے تھے:

لو کنت مکان ابی بکر لحکمت بمثل ماحکم به ابی بکر فی فدك

''اگر ابوبکرؓ کی جگہ میں ہوتا تو میں بھی فدک کے معاملہ میں وہی کچھ کرتا جو ابو بکرؓ نے کیا تھا۔''

(البدایہ والنہایہ جلد۵ ص۲۹۰، السنن الکبریٰ بیہقی جلد۶ ص۳۰۲، ابن ابی الحدید

Marfat.com

جلد۴ص۱۱۳)

مختصر یہ کہ سیدنا ابوبکرؓ اور سیدنا عمرؓ وغیرہ نے باغ فدک کے بارہ میں اہل بیت نبوت سے کوئی زیادتی یا ظلم نہیں کیا تھا جس کا آج کل تذکرہ کیا جاتا ہے۔ بلکہ ان دونوں حضرات نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے رشتہ داروں کا جو خمس میں حصہ تھا اس کی تقسیم کا متولی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدنا علیؓ کو بنایا تھا۔ سیدنا ابوبکرؓ اور سیدنا عمرؓ نے بھی انہیں کو متولی رکھا اور سیدنا علیؓ ان دونوں کی خلافتوں کے دوران نہایت خوش اسلوبی سے تولیت کے اس کام کو سرانجام دیتے رہے۔ چنانچہ وہ خود فرماتے ہیں:۔

"مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس خمس الخمس کا اپنے زمانہ میں متولی بنایا اور میں نے جہاں جہاں مناسب تھا وہاں اسے تقسیم کیا۔ پھر ابوبکرؓ اور عمرؓ کی خلافتوں میں بھی اس کا متولی رہا"۔

(السنن الکبریٰ بیہقی جلد ۶ ص ۳۴۳، مسند امام احمد بن حنبل جلد ۱ ص ۸۴)

آمدم برسر مطلب

یہ تھا مختصر طور پر فدک کا معاملہ۔ فدک جیسا کہ عرض کیا گیا ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ سے لے کر اہل بیت نبوت کے قبضہ میں تھا۔ وہی اس کا تمام انتظام وانصرام کرتے تھے، لیکن بعض روایات کے مطابق بنوامیہ کے بعض خلفاء نے اس پر قبضہ کرلیا ہوا تھا۔ اور وہ اب اس کی آمدن اپنے ذاتی اخراجات میں صرف کرتے تھے۔ اب یہ سیدنا عمر بن عبدالعزیزؒ کے قبضہ میں تھا اور اسی پر ان کی اور ان کے اہل وعیال کی گزران تھی۔ آپ نے اس کے بارہ میں تحقیقات کر کے آل مروان سے کہا کہ "فدک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خالصہ تھا جس کی آمدن آپ اپنی اور بنوہاشم کی ضرورت میں صرف فرماتے تھے۔ خود سیدہ فاطمہؓ نے آپؐ سے اس کو مانگا لیکن آپ نے اسے دینے سے انکار فرمایا۔ پھر سیدنا عمر فاروقؓ کے زمانہ تک اسی پر عمل ہوتا رہا جیسا کہ گزشتہ صفحات میں بتایا گیا ہے۔ آخر میں اموی خلیفہ نے اس کو اپنی جاگیر بنالیا جو اب میرے قبضہ میں آیا ہے، لیکن میرا اس پر کوئی حق نہیں کیونکہ آپ نے یہ فدک تو سیدہ فاطمہؓ کو دینے سے انکار فرمایا تھا، لہذا میں تم لوگوں کو گواہ بناتا ہوں کہ فدک کی جو صورت رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلم اور خلفائے اربعہ کے زمانہ میں تھی اس کو اسی حالت پر لوٹاتا ہوں۔ (سیر اعلام النبلا ، جلد ۵ ص ۱۲۸ ، تہذیب الکمال جلد ۲۱ ص ۴۴۲ ، طبقات ابن سعد تذکرۃ عمر بن عبدالعزیز جلد ۵ ص ۲۵۰ ابوداؤد حدیث نمبر ۲۹۷۲)

یہی وہ انقلاب ہے جو کبھی مٹی کے ذروں ، اینٹ پتھر کے مکانوں اور انسانوں کے جسموں اور صورتوں کو بدل دیتا ہے۔ پھر یہ انقلاب روحوں اور دلوں کی کائنات کو منقلب کر ڈالتا ہے۔ درحقیقت یہی تغیرات دنیا کے اصلی انقلابات ہیں جن سے کائنات انسانیت کا نقشہ حیات وسمات بنتا اور بدلتا رہتا ہے اور جن کی بدولت دنیا کی سعادت وہدایت کا قیام اور عالم انسانیت کی ابدیت روحانی اور انسانیت قلبی کو بقا ہے۔ اسی روحانی انقلاب کے تحت آپ نے اپنی اور اپنے خاندان کی غصب شدہ جاگیروں کو واپس کرایا۔

ان جاگیروں اور غصب شدہ اموال کی واپسی کے بعد آپ عام غصب شدہ مالوں کی طرف متوجہ ہوئے اور پورے اموی دور میں ظالمانہ طریقوں سے جس قدر غصب شدہ اموال اور جاگیریں تھیں وہ آپ نے ایک ایک کر کے سب کو واپس کر دیں اور بنوامیہ سے لے کر ان کے اصلی مالکوں کو واپس کر دیں۔ (طبقات ابن سعد جلد ۵ ص ۲۵۲)

آپ نے یہ عمل صرف شام ہی میں نہ کیا بلکہ سلطنت اسلامیہ کے تمام صوبوں کے گورنروں کو لکھا کہ ان کے علاقوں میں تمام غصب شدہ اموال کو ان کے اصل مالکوں کی طرف لوٹایا جائے اور اس بارہ میں بڑے تاکیدی احکام جاری فرمائے۔ مورخین نے لکھا ہے کہ عراق میں اس کثرت سے مال واپس کیا گیا کہ صوبہ کی حکومت کا خزانہ خالی ہو گیا اور وہاں کے مقامی انتظامی اخراجات کے لیے آپ کو دارالخلافت دمشق سے روپیہ بھیجنا پڑا۔ (طبقات جلد ۵ ص ۲۵۲)

یہ اموال چونکہ مدتوں سے غصب شدہ تھے لہذا ان کی واپسی کے لیے بڑی دقتیں درپیش آنے کا اندیشہ تھا۔ آپ نے ان اموال کی واپسی کے لیے ہر طرح کی آسانیوں کا لحاظ رکھا۔ سب سے پہلی بات یہ کہ ملکیت کے ثبوت کے لیے کسی بڑی شہادت کی ضرورت نہ تھی بلکہ معمولی شہادت پر مال لوٹا دیا جاتا تھا۔ (طبقات ابن سعد جلد ۵ ص ۲۵۲) جو لوگ اس دنیا سے انتقال کر چکے تھے۔ ان کے اموال ان کے وارثان کو واپس کیے جاتے تھے۔ یہ سلسلہ سیدنا عمر بن عبدالعزیزؒ کے انتقال تک جاری رہا۔ (تہذیب الاسماء جلد ۱ ص ۲۰ ، طبقات جلد ۵ ص ۲۵۱)

خاندان کی برہمی

آپ نے جو کام کیا وہ بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈالنے کے مترادف تھا، کیونکہ آپ نے نہ صرف اپنی اور اہل خاندان کی جاگیریں، اموال مغصوبہ چھین کر اصل مالکوں کو واپس کیے بلکہ بنوامیہ کے سرداروں، وڈیروں اور اصحاب جاہ وحشمت کے تمام امتیازات بھی چھین لیے اور اب وہ معاشرہ میں ایک عام آدمی کی طرح تھے جیسا کہ خلافت راشدہ میں دستور تھا۔ اس سے ان کا سابقہ تمام غرور ونخوت خاک میں مل گیا اور وہ ایسا محسوس کرنے لگے جیسے وہ افلاک کی بلندیوں سے زمین پر گر گئے ہیں۔ اس وجہ سے تمام خاندان میں ان کے خلاف سخت برہمی اور ناراضگی پائی جانے لگی اور وہ اس بات کی کوشش کرنے لگے کہ انہیں اس عادلانہ طریقے سے ہٹا دیا جائے کیونکہ اگر انہوں نے یہی طریقہ اختیار کیے رکھا تو ان کا مصنوعی اور نام نہاد وقار خاک میں مل جائے گا۔ چنانچہ بنوامیہ کے ایک اہم شخص عمرو بن ولید نے آپ کو ایک نہایت غضب آلود خط لکھا جس کے ایک ایک لفظ سے برہمی اور غیظ وغضب کا اظہار ہوتا ہے۔ اس نے لکھا:

"امیر المومنین! آپ نے گزشتہ خلفاء، پر عیب لگایا ہے اور ان کی اور ان کی اولاد کی دشمنی اور عداوت میں ان کے خلاف روش اختیار کی ہے۔ آپ نے قریش کی دولت اور ان کی میراث ظلم وجور اور استبداد سے چھین کر بیت المال میں داخل کر لی ہے اور اس طرح سے آپ قطع رحمی کے گناہ کے مرتکب ہوئے ہیں۔ عمر بن عبدالعزیزؒ خدا سے ڈرو اور اس کا خیال کرو کہ آپ نے اہل خاندان پر زیادتی کی ہے۔ آپ ابھی منبر پر اچھی طرح براجمان بھی نہ ہوئے تھے کہ آپ نے اپنے خاندان والوں کو ظلم وجور کا نشانہ بنانا شروع کر دیا۔ اس ذات کی قسم جس نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو بہت سی خصوصیات سے مختص فرمایا: "آپ اپنی اس حکومت کو جس کو آپ اپنے لیے آزمائش اور مصیبت کہتے ہیں، خدا سے بہت دور ہو گئے کیونکہ آپ ظلم واستبداد میں آگے بڑھ گئے۔ اس وجہ سے اپنی خواہشات کو روکو اور اس کا یقین رکھو کہ آپ ایک جبار کی نگاہ کے سامنے اور اس کے قبضہ قدرت میں ہیں اور اس حالت میں چھوڑے نہیں جا سکتے"۔

Marfat.com

یہ اس خط کا خلاصہ ہے جو عمرو بن ولید نے آپ کو لکھا۔ خط کے ایک ایک لفظ سے سختی اور غلظت کا اظہار ہو رہا ہے۔ سیدنا عمر بن عبدالعزیزؒ نے بھی اسی طرح کے سخت الفاظ سے اس خط کا جواب دیا۔ (سیرۃ عمر بن العزیزؒ ص ۱۱۲)

بعض روایات میں ہے کہ عمرؒ جب ناجائز جاگیروں اور جائدادوں کو بحق سرکار ضبط کر چکے جس کا انہوں نے خلیفہ ہوتے ہی اعلان کیا تھا تو آپ نے امراء اور رؤساء کو جمع کر کے اعلان فرمایا: ''سنو! اگر لوگوں کے حقوق تمہارے ذمہ ہیں تو ان کو ادا کرو اور مجھے اس بات پر مجبور نہ کرو جسے میں پسند نہیں کرتا اور میں تم سے وہ سلوک نہیں کرنا چاہتا جسے تم پسند نہیں کرتے۔ جہاں تک میرا اندازہ ہے۔ اس امت کا دو تہائی یا آدھا مال تمہارے قبضہ میں ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ دولت تم لوگوں کے ہاتھوں میں آ کر سمٹ گئی ہے۔ یہ بات سُن کر امراء خاموش ہو گئے اور ان سے عمرؒ کی بات کا کوئی جواب نہ بن پڑا۔ رؤساء کے پورے مجمع میں ہشام بن عبدالملک بولا: ''امیرالمومنین! جو مال ہمیں اپنے بزرگوں سے ورثہ میں ملا ہے وہ ہم کسی صورت نہیں چھوڑ سکتے کیونکہ نہ تو ہم اپنے باپوں کی ناشکری کر سکتے ہیں اور نہ ہی ہم اپنے بچوں کو نادار اور قلاش بنانا چاہتے ہیں''۔ سیدنا عمرؒ کو اس بات کا اندیشہ تھا کہ کہیں عوام ان کی معاونت نہ کریں۔ اس لیے آپ نے فرمایا: ''اگر یہ اندیشہ نہ ہوتا کہ عوام ان امراء کی میرے خلاف مدد کریں گے جن کے لیے میں اس حق کا مطالبہ کر رہا ہوں تو میں جلد ہی ان رخساروں کو مٹی میں ملا دیتا۔ اگر اللہ تعالیٰ نے مجھے زندہ رکھا تو میں انشاء اللہ ہر حق دار کو اس کا حق پہنچا کر رہوں گا''۔ (العقد الفرید جلد ۴ ص ۴۳۷)

جونہی آپ نے اصلاح کا بیڑا اٹھایا۔ امراء میں ایک ہیجان پیدا ہو گیا اور انہوں نے آپ کے بارہ میں عجیب وغریب افواہیں اڑانی شروع کر دیں۔ اعتراضات کی ایک تیز وتند آندھی چھا گئی۔ لیکن آپ نے نتائج سے بے پروا ہو کر اپنا کام شروع رکھا اور ان کے اعتراضات اور افواہوں پر کوئی توجہ نہ دی اور اپنا دل مضبوط رکھا۔ امراء نے آپ میں کمزوری کی دراڑیں تلاش کرنا شروع کیں۔ لیکن انہیں ان میں کوئی کمزوری نظر نہ آئی کیونکہ یہ ان کے مقابلہ میں انتہائی مضبوط اور مستحکم تھے۔ اب امراء نے سازشوں کا جال بچھانا شروع کیا جب انہیں دوسرے راستوں سے کامیابی نظر نہ آئی تو سب سے پہلی یہ سازش کی گئی کہ ان کی پھوپھی فاطمہ کو ان کے خلاف مشتعل کیا گیا اور اس کے کان بھرے گئے۔ فاطمہ بنت

مروان ایک بلند پایہ اور خود دار خاتون تھیں۔ جب سب امراء نے یک زبان ہو کر عمر بن عبدالعزیزؒ کے خلاف ان کے کان بھرے تو انہوں نے عمرؒ کے پاس پیغام بھیجا کہ میں ایک نہایت اہم کام کے سلسلہ میں تم سے ملنا چاہتی ہوں۔ یہ پیغام بھیج کر فاطمہ گھوڑے پر سوار ہو کر عمرؒ کے ہاں پہنچی۔ دربان آپ کو اندر لے گیا۔ یہاں تک کہ آپ عمر بن عبدالعزیزؒ کے خیمہ تک پہنچ گئیں۔ عمرؒ ان کے استقبال کے لیے خود اٹھے۔ گھوڑے سے اتارا اور نہایت احترام کے ساتھ بٹھایا۔ پھر مزاح کے طور پر پوچھا: کیا آپ نے دروازے پر پہرے دار نہیں دیکھے؟ فاطمہ بنت مروان نہایت خوددار اور سنجیدہ عورت تھی، اسے مزاح اور دل لگی سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ اس لیے انہوں نے جواب دیا: کیوں نہیں، دیکھے ہیں، اور یہ دربان تو ان کے پاس بھی دیکھے ہیں جو تم سے بہتر تھے۔ آپ نے دیکھا کہ پھوپھی صاحبہ کچھ زیادہ ہی سنجیدہ ہیں۔ لہذا آپ نے مزید کوئی بات نہ کی اور ان کے تشریف لانے کا سبب پوچھا۔ فاطمہ بنت مروان نے اپنے آنے کا سبب بتایا۔ آپ نے جواب میں عرض کیا: پھوپھی صاحبہ! جب سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم اس دنیا سے رخصت ہوئے تو لوگوں کو ایک آباد گھاٹ پر چھوڑ کر رخصت ہوئے۔ پھر اس امت کا منتظم ایک ایسا شخص ہوا جس نے اس میں کوئی کمی بیشی نہ کی۔ پھر یکے بعد دیگرے مختلف حضرات اس امت کے منتظم ہوئے، لیکن بعد میں آنے والے کچھ منتظمین نے اس میں کمی بیشی کر دی۔ بخدا! اگر اللہ تعالیٰ نے مجھے زندگی عطا فرمائی تو میں اس انتظام کو سابقہ حالت پر لے آؤں گا۔ آپ کی بات سُن کر پھوپھی صاحبہ نے کہا: پھر تو تمہارے نزدیک ان خلفاء کو بُرا نہ کہا جائے۔ آپ پھوپھی صاحبہ کی بات سے سمجھ گئے کہ یہ کیا کہنا چاہتی ہیں۔ آپ نے کہا: ''انہیں کون برا کہتا ہے؟ ایک شخص اپنا حق حاصل کرنے کے لیے میرے پاس آتا ہے تو میرے لیے ضروری ہے کہ میں اس کا حق دلواؤں۔ پھوپھی صاحبہ نے کہا: آپ کے اعزاء و اقربا آپ کا شکوہ کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ آپ نے ان سے وہ چیزیں چھن لیں جو پہلے خلفاء نے ان کو دی تھیں یا ان سے نہیں چھینی تھیں۔ عمرؒ نے کہا: ''میں نے ان کا حق تو نہیں لیا؟'' بولیں: یہ درست ہے لیکن میں نے انہیں آپ کے خلاف سخت باتیں کرتے ہوئے سُنا ہے اور مجھے اس بات کا اندیشہ ہے کہ وہ کوئی سخت دن آپ کے پاس نہ لے آئیں۔ یہ بات سُن کر عمرؒ کو جوش آ گیا آپ نے اسی جوش میں فرمایا: مجھے ہر سخت دن کا ڈر ہو اور روز قیامت جیسے دن کا ڈر نہ

Marfat.com

ہو، ایسا ممکن نہیں۔ میں تو یہ دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ مجھے قیامت کے دن کے سختی سے محفوظ فرمائے۔

عمرؒ کی یہ بات سُن کر پھوپھی صاحبہ نے اٹھ کر آنا چاہا لیکن عمرؒ نے انہیں بٹھالیا۔ اب آپ نے اپنی بات مزید پھوپھی صاحبہ کے ذہن میں اتارنے کے لیے ایک اشرفی اور آگ کا ایک انگارہ منگوایا۔ اس اشرفی کو اس انگارے پر رکھا۔ وہ اشرفی سرخ ہو کر پگھل گئی اور اس پر جو کچھ لکھا ہوا تھا وہ سب ختم ہو گیا۔ پھر آپ نے فرمایا: پھوپھی جان! کیا آپ کو اپنے اس بھتیجے پہ اس جیسی اشرفی سے رحم نہیں آتا؟ یہ دیکھ سُن کر پھوپھی صاحبہ خاموش کھڑی ہو گئیں اور عمرؒ کی یہ بات ان کے دل کے اتھاہ گہرائیوں میں اتر گئی۔ وہ خوف زدہ ہو گئیں۔ عمرؒ نے پھوپھی کی خاموشی کو دیکھ کر کہا: ''پھوپھی صاحبہ! بات کریں میں کوئی غلط بات تو نہیں کہہ رہا؟'' بولیں: ''عمر! میں تم سے تبادلہ خیالات کرنے کے لیے آئی تھی لیکن تیرا یہ انداز گفتگو سُن کر مجھ میں بات کرنے کی ہمت نہیں رہی''۔ چنانچہ وہ اٹھ کر واپس چلی آئیں اور مزید کوئی بات نہ کر سکیں۔ واپسی تک ان کے ذہن میں سونے کی آگ بھڑک رہی تھی اور وہ سونے اور سونے والوں کے درمیان مقابلہ کر رہی تھیں۔ جب وہ واپس ان لوگوں کے پاس پہنچیں جنہوں نے انہیں مشتعل کر کے عمرؒ کے پاس بھیجا تھا تو ان کو اکٹھا کر کے کہنے لگیں: ''تم اپنے فرزند عبدالعزیزؒ کا نکاح جب آل عمرؓ میں کرتے ہو تو پھر جب اس کی اولاد وہ کچھ کرتی ہے جو فاروق اعظمؓ نے کیا تو بے صبری کا اظہار کرتے ہو؟ عمر بن عبدالعزیزؒ جو کچھ کہہ رہے ہیں یا کر رہے ہیں اس پر صبر کر کے اپنے کام کے انجام کا ذائقہ چکھو۔'' (سیرۃ ابن جوزی ص ۱۱۶، صفۃ الصفوۃ جلد ۲ ص ۶۹، کتاب الاغانی جلد ۸ ص ۱۴۷، البدایہ والنہایہ جلد ۹ ص)

پھر ایک وقت وہ بھی آیا کہ وہ ہنگامہ پھوٹ پڑا جس کے پھوٹنے کا خطرہ تھا۔ سلیمان بن عبدالملک کا ایک لڑکا آیا جس کی زمین دستاویز نہ ہونے کی وجہ سے آپ نے ضبط کر لی تھی۔ اس نے آ کر کہا: ''امیر المومنین! آپ مجھے میری زمین واپس کیوں نہیں کرتے؟'' آپ نے فرمایا: ''معاذ اللہ! میں تم کو وہ زمین کیوں نہ لوٹاؤں اگر تمہارے پاس اس کی ملکیت کی کوئی دستاویز ہے؟'' اس نے اپنی آستین سے دستاویز نکال کر آپ کو دی۔ عمرؒ نے دستاویز کو دیکھا اور فرمایا: ''اس دستاویز کی زمین کس کی ہے؟'' اس نے جواب دیا:

Marfat.com

"فاسق ابن حجاج کی"۔ فرمایا: پھر تو مسلمان اس کے حق دار ہیں۔ اب اس کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ اس نے کہا: "اچھا، آپ مجھے میری دستاویز واپس کر دیں"۔ سیدنا عمرؒ نے فرمایا: میں نے یہ دستاویز تم سے مانگی نہیں تھی، تم نے خود مجھے دی ہے، لہذا اب میں تمہیں یہ واپس کرنے کا نہیں تاکہ اب تم کبھی بھی یہ غلط مطالبہ نہ کر سکو۔ مختصر یہ کہ عمرؒ نے سلیمان کے اس بیٹے کے ساتھ سخت بے رحمی کا اظہار کیا۔ وہ آپ کے سامنے اس جائداد کے لیے رویا بھی، لیکن عمرؒ نے اس کے رونے کی طرف کوئی توجہ نہ دی اور چلے گئے۔ آپ کے غلام مزاحم نے یہ سارا معاملہ اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ اسے سلیمان کے اس بیٹے پر جس کے لیے وصیت بھی کی گئی تھی، ترس آ گیا۔ جب وہ چلا گیا تو مزاحم نے کہا: "امیرالمومنین! آپ سلیمان کے بیٹے کے ساتھ یہ برتاؤ کر رہے ہیں اور آپ کو اس کے رونے پر بھی ترس نہیں آیا؟"۔ آپ نے جواب میں فرمایا: "میں سلیمان کے اس بیٹے کے لیے اسی قدر شفقت کے جذبات رکھتا ہوں جس قدر اپنی اولاد کے لیے رکھتا ہوں لیکن کیا کروں، معاملہ دین کا ہے، کل اللہ کو حساب میں نے دینا ہے"۔ (سیرۃ ابن جوزی ص ۱۱۸)

عمر بن نباتہ کے بچپن میں ولید بن عبدالملک کو اس سے بڑی محبت تھی اور اس نے اس کو مسلمانوں کے ایک فوجی دستہ پر امیر مقرر کر دیا تھا اور اس دستہ پر اسی کا حکم چلتا تھا۔ جب عمر بن عبدالعزیزؒ ظلم و جبر سے حاصل کیے ہوئے مالوں کے حقوق حق داروں کو دلوا رہے تھے۔ تو عمر بن نباتہ سخت غضب ناک ہوا اور اس نے سخت غصے میں عمرؒ کو ایک خط لکھا کہ آپ نے سابق خلفاء کو داغدار بنا دیا ہے اور ان کے طریقہ اور سیرت کو چھوڑ کر ایک نئی سیرت اختیار کر لی ہے اور ان کی اولاد کے ماتھے پر کلنک کا ٹیکہ لگا دیا ہے اور آپ نے اس رشتہ کو منقطع کر دیا ہے جس کو ملانے کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے، کیونکہ آپ نے قریش کے اموال اور ان کی جائیدادیں سرکاری خزانے میں جمع کرا دیں ہیں۔ آپ کا یہ عمل ناقابل معافی ہے۔ اس خط کے جواب میں عمر بن عبدالعزیزؒ نے ابن نباتہ کو لکھا:

"تیرا خط مجھے موصول ہوا۔ میں تجھے اس سے بہتر جواب دے رہا ہوں۔ اے ابن ولید! تیرا ابتدائی حال وہ ہے جس سے تو خود بخوبی آشنا ہے کیونکہ تیری ماں نباتہ قبیلہ سکون کی ایک لونڈی تھی وہ گاتی بجاتی اور رقص کرتی تھی۔ حمص کے بازاروں میں وہ دُکان در دُکان پھرتی تھی۔ اسے دیان نے مسلمانوں کے مال

Marfat.com

سے خرید لیا اور وہ بطور ہدیہ تیرے باپ کے پاس بھیج دی گئی۔ پھر ولید سے اس کے پیٹ میں تیرا حمل قرار پا گیا، لہذا اس سے پیدا ہونے والا بچہ بدترین بچہ ہے۔ پھر تیری پرورش ایک ظالم اور سرکش کے طور پر ہوئی۔ تو مجھے اس وجہ سے ظالم اور جابر کہتا ہے کہ میں نے تجھے اور تیرے گھرانے کو اللہ کے مال سے جس میں قرابت داروں، غریبوں، مسکینوں اور بیواؤں کا حصہ ہے، محروم کر دیا ہے۔ سن لو! سب سے بڑا ظالم وہ ہے جس نے تجھے جب کہ تو ایک نادان بچہ تھا، اسلامی فوج کے ایک دستہ کا حاکم بنایا تھا اور تو اس پر اپنی مرضی سے حکم چلاتا تھا، لہذا تیرے لیے بھی ویل اور تیرے باپ کے لیے بھی ویل ہے۔ قیامت کے روز کتنے لوگ تم دونوں باپ بیٹے سے جھگڑنے والے ہوں گے اور تو اور تیرا باپ جھگڑنے والوں سے کیسے چھٹکارا حاصل کر پائیں گے؟ اور مزید سن لو! وہ شخص انتہائی ظالم اور اللہ تعالیٰ کے عہد کو توڑنے والا ہے جس نے حجاج بن یوسف کو حاکم بنایا جب کہ وہ حرام خون ریزی کرتا اور حرام مال حاصل کرتا تھا اور جس نے قرہ بن شریک کو جو ایک ٹھیٹھ گنوار شخص تھا، مصر جیسے صوبے کا حاکم بنا دیا اور اسے ہر قسم کے لہو ولعب اور شراب وکباب کی چھوٹ دے دی۔ ابن نباتہ! انتظار کر کہ جب میں تیرے لیے اور تیرے گھر والوں کے لیے فارغ ہو جاؤں اور ان کو ایک روشن راستہ پر رکھ دوں کیونکہ تم ایک طویل زمانہ سے حق کو چھوڑے ہوئے ہو اور فضولیات اور لہو ولعب میں مشغول ہو۔ ابن نباتہ! عنقریب میں اپنی آنکھوں سے دیکھ لوں گا کہ میں تجھے فروخت کر کے تیری قیمت یتیموں، مسکینوں اور بیواؤں پر خرچ کر دوں گا جن کا حق تو آج تک کھاتا رہا ہے، کیونکہ تجھ میں ان سب کا حق ہے۔ میں نے عزم کر لیا ہے۔ کہ میں تیرے پاس عنقریب ایک ایسا شخص بھیجنے والا ہوں جو تیری پیشانی کے بال جو بدترین ہیں کاٹ دے گا کیونکہ میرے علم کے مطابق وہ تیری عظیم ترین مصیبت کا ذریعہ ہیں"۔

(سیرۃ ابن جوزی ص ۱۱۴، صفۃ الصفوۃ جلد ۲ ص ۵۹، البیان والتبیین جلد ۳ ص ۲۳)

عنبسہ بن سعید بن العاص بنوامیہ کے اشراف میں سے تھا اور نہایت کثرت سے خلفاء کے پاس اس کی مجالس ہوتی تھیں۔ وہ اتنا مالدار تھا کہ اس کو مزید مال کی کوئی ضرورت

Marfat.com

نہ تھی، لیکن حریص ہونے کے ناطے وہ خلفاء سے مانگتا ہی رہتا تھا پھر بھی اس کا پیٹ نہ بھرتا تھا۔ ''کورۂ چشم حریصاں پر نہ شد'' کی زندہ مثال تھا۔ سلیمان نے مرنے سے قبل اس کو بیس ہزار دینار بطور عطیہ دیے۔ وہ اس طرح کہ ایک تحریر لکھ کر دے دی کہ یہ رقم بیت المال سے لے لی جائے۔ عنبسہ اس تحریر سے بہت خوش ہوا لیکن قبل اس کے کہ وہ یہ رقم بیت المال سے لیتا، سلیمان کا انتقال ہو گیا اور بیت المال مقفل کر دیا گیا۔ لہذا یہ تحریر نئے خلیفہ کے حکم پر موقوف رکھی گئی۔ لیکن عنبسہ کی بدقسمتی کہ نئے خلیفہ عمر بن عبدالعزیزؒ ہو گئے۔ عنبسہ نا امید نہ تھا کیونکہ عمرؒ اس کے گہرے دوست تھے۔ ایک روز عنبسہ عمرؒ کے پاس گیا۔ دیکھا کہ ان کے دورازے پر بنوامیہ کے لوگ کھڑے ہیں۔ ان لوگوں نے عنبسہ کو دیکھا تو کہا کہ اس کو واپس آنے دو اور دیکھو کہ اس کا کام بنتا ہے یا نہیں۔ عنبسہ عمرؒ کے پاس گئے اور کہا: ''امیر المومنین! ہماری آپ سے رشتہ داری ہے اور آپ کی قوم آپ کے دروازے پر کھڑی ہے اور آپ سے ملتجی ہے کہ آپ سے پہلے کے خلفاء جو کچھ انہیں دیا کرتے تھے وہ آپ بھی انہیں دیں۔ آپ نے فرمایا: ''عنبسہ! میرے مال میں تمہارے لیے کوئی گنجائش نہیں۔ باقی رہا سرکاری بیت المال سو اس میں تمہارا اور دوسرے تمام مسلمانوں کا برابر کا حق ہے۔ کسی مسلمان کے عزیز اور رشتہ دار ہونے کی وجہ سے اس کا یہ حق روکا نہیں جا سکتا۔ اگر خلافت کے کاموں میں سب لوگوں کی تم جیسی رائے ہو جائے تو یقیناً تم پر اللہ کا عذاب نازل ہو جائے۔

امیر المومنین کا جواب سُن کر عنبسہ نے کہا: ''امیر المومنین! اس صورت میں آپ کی قوم آپ سے کسی اور جگہ جانے کی اجازت طلب کرتی ہے۔ عمرؒ نے جواب دیا: وہ جہاں چاہیں چلے جائیں میں نے انہیں اجازت دے دی۔ البتہ کسی ذمی کو کوئی تکلیف نہ پہنچائیں۔ اب عنبسہ نے بات تبدیل کی اور کہا: ''امیر المومنین! سلیمان بن عبدالملک نے مجھے ایک عطیہ دیا تھا۔ لیکن عطیہ حاصل کرنے سے قبل سلیمان کا انتقال ہو گیا۔ براۂ کرم اب آپ یہ عطیہ مجھے دلوادیں۔ میرے آپ کے ساتھ جس قدر گہرے تعلقات ہیں اس قدر سلیمان سے بھی نہ تھے۔ عمرؒ نے پوچھا: یہ عطیہ کتنی رقم کا ہے؟ وہ بولا: بیس ہزار دینار کا۔ اس قدر بھاری رقم سُن کر عمرؒ نے چیخ ماری اور فرمایا: بیس ہزار دینار تو مسلمانوں کے چار ہزار گھرانوں کے کام آسکتے ہیں اور میں اس قدر گراں قدر رقم ایک شخص کو دے دوں، بخدا!

Marfat.com

میں ایسا نہیں کر سکتا۔ عنبسہ نے کہا: پھر تو آپ مجھے بھی اجازت دے دیں کہ میں آپ کی قوم کے ساتھ کسی دوسری جگہ چلا جاؤں۔ فرمایا: میں نے تمہیں بھی اجازت دے دی۔ عنبسہ کا بیان ہے کہ میں آخرکار آپ کے پاس سے نکل آیا۔ جب دروازے پر پہنچا تو آپ نے مجھے آواز دے کر بلایا: ابو خالد، میں لوٹ کر گیا اور خیال کیا کہ شاید آپ نے اپنی رائے بدل دی ہو۔ لیکن آپ نے مجھے فرمایا: کثرت سے موت کو یاد کیا کرو۔ اگر تم پر تنگی ہے تو موت کی یاد تمہاری تنگی دور کر دے گی اور اگر فراخی ہے تو اس سے دنا ہیچ نظر آئے گی۔

آپ کی یہ بات سُن کر مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے آپ مجھ سے مذاق کر رہے ہیں۔ اب میں پھر باہر آنے کے لیے آگے بڑھا تو اپ نے مجھے پھر آواز دی۔ اب کی بار آپ نے مجھ پر ترس کھایا اور میرے تعلقات کا احترام کیا۔ فرمایا: عنبسہ! میرے خیال میں تم کو کہیں جانا نہیں چاہیے کیونکہ تم ایک مالدار اور متمول شخص ہو۔ میں سلیمان کا ترکہ فروخت کرنے والا ہوں۔ تم اسے خرید لو۔ انشاء اللہ تلافی مافات ہو جائے گی۔ عنبسہ کہتے ہیں کہ میں آپ کی رائے کو باعث برکت سمجھتے ہوئے ٹھہرا رہا اور میں نے ایک لاکھ میں سلیمان کا ترکہ خرید لیا پھر میں اسے عراق لے گیا اور وہاں دو لاکھ میں فروخت کر دیا۔

(سیرۃ ابن جوزی ص ۱۱۴، ۱۱۷، سیرۃ ابن عبدالحکم ص ۵۶، ۵۷، ص ۱۶۱)

مختصر یہ کہ امراء نے عمرؒ کی رائے تبدیل کرنے کے لیے ہر ممکن کوشش کی لیکن ان کی سب کوششیں رائیگاں گئیں اور عمرؒ نے بھی کوئی ایسی تدبیر نہ چھوڑی جس سے وہ بنوامیہ کو ان کے خیالات سے باز رکھ سکے حتی کہ عمرؒ ان سے اور وہ عمرؒ سے مایوس ہو گئے۔ آپ بعض امراء کو دیکھ کر فرمایا کرتے تھے: "میں کچھ ایسی گردنیں دیکھتا ہوں جو عنقریب گردنوں والوں کی طرف لوٹا دی جائیں گی"۔ (العقد الفرید جلد ۴ ص ۴۳۷) آخرکار تمام امراء اس بات پر متفق و متحد ہو گئے۔ اور اپنی یہ متفقہ رائے بھی عمرؒ کے سامنے پیش کر دی کہ عمرؒ اپنے ماتحت مال میں اپنی رائے اور اپنا فیصلہ بے شک نافذ کر لیں لیکن آپ سے قبل جو اموال امراء کو دے دیا گیا ہے اس میں دخل نہ دیں۔ کیونکہ جو شے گزر گئی خواہ وہ غلط تھی یا صحیح وہ اب حق بن گئی ہے۔ اگر یہ گناہ کا کام تھا تو اس کا مواخذہ عمرؒ کو نہ ہو گا بلکہ دینے والوں کو ہو گا۔ یہی رائے ہشام بن عبدالملک نے ان سب امراء کی طرف سے آپ کو پیش کی، لیکن آپ کا ایک ہی جواب تھا اور اس جواب پر وہ آخر تک کاربند رہے کہ "میں اللہ کی

Marfat.com

کتاب کے مطابق عمل درآمد کراؤں گا خواہ وہ مال میرے ماتحت ہو یا مجھ سے پہلے خلفاء کا دیا ہوا ہو۔ امراء نے کئی ہنگامے کیے لیکن آپ اپنے موقف پر قائم رہے۔ آخر کار جب امراء کو آپ کے عزم کی پختگی معلوم ہوئی اور یہ بھی کہ جب آپ کسی کام کا فیصلہ کر لیتے ہیں تو اسے کیے بغیر نہیں چھوڑتے، تو ہنگاموں سے باز آ گئے۔

اسی سلسلہ میں روح بن ولید کا ایک واقعہ کتابوں میں منقول ہے کہ ولید کا بیٹا روح ظالم اور ستم گر تھا۔ لوگ اس سے خوف زدہ تھے۔ اس کے باپ ولید نے حمص میں کچھ دکانیں اس کے نام کر دی تھیں اور ان کی دستاویز بھی لکھ کر دی تھی۔ حمص والے اس بات کی شکایت لے کر عمرؒ کے پاس آئے۔ ان کی شکایت سُن کر آپ نے روح سے کہا کہ ان لوگوں کی دکانیں چھوڑ دو لیکن روح کا موقف تھا کہ ولید کی دستاویزات کی رو سے یہ دکانیں میری ہیں حالانکہ اس بات کا ثبوت مل چکا تھا کہ دُکانیں حمص والوں کی ہیں۔ آخر کار روح بن ولید اور اہل حمص اٹھ کر چلے گئے۔ راستہ میں روح نے حمص کو ڈرایا دھمکایا۔ وہ عمرؒ کے پاس شکایت لے کر آیا۔ عمرؒ کی رگ فاروقی پھڑکی۔ آپ نے ایک پہرے دار کعب بن حامد کو بلا کر کہا: روح بن ولید کے پاس جا، اگر وہ اہل حمص کی دکانیں واپس کر دے تو خیر وگرنہ اس کا سر لے آ۔ کعب بن حامد ننگی تلوار لے کر روح کے پیچھے گیا۔ روح نے جب جلاد کو تلوار سونتے ہوئے اپنی طرف آتے دیکھا تو اس کا دل دھڑکنے لگا اور اس نے ذلیل ومغلوب ہو کر وہ دکانیں اہل حمص کو لوٹا دیں۔ (سیرۃ ابن عبدالحکم ص ۵۹)

آپ نے امراء کے تمام اعتراضات کے جوابات دیے، لیکن بنوامیہ کے بڑے بڑے لوگ جن سے جاگیریں اور اموال منصوبہ چھین کر اصل مالکان کو واپس کیے گئے تھے، آپ کے جوابات سے مطمئن نہ ہوئے۔ اس وجہ سے ایک روز وہ آپ کے دروازے پر اکٹھے ہوئے۔ آپ اندر تشریف فرما تھے۔ انہوں نے آپ کے صاحبزادے عبدالملک سے کہا کہ یا تو ہم لوگوں کو اندر جانے کی اجازت دلواؤ یا پھر اپنے ابا کو ہمارا یہ پیغام پہنچا دو کہ "ان سے پہلے جو خلفاء تھے وہ ہم کو لیتے دیتے تھے، ہمارے مراتب و درجات کا لحاظ رکھتے تھے، لیکن تمہارے ابا نے ہمیں ہر قسم کی مراعات سے محروم کر دیا"۔ عبدالملک نے اندر جا کر سیدنا عمرؒ کو لوگوں کا یہ پیغام سنا دیا۔ آپ نے فرمایا: "ان لوگوں کو جا کر کہہ دو کہ اگر میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کروں تو قیامت کے عذاب سے مجھے سخت خوف آتا ہے، لہذا میں آپ

لوگوں کو کوئی بھی ناجائز مراعات نہیں دے سکتا۔ (سیرت عمر بن عبدالعزیز ص ۱۱۷)

یہ شکایت نہ صرف آل مروان کو آپ سے تھی بلکہ خود آپ کے گھر والوں کو بھی آپ سے یہ شکایت تھی چنانچہ امام اوزاعیؒ فرماتے ہیں کہ عمر بن عبدالعزیزؒ نے جب اپنے گھر والوں کے گزارہ الاؤنس بند کر دیے تو عنبسہ بن سعد نے آپ سے شکایت کی کہ امیرالمومنین! ہم لوگوں کا آپ پر حق قرابت ہے۔ آپ نے جواب دیا کہ میرے ذاتی مال میں تم لوگوں کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے اور بیت المال کے مال میں تم لوگوں کا اس سے زیادہ حق نہیں ہے جتنا برک غماد کے آخری حدود کے رہنے والے کا۔ خدا کی قسم! اگر ساری دنیا تمہاری ہم نوا ہو جائے تو ان پر اللہ تعالیٰ کا عذاب نازل ہو۔

(سیرت عمر بن عبدالعزیزؒ ص ۱۱۴، ۱۱۵، البدایہ والنہایہ جلد ۹ ص)

عمرؒ کی اس ساری جدوجہد کا نتیجہ یہ نکلا کہ انہوں نے وہ تمام زمینیں واپس لوٹا دیں جو ولید نے غصب کی تھیں، وہ بھی لوٹا دیں جو عرب کے کنواروں سے چھینی تھیں اور ابراہیم بن طلحہ کو اس کا گھر بھی واپس کرا دیا جو غصب کر لیا گیا تھا اور پہلے عبدالملک نے اسے لے لیا تھا، پھر سلیمان سے عمرؒ نے اسے واپس لوٹایا۔ (سیرۃ ابن جوزی ص ۱۰۴، النجوم الزاہرہ جلد ۱ ص ۲۶۰) اس طرح عمرؒ نے جس جائداد پر ناجائز قبضہ دیکھا اس کو ایسے پختہ عزم کے ساتھ لوٹایا جس کی نظیر مشکل سے ملتی ہے اور اس کام میں اس بات کی بھی پروانہ کی کہ رشتہ داروں سے تعلقات منقطع یا مخدوش ہو جائیں گے۔

اس قسم کے اور بہت سے واقعات کتابوں میں ملتے ہیں جس سے پتہ چلتا ہے کہ اہل خاندان اور عمائدین سلطنت کی طرف سے آپ پر بہت پریشر ڈالا گیا۔ آپ کی ان مالی پالیسیوں پر ہر قسم کا احتجاج کیا گیا لیکن کسی قسم کا کوئی احتجاج اور کوئی دھمکی آپ کو اپنی ان پالیسیوں کو بروئے کار لانے سے نہ روک سکی اور اس بارہ میں آپ نے جو کرنا تھا وہ کر گزرے۔

ظالم افسروں کا تدارک

دنیا کا یہ عام دستور ہے کہ ظالم حکمران اپنی ظالمانہ پالیسیوں کو بروئے کار لانے کے لیے ظالم عہدیداروں کو متعین کرتا ہے جو ہر معاملہ میں اس کی ہاں میں ہاں ملا کر اس کی جور و استبداد پر مبنی پالیسیوں کو نافذ کرتے ہیں۔ اس وجہ سے اموال مغصوبہ کی واپسی کے

Marfat.com

بعد آپ نے دوسرا سب سے بڑا کام یہ کیا کہ ایسے گورنروں اور افسروں کے ظلم و جور کا تدارک کیا جس کے وہ کئی سالوں سے خوگر ہو چکے تھے۔ اگرچہ آپ کے مشورہ سے سلیمان بن عبدالملک کے عہد خلافت ہی سے بڑی حد تک ایسے لوگوں کا تدارک ہو چکا تھا۔ لیکن پھر بھی کچھ ابھی باقی تھے جن کا تدارک کرنا ضروری تھا۔ حجاج بن یوسف ثقفی اموی حکومت میں سب سے زیادہ جفا کار تھا۔ اس کو دیکھ کر اس کے خاندان والے اور کچھ عہدہ دار بھی ایسے تھے جو حجاج کی جفا کارانہ پالیسیوں پر عمل پیرا تھے۔ آپ نے زمام حکومت ہاتھ میں لیتے ہی حجاج بن یوسف کے پورے خاندان کو یمن کی طرف جلا وطن کر دیا اور وہاں کے گورنر کو لکھا کہ میں تمہارے پاس آل عقیل کو بھیج رہا ہوں جو عرب میں ایک بدترین خاندان ہے اس کو اپنی حکومت اور عمل داری میں ادھر ادھر منتشر کر دو تا کہ وہ کسی ایک جگہ اکھٹے ہو کر سلطنت کے خلاف کوئی کاروائی نہ کر سکیں۔ (سیرت عمر بن عبدالعزیز ص ۹۰) جو لوگ حجاج کے ہم قبیلہ یا اس کے ماتحتی میں کام کر چکے تھے۔ ان کا تدارک اس طرح کیا کہ ان کو ہر قسم کے ملکی اختیارات اور حقوق سے یک قلم محروم کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عوام ان ظالم و جابر عہدہ داروں کے ظلم و استبداد سے محفوظ و مصئون ہو گئے۔ ابن جوزیؒ نے سیرۃ عمر بن عبدالعزیزؒ میں لکھا ہے کہ عمرؒ نے سالم بن عبداللہ بن عمر بن خطاب سے حکام کے بارہ میں مشورہ کیا انہوں نے فرمایا کہ آپ کو حکام کو برطرف کرنے سے یہ بات آڑے نہ آئے کہ آپ کو کام کرنے کے لیے کوئی صحیح آدمی نہیں ملتا، اس وجہ سے فلاں ظالم و جابر شخص کو اس کے عہدہ پر رکھا ہوا ہے۔ فرمایا: جب آپ اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی کے لیے بدکار حاکموں اور افسروں کو برطرف کر دیں گے تو اللہ تعالیٰ صحیح اور مناسب آدمی آپ کو مہیا فرما دیں گے۔ جب کسی انسان کی نیت صحیح ہوتی ہے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی پوری پوری مدد کی جاتی ہے۔ (سیرۃ ابن جوزی ص ۱۳۰) عمرؒ نے اس نصیحت پر عمل کرتے ہوئے ظالم و جابر افسروں کو تیزی سے معزول کرنا شروع کر دیا۔ آپ نے ہر اس افسر اور حکمران کو معزول کر دیا جس نے مسلمانوں کا خون بہایا تھا اگرچہ وہ آپ کا عزیز ہی کیوں نہ تھا۔ چنانچہ آپ نے اسامہ بن زید کو خراج مصر کے عہدہ سے برطرف کر دیا اور یزید بن مہلب اور سالم بن عبدالرحمٰن کو عراق سے معزول فرما دیا اور حارث بن عبدالرحمٰن ثقفی کو اندلس سے

Marfat.com

اور محمد بن یزید بن مسلم کو افریقہ سے ان کے عہدوں سے معزول کر دیا۔ اور حجاج بن یوسف ثقفی کے گھر والوں کو یمن کی طرف جلا وطن کر دیا تا کہ لوگ ان کے شر سے محفوظ رہیں اور اس خاندان میں سے کسی کو نہ عافیت کی حالت میں حاکم بنایا اور نہ ہی جنگ کی حالت میں اور ہر اس شخص کو جس میں شر پسندی کے جراثیم تھے جلا وطن کر دیا۔ خالد بن ریان جس کی تلوار نے کئی بے گناہوں کا خون چاٹا تھا اس سے تلوار لے کر اسے دابق سے واپس بھیج دیا اور اس کا وظیفہ دو ہزار سے کم کر کے صرف تیس کر دیا اور اس جیسے اور بھی جتنے لوگ تھے ان سب کو ان کے عہدوں سے معزول کر دیا۔

عمرؒ غلطی کرنے والے افسروں کو پہلی سزا یہ دیتے کہ اس کو سخت زجر و توبیخ کرتے۔ اگر وہ اس کے باوجود بھی عقل سے کام نہ لیتا تو اسے معزول کر دیتے۔ چنانچہ حاکم کوفہ عدی بن ارطاۃ کے ساتھ یہی کچھ کیا۔ سفیروں کے ساتھ بھی آپ کا وہی سلوک تھا جو عاملوں اور قاضیوں کے ساتھ تھا۔ آپ سفراء کے پیچھے بھی جاسوس لگا دیتے تھے جو ان کو ان کے تمام احوال کی اطلاع دیتے تھے۔ چنانچہ جب آپ نے عبداللہ بن عبدالاعلیٰ کو شاہ روم کی طرف بھیجا تو اس کے ساتھ بھی ایک جاسوس لگا دیا جو قبیلہ عبس سے تعلق رکھتا تھا۔ جب دونوں واپس لوٹے تو آپ نے عبسی سے خلوت میں تمام حالات معلوم کیے۔

(الکامل للمبرد جلد ۱ ص ۳۰۶، سیرۃ ابن جوزی ص ۸۸)

ظلم و جور کا انسداد

ایک ظالم و جابر حکمران کو ہمیشہ ایک خلش رہتی ہے کہ اس کی غلط اور غیر عادلانہ پالیسیوں کے خلاف صدائے احتجاج نہ اٹھے۔ چنانچہ وہ اس کے تدارک کے لیے بدگمانی اور سوئے ظن پر مختلف لوگوں پر ظلم و جور کے پہاڑ توڑتا رہتا ہے اور معمولی معمولی جرائم بلکہ بدگمانی اور سوئے ظن پر دار و گیر اور سزا دیتا رہتا ہے۔ سیدنا عمر بن عبدالعزیزؒ نے اس کو بالکل بند کر دیا۔ موصل میں چوری اور نقب زنی کی اکثر وارداتیں ہوتی رہتی تھیں۔ یہاں کے گورنر یحییٰ غسانی نے امیر المومنین کو لکھا کہ جب تک لوگوں کو شبہ میں نہ پکڑا جائے گا اور انہیں سزا نہ دی جائے گی یا ان پر تشدد نہ کیا جائے گا اس وقت تک چوری اور نقب زنی کی یہ وارداتیں بند نہ ہوں گی۔ لیکن آپ نے اس کے جواب میں اسے لکھا کہ صرف شرعی ثبوت پر مواخذہ

کیا جائے۔ اگر حق ان کی اصلاح نہیں کرسکتا تو خدا ان کی اصلاح نہ کرے۔
(تاریخ الخلفاء سیوطی ص ۲۳۸)

اسی طرح خراسان کے گورنر جراح بن عبداللہ بن حکمی نے آپ کو لکھا کہ اہل خراسان کی روش اور طور و اطور نہایت خراب ہیں۔ ان کو کوڑے اور تلوار کے علاوہ اور کوئی شے درست نہیں کرسکتی اور وہ اسٹیٹ کے لیے ایک مصیبت بنے ہوئے ہیں۔ اگر امیرالمومنین مناسب سمجھیں تو ان دونوں (کوڑا اور تلوار کے استعمال) کی اجازت فرما دیں تو معاملہ درست ہوسکتا ہے۔ آپ نے جواب میں لکھا:

"خط تمہارا پہنچا۔ تمہارا یہ لکھنا کہ اہل خراسان کو کوڑے اور تلوار کے سوا اور کوئی شے درست نہیں کرسکتی، میں اس کو درست نہیں سمجھتا۔ ان کو عدل وانصاف اور حق وراستی سے درست کرو اور اسی کو عام کرو"۔ (تاریخ الخلفاء ص ۲۴۳)

آپ کے خلیفہ بننے سے پہلے ملک میں عام دستور یہ تھا کہ اسٹیٹ کے مختلف عہدیدار اپنی حیثیت کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے رعایا کے مالوں کو کم قیمت پر خرید لیتے تھے اور پھر ان کو مہنگے داموں فروخت کرتے۔ یہ بھی ایک ظلم تھا۔ اس کے انسداد کے لیے آپ نے تمام گورنروں اور عہدیداران حکومت کو لکھا کہ کوئی سرکاری افسر رعایا کے کسی مال کو کم قیمت پر خرید نہیں سکتا۔ چنانچہ آپ نے عدی بن ارطاط گورنر فارس کو لکھا کہ مجھے پتہ چلا ہے کہ تمہارے علاقہ کے سرکاری افسر پھلوں کا تخمینہ کر کے عام نرخ سے کم قیمت لگا کر لوگوں سے خریدتے ہیں۔ اور کردوں کے قبائل مسافر سے عشر وصول کرتے ہیں۔ اگر مجھے یہ معلوم ہوگیا کہ یہ سب کچھ تمہارے ایما سے ہوتا ہے یا تم اسے پسند کرتے ہو یا تمہارا اس میں تھوڑا سا بھی عمل دخل ہے تو میں تمہیں کوئی مہلت نہ دوں گا۔ میں بشر بن صفوان، عبداللہ بن عجلان اور خالد بن سالم کو اس معاملہ کی تحقیقات کے لیے بھیج رہا ہوں۔ اگر وہ اس خبر کو درست اور صحیح پائیں گے تو پھلوں کو ان کے مالکوں کو واپس کر دیں گے۔ اس کے علاوہ اور جن جن باتوں کی مجھے اطلاع موصول ہوئی وہ اس سب کی تحقیقات کریں گے۔ تحقیقات کے سلسلہ میں تم ان لوگوں سے کوئی مزاحمت نہ کرنا تاکہ یہ صحیح طور پر تحقیقات کرسکیں۔
(طبقات ابن سعد جلد ۵ ص ۲۸۹، ۲۹۰)

عمر بن عبدالعزیزؒ نے تاجروں پر یہ پابندی لگا دی تھی کہ وہ حد سے زیادہ منافع نہ

Marfat.com

لیں لیکن آپ نے اس پر کوئی سزا مقرر نہ کی اور آپ زیادہ منافع سے نفرت تو کرتے تھے لیکن سزا نہ دیتے، آپ جب اسامہ بن زید تنوخی کو مصر کا افسر خراج بنایا۔ اس زمانہ میں اس نے موسیٰ بن مروان سے بیس ہزار دینار کی مرچیں خریدیں اور اسامہ بن زید نے انہیں ایک گودام میں محفوظ کر دیا۔ اسامہ نے یہ مرچیں ولید بن عبدالملک کے لیے خریدی تھیں تاکہ انہیں ہدیہ کے طور پر شاہ روم کے پاس بھیجے لیکن جب عمر بن عبدالعزیزؒ خلیفہ ہو گئے تو موسیٰ بن مروان نے ان مرچوں کی قیمت کا مطالبہ کیا۔ موسیٰ بن مروان نے ایک روز عمرؒ سے درخواست کی کہ آپ حیان بن سریج کو لکھ دیں کہ وہ بیس ہزار دینار مجھے دے دیں جو مرچوں کی قیمت ہے۔ عمرؒ نے پوچھا کہ یہ بیس ہزار دینار کس کے ہیں؟ اس نے کہا: میرے ہیں۔ پوچھا: تمہارے پاس اتنی رقم کہاں سے آئی؟ موسیٰ نے کہا: میں تاجر ہوں۔ آپ نے اسے ایک چھڑی سے مار کر کہا: تاجر فاجر ہوتا ہے اور فاجر جہنمی ہے۔ پھر فرمایا کہ حیان کو لکھ دو کہ اس کی رقم دے دے۔ موسیٰ کہتے ہیں کہ اس واقعہ کے بعد میں آپ کے پاس نہیں گیا اور آپ نے اپنے دربان کو حکم دیا کہ وہ میرے پاس نہ آئے۔

(فتوح اوخبار مصر ص ۹۹)

خلافت راشدہ کے دور کے مقابلہ میں یہ ایک انارکی اور افراتفری کا دور تھا۔ لوگوں کے اموال اور ان کی عزت وآبرو خطرہ میں تھی۔ اگرچہ آج کل کے مقابلہ میں وہ نہایت امن وآشتی کا دور تھا۔ آج کل کے زمانہ میں تو حکومت ہر قسم کے ٹیکس لیتی ہے لیکن پورے ملک میں کسی شخص کی جان ومال اور عزت وآبرو محفوظ نہیں۔ دن دیہاڑے لوگ قتل ہو رہے ہیں اور بالآخر حکومت نے یہ کہہ دیا ہے کہ ہر شخص اپنی جان اور اپنے مال کی خود حفاظت کرے۔ مسجدوں کے باہر پرائیویٹ گارڈ کھڑے ہیں، لیکن اس زمانہ میں ایسا ممکن نہیں تھا۔ حکومت لوگوں کی جان ومال کی حفاظت اپنا فرض منصبی سمجھتی تھی۔ اس وجہ سے امیرالمومنین سیدنا عمر بن عبدالعزیزؒ وقتاً فوقتاً اپنے گورنروں کو عدل وانصاف کے قیام اور مظالم کے انسداد کے لیے احکامات بھیجتے رہتے تھے۔ چنانچہ آپ نے ایک گشتی فرمان (CIRCULAR) اپنے تمام گورنروں اور امراء کے نام بھیجا کہ لوگ برے افسران اور عمال کی وجہ سے جنہوں نے برے دستور قائم کیے اور کبھی عدل وانصاف، نرمی وبرباری اور احسان وشفقت کا ارادہ نہیں کیا، احکام الٰہی میں سخت مصیبت، سختی اور ظلم وجور میں مبتلا ہو گئے ہیں"۔

Marfat.com

(یعقوبی جلد ۲ ص ۳۶۲) گویا حکام اعلیٰ کو یہ باور کرایا کہ لوگوں کی ساری خرابیاں تمہاری وجہ سے پیدا ہوتی ہیں۔ اگر تم لوگوں پر ظلم وجور نہ کرتے بلکہ عدل وانصاف سے کام لیتے سختی نہ کرتے بلکہ نرمی وبردباری سے کام لیتے تو آج لوگوں کی یہ حالت نہ ہوتی۔ چنانچہ ایک گورنر عبدالحمید کو پہلا خط یہ لکھا کہ" وسوسہ شیطانی اور حکومت کے ظلم کے بعد انسان کی بقا نہیں ہو سکتی لہذا جونہی تمہیں میرا خط موصول ہو اسی وقت ہر حق دار کو اس کا حق ادا کردو۔

(طبقات ابن سعد جلد ۵ ص ۲۷۱)

رعایا پر سب سے بڑا بوجھ ٹیکسوں کا ہوتا ہے۔ غلط قسم کے حکمران اپنی عیاشیوں کے لیے عوام پر ٹیکس لگا کر دولت اکٹھی کرتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ عوام ظالمانہ ٹیکسوں کے بوجھ تلے کراہتے رہتے ہیں اور حکمران طبقہ ان کے خون پسینہ کو چوس کر عیش وعشرت کی زندگی بسر کرتا رہتا ہے۔ سیدنا عمر بن عبدالعزیزؒ نے مسند نشین خلافت ہوتے ہی تمام ناجائز ٹیکس موقوف کر دیے۔ ان کے علاوہ اور بھی ظالمانہ طریقوں کا مالی بوجھ عوام پر پڑا ہوا تھا آپ نے اس کو ختم کر دیا اور عوام سکھ کا سانس لینے لگے۔

(طبقات ابن سعد جلد ۵ ص ۲۸۳)

بیت المال کی اصلاح

قومی خزانہ جس کو بیت المال کہتے ہیں صدر مملکت کی ذاتی ملکیت نہیں ہوتا بلکہ اس میں سارا روپیہ پبلک کا ہوتا ہے اور صدر مملکت اس کا متولی اور کسٹوڈین ہوتا ہے اسلامی ریاست کے ذرائع محاصل مندرجہ ذیل ہوتے ہیں:

(۱) خراج (۲) جزیہ

(۳) فئے، غنیمت وخمس (۴) مشترکہ قومی املاک سے استفادہ

(۵) زمین کے اندر پائے جانے والے معدنی ذخائر (معادن باطنہ)

(۶) ریاستی کاروبار کے منافع (۷) اوقاف

(۸) لاوارث افراد یا اداروں کے ترکے

ان کے علاوہ کچھ اور مدات ہیں جن سے اسلامی ریاست کو آمدنی ہوتی ہے۔ اموی دور میں بیت المال کی یہ مدات موجود تھیں اور اس میں کافی روپیہ بیت المال میں جمع

Marfat.com

بھی ہو رہا تھا، لیکن پھر بھی بعض خلفاء نے مداخل ومخارج دونوں میں بڑی بدعنوانیاں داخل کر دی ہوئی تھیں۔ جن کی وجہ سے جائز وناجائز آمدنی میں کوئی فرق نہیں رہ گیا تھا۔ ہر قسم کی ناجائز آمدنیوں سے خزانے کو بھرا جا رہا تھا اور پھر اسی ناجائز طریقوں سے اسے خرچ کیا جاتا تھا۔ بیت المال ایک قومی امانت تھی اور صدر مملکت اس کا کسٹوڈین ہوتا تھا، لیکن اب بیت المال ذاتی خزانہ بن گیا تھا اور اس کی آمدن کا بڑا حصہ خلفاء اور ان کے خاندان کے ذاتی مصارف میں صرف ہوتا تھا۔ سیدنا عمر بن عبدالعزیزؒ نے ان دونوں بدعنوانیوں کا تدارک کیا اور بیت المال کو قومی امانت ڈکلیر (Declare) کیا۔ آپ نے شاہی خاندان کے تمام وظائف بند کر دیے۔ خلافت کے شکوہ وتجمل کے تمام اخراجات یک قلم موقوف کر دیے۔ جب آپ تخت نشین خلافت ہوئے تھے تو اس کے بعد شاہی اصطبل کے انچارج اور داروغہ نے سواریوں کے اخراجات طلب کیے تو آپ نے حکم دیا کہ ان تمام سواریوں کو فروخت کر کے ان کی قیمت بیت المال میں داخل کر دی جائے کیونکہ مجھے ان شاہی سواریوں کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں ہے۔ میرے لیے میرا خچر کافی ہے۔

(تاریخ الخلفاء ص ۲۳۱، سیر اعلام النبلاء جلد ۵ ص)

آج کل بھی قومی خزانہ کو ہمارے حکمران ذاتی خزانہ سمجھ کر صرف کرتے ہیں۔ غیر ملکی دوروں اور اندرون ملک دوروں کے لیے کروڑوں روپے صرف کیے جاتے ہیں۔ جیسے ان کے باپ کا خزانہ ہو۔ ان کے ٹیلی فونوں کے بل اور گاڑیوں کے پیٹرول کے اخراجات ان کی تنخواہوں سے کئی گناہ زیادہ ہیں۔ دفتروں کی گاڑیاں گھروں میں بیگمات کے ذاتی کاموں میں صرف ہوتی ہیں لیکن کوئی پوچھنے والا نہیں۔ کاش کہ آج بھی کوئی عمر بن عبدالعزیزؒ پیدا ہو جو ان کے مداخل ومخارج کی ناجائز مدات کا تدارک کرے۔

تاریخ کی بعض روایات سے پتہ چلتا ہے کہ حجاج بن یوسف ثقفی بیت المال کی آمدنی بڑھانے کے لیے نومسلموں سے بھی جزیہ لیتا تھا۔ حالانکہ جزیہ صرف غیر مسلموں سے لیا جاتا ہے۔ ذمیوں سے ان کی جان ومال کی حفاظت کا ایک ٹیکس اسلام میں وصول کیا جاتا ہے اور یہ صرف ایسے مردوں پر لگایا جاتا ہے۔ جو فوجی خدمت کے قابل ہوں۔ عورتیں اور بچے اس سے مستثنیٰ ہیں۔ اسی طرح بوڑھے، مسکین، غریب اور وہ اندھے، لنگڑے اور اپاہج بھی اس سے مستثنیٰ ہیں جو مال نہیں رکھتے۔ نادار مذہبی پیشواؤں کو بھی اس سے مستثنیٰ

Marfat.com

قرار دیا گیا ہے۔ یہ ٹیکس اشخاص کی حیثیت کے لحاظ سے لگایا جاتا ہے۔ امام قرطبیؒ فرماتے ہیں کہ جزیہ امان کا ٹیکس ہے یعنی انہیں امان دی گئی تو اس کے عوض انہوں نے جزیہ دیا۔ (تفسیر قرطبی جلد ۸ ص ۱۱۴) اس کی تفصیل کے بارہ میں تفسیر المنار سورۃ توبہ کی آیت نمبر ۳۰ کی تفسیر ملاحظہ فرمائیں۔ جزیہ کی وصولی میں سختی کرنا بھی جائز نہیں ہے۔ چنانچہ روایات میں ہے کہ سیدنا عمر بن خطابؓ جب شام کے سفر سے واپس تشریف لا رہے تھے۔ تو راستے میں ان کا گزر کچھ ایسے لوگوں کے پاس سے ہوا جو دھوپ میں کھڑے کر دیے گئے تھے اور ان کے سروں پر تیل ڈالا جا رہا تھا۔ آپ نے پوچھا: "ان لوگوں نے کیا کیا؟" لوگوں نے جواب دیا کہ ان کے ذمہ جزیہ ہے۔ جسے انہوں نے ادا نہیں کیا ہے، لہذا انہیں یہ سزا دی جا رہی ہے تا کہ وہ اسے ادا کریں۔ سیدنا عمرؓ نے پوچھا: "یہ لوگ ادائیگی کے بارہ میں کیا عذر پیش کرتے ہیں؟" جواب دیا: "یہ کہتے ہیں کہ ہمارے پاس کچھ نہیں۔ ہم جزیہ ادا کرنے کی استطاعت نہیں رکھتے"۔ آپ نے فرمایا! "پھر تم لوگ ان کو چھوڑ دو اور ان پر ان کی برداشت سے زیادہ بوجھ نہ ڈالو کیونکہ میں نے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سُنا ہے کہ:

"لوگوں کو عذاب نہ دو کیونکہ جو لوگ دنیا میں انسانوں کو عذاب دیتے ہیں۔ ان کو قیامت کے روز اللہ تعالیٰ عذاب دے گا"۔

چنانچہ آپ کے حکم سے ان لوگوں کو چھوڑ دیا گیا۔

(کتاب الخراج لابی یوسف ص ۱۵۰، کتاب الاموال ص ۴۳)

جزیہ کچھ صورتوں میں ساقط بھی ہو جاتا ہے۔ جن میں ایک صورت اسلام بھی ہے۔ اگر کوئی غیر مسلم مسلمان ہو جائے تو جزیہ اس سے ساقط ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اہل الیس میں سے دو شخص مسلمان ہو گئے۔ تو سیدنا عمرؓ نے اس سے جزیہ ساقط کر دیا (سنن کبریٰ بیہقی جلد ۹ ص ۱۹۹) اسی طرح اہل نجران میں سے ایک شخص مسلمان ہو گیا۔ حکومت کے کارندوں نے اس سے جزیہ وصول کرنا چاہا۔ اس نے انکار کیا تو سیدنا عمرؓ نے اس سے کہا:

"معلوم ہوتا ہے کہ تم پناہ ڈھونڈ رہے ہو؟"۔ اس نے کہا کہ اسلام میں پناہ ہی ہے اگر آپ دینا چاہیں۔ سیدنا عمرؓ نے فرمایا: بیشک اسلام ہی جائے پناہ ہے اور حکم تحریر فرمایا کہ اس سے جزیہ نہ لیا جائے۔ (مصنف عبدالرزاق جلد ۱۰ ص ۳۳۶) ماوراء النہر کے ایک دہقان زنیل

Marfat.com

نے اسلام قبول کر لیا تو سیدنا عمرؒ نے اس کے لیے دو ہزار دینے کا حکم دیا اور جزیہ معاف کر دیا۔ (الحلی جلد ۷ ص ۳۳۵)

حجاج بن یوسف نے زبردستی نومسلموں سے جزیہ لینا شروع کر دیا جو کہ ان سے لینا جائز نہیں تھا۔ سیدنا عمر بن عبدالعزیزؒ کو جب پتہ چلا تو حکم جاری فرمایا کہ "جو لوگ دائرہ اسلام میں داخل ہو جائیں ان کا جزیہ ساقط کر دیا جائے"۔ آپ کے اس حکم پر اتنے لوگ دائرہ اسلام میں داخل ہوئے کہ جزیہ کی آمدن گھٹ گئی۔ حیان بن شریح نے اس سلسلہ میں شکایت لکھ کر بھیجی کہ "اس کثرت کے ساتھ لوگ مسلمان ہوئے ہیں کہ مجھے قرض لے کر مسلمانوں کے وظائف دینے پڑے"۔ آپ نے اس کو ایک سخت اور تہدید آمیز خط لکھا کہ "جزیہ بہر حال موقوف کرو کیونکہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہادی بنا کر بھیجے گئے تھے، محصل خراج و جزیہ بنا کر نہیں بھیجے گئے تھے"۔

(مقریزی جلد ۲ ص ۱۲۵، سیر اعلام النبلاء جلد ۵ ص ۱۴۷)

اس سلسلہ میں آپ نے اس قدر سختی سے کام لیا کہ ایک عام فرمان جاری فرما دیا کہ اگر جزیہ ترازو میں رکھا جا چکا ہو اور اس حالت میں بھی اگر کوئی ذمی اسلام قبول کر لے یا آغاز سال سے ایک روز پہلے (جب پورے سال کا جزیہ عائد ہو جاتا ہے) کوئی اسلام لے آئے تو بھی اس سے جزیہ نہ لیا جائے۔ (طبقات ابن سعد جلد ۵ ص ۲۶۲)

بیت المال کی آمدنی کا دوسرا ذریعہ خراج ہے۔ خراج اس کرایہ کا نام ہے جو اسلامی ریاست اپنی مملوکہ زمینوں پر وصول کرتی ہے۔ (الخراج فی الدولۃ الاسلامیہ، ضیا الدین الریس ص ۱۵۶، ۱۵۷) کرایہ دار کی حیثیت عام کرایہ داروں جیسی بھی ہو سکتی ہے اور موروثی کاشتکاروں جیسی بھی۔ جو غیر مسلم کاشتکار اپنی زمینوں کے مالک نہ ہوں بلکہ اسلامی ریاست کی مملوکہ زمین پر کرایہ دار یا موروثی کاشتکار کی حیثیت سے کاشت کر رہے ہوں۔ ان سے حکومت اس زمین پر جو کرایہ وصول کرے گی اسے خراج کہتے ہیں۔ اس کرایہ کی کوئی شرح شریعت نے متعین نہیں کی بلکہ مختلف زمانوں میں زمین کی کیفیت کے لحاظ سے مختلف شرحیں رہی ہیں جو کہ کاشتکار کی ضروریات اور زمین کی کیفیت کے لحاظ سے ہوتی ہیں۔ جو غیر مسلم جنگ کے بعد اسلامی اقتدار کے تحت آئے ہوں ان کی زمینیں ان کی ملکیت نہیں رہ جاتیں بلکہ اسلامی ریاست کی ملکیت میں چلی جاتی ہیں خراج کا تعلق اصلاً ایسی ہی زمینوں

Marfat.com

سے ہے۔ (کتاب الاموال لابی عبید ص ۶۸، ص ۲۷۹، الخراج فی الدولۃ الاسلامیہ ص ۱۱۱)

اسلامی ریاست کے صیغہ محاصل میں خراج کی یہ مد ایک نیا اضافہ ہے۔ اسلام سے پہلے عربوں میں محاصل کی اس مد کا پتہ نہیں چلتا۔ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب خیبر فتح کیا تو وہاں کے یہودیوں نے کہا کہ ہم ان زمینوں کے مالک ہیں اور ان کا جوتنا اور بونا ہم تم لوگوں سے زیادہ جانتے ہیں، اس لیے ہمارے ساتھ بٹائی پر معاملہ کر لو۔ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی یہ درخواست منظور فرمالی اور نصفا نصفی پر معاملہ کر لیا۔ فدک کے لوگوں کو جب اس کا علم ہوا تو انہوں نے بھی ایسا ہی معاملہ کرنا چاہا۔ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی درخواست بھی منظور فرمالی۔ (کتاب الخراج لابی یوسف ص ۵۱،۵۰)

سیدنا عمر بن خطابؓ کے زمانہ میں سیدنا عثمان بن حنیفؓ اور سیدنا حذیفہ بن الیمانؓ سے تمام ملک کی زمینوں کا بندوبست کرایا۔ یہ دونوں حضرات عراق میں زیادہ تر رہنے کی وجہ سے اس کام سے بخوبی آشنا تھے۔ امام ابو یوسفؒ نے لکھا ہے کہ انہوں نے اس تحقیق اور صحت کے ساتھ زمین کی پیائش کی جس طرح قیمتی کپڑا ناپا جاتا ہے۔ بعض روایات میں ہے کہ سیدنا عمرؓ نے پیائش کا پیمانہ خود اپنے ہاتھ سے تیار کر کے ان حضرات کو دیا اور انہوں نے کئی ماہ تک بڑے اہتمام اور جانچ پڑتال سے پیائش کا کام جاری رکھ کر بندوبست کا تمام حساب کتاب تیار کیا اور اس پر ایک خاص شرح سے خراج کی رقم عائد کر دی جس کی تفصیل ہم نے کتاب ''سیرت حضرت عمر فاروقؓ'' میں بیان کی ہے۔

روایات میں ہے کہ خراج کی جو شرح سیدنا عثمان بن حنیفؓ نے سفارش کر کے بھیجی سیدنا عمرؓ نے اس کو نافذ فرما دیا۔ لیکن ایک روایت میں ہے کہ سیدنا عمرؓ وفات سے تین یا چار روز قبل سیدنا حذیفہ بن الیمانؓ اور سیدنا عثمان بن حنیفؓ سے یہ فرما رہے تھے: ''شاید تم نے زمین پر اتنا بوجھ ڈال دیا ہے جسے وہ برداشت نہیں کر سکتی''۔ سیدنا عثمانؓ نے جواب دیا کہ میں نے زمین پر اتنا ہی مالیہ عائد کیا ہے جسے وہ برداشت کر سکتی ہے اور اگر میں چاہتا تو اپنی زمین پر اس سے دگنا بار ڈال سکتا تھا''۔ سیدنا حذیفہؓ نے بھی کہا: ''میں نے جو شرحیں عائد کی ہیں۔ انہیں یہ علاقہ برداشت کر سکتا ہے۔ اب جو فاضل بچ رہے گا وہ بہت زیادہ نہ ہوگا''۔ سیدنا عمرؓ نے فرمایا: ''غور کر لو، ایسا نہ ہو کہ تم نے زمین پر اتنا بوجھ

Marfat.com

ڈال دیا ہو جو اس کی برداشت سے باہر ہو۔ اگر میں اہل عراق کی بیواؤں کی خدمت کے لیے زندہ رہا تو انہیں ایسے حال میں چھوڑ جاؤں گا کہ میرے بعد محتاج نہ رہیں"۔

(کتاب الخراج لابی یوسف ص ۲۶)

سیدنا عمرؒ کی اس نیک نیتی اور خلوص اور لوگوں کی بہی خواہی کا نتیجہ تھا کہ جتنا خراج ان کے زمانہ میں اکٹھا ہوا اتنا اس کے بعد پھر کبھی نہ ہوا۔ یہ ان کی عدل گستری اور رعایا پروری کا نتیجہ تھا کہ آسمان سے برکتیں نازل ہوتی تھیں۔

سیدنا عمر بن عبدالعزیزؒ کے مسند نشین خلافت ہونے سے قبل بیت المال کی آمدنی کی اس مد میں جائز وناجائز کی کوئی تمیز نہیں رہی تھی۔ بنجر اور بے آباد زمینوں پر بھی خراج عائد کر دیا گیا اور قحط زدہ علاقوں کے لوگوں سے بھی سختی کے ساتھ خراج وصول کیا جاتا۔ جو ذمی مسلمان ہو جاتے ان سے بھی خراج وصول کیا جاتا۔ سیدنا عمر بن عبدالعزیزؒ کو جب اپنے گورنروں اور دیگر سرکاری افسروں کی ان زیادتیوں کا علم ہوا تو آپ نے خراج کی اصلاح کے لیے بھی مختلف اقدامات کیے۔ چنانچہ مختلف گورنروں کے نام خطوط لکھے۔ ان میں سے ایک خط امام ابو یوسفؒ نے اپنی کتاب الخراج میں نقل کیا ہے۔ آپ نے عبدالحمید بن عبدالرحمٰن کو خراج کی اصلاح کے بارہ میں ایک خط لکھا:

"خراج وصول کرنے سے قبل زمین کا معائنہ کرو۔ بنجر زمین کا بوجھ آباد زمین پر اور آباد زمین کا بار بنجر زمین پر ہرگز نہ ڈالو۔ بنجر زمینوں کا معائنہ کرو۔ اگر ان میں خراج وصول کرنے کی صلاحیت ہو تو ان سے بقدر گنجائش خراج لو اور ان کی اصلاح کرو تاکہ وہ آباد ہو جائے اور اس میں پیداوار کی پوری صلاحیت پیدا ہو جائے۔ جن آباد زمینوں میں کسی وجہ سے پیداوار نہیں ہوتی ان سے خراج وصول نہ کرو اور جو زمینیں قحط زدہ ہو جائیں ان کے مالکان سے نہایت نرمی سے خراج وصول کرو اگر وہ دے سکتے ہوں۔ خراج میں صرف وزن سبعہ لو جن میں سونا نہ ہو، نکسال اور چاندی پگھلانے والوں سے، نوروز اور مہرجان کے ہدیے، عرائض نویسی اور شادی کا ٹیکس، گھروں کا ٹیکس اور نکاح کا ٹیکس نہ لو۔ جو ذمی مسلمان ہو جائیں ان پر کوئی خراج نہیں ہے"۔ (کتاب الخراج ص ۴۹)

غرض اس طرح سے انہوں نے بیت المال سے نہ صرف خراج و جزیہ بلکہ ہر قسم

Marfat.com

کی ناجائز آمدنیاں بند کر دیں اور یہ ان کا ایک بہت بڑا کارنامہ تھا۔

قومی خزانہ کی حفاظت

یہ تو قومی خزانہ اور بیت المال کے مداخل کی اصلاح تھی اور اس کی خرابیوں کا تدارک کیا گیا تھا۔ لیکن جب مختلف ذرائع کی آمدنی قومی خزانہ میں جمع ہوتی تو خزانہ کے انچارج حضرات میں امانت و دیانت کا فقدان بھی تھا۔ بعض حضرات خزانہ کی رقم میں ہیرا پھیری کرتے۔ یہ ساری خرابیاں بھی آپ کے علم میں آئیں۔ تو آپ نے ان کا تدارک بھی فرمایا۔ چنانچہ یزید بن مہلب بن ابی صفرہ گورنر خراسان کو خیانت کے جرم میں معزول کر کے قید کر دیا۔ (یعقوبی جلد۲ ص۳۶۳)

بیت المال کی حفاظت کا آپ نے اتنا سخت انتظام کیا کہ ایک دفعہ یمن کے بیت المال سے ایک دینار گم ہو گیا جو کہ ایک معمولی شے تھی لیکن آپ نے وہاں کے افسر خزانہ کو لکھا کہ میں تمہاری امانت و دیانت کو متہم نہیں کرتا لیکن تمہاری بے پروائی کو ایک سنگین جرم قرار دیتا ہوں اور مسلمانوں کی طرف سے ان کے مال کا مدعی ہوں۔ تم پر فرض ہے کہ تم شرعی قسم کھاؤ۔ (سیرۃ عمر بن عبدالعزیزؒ ص ۸۵)

بیت المال کے بعض مصارف و مخارج میں جو زیادتیاں اور اسراف ہو رہا تھا۔ امیر المومنین عمر بن عبدالعزیزؒ نے ان کی بھی اصلاح فرمائی اور حکومت کے کارکنان کو یہ احساس دلایا کہ خزانہ کے ہم متولی ہیں مالک نہیں ہیں کہ اپنی مرضی سے جتنا چاہیں اور جہاں چاہیں خرچ کریں۔ چنانچہ ابن سعد نے طبقات میں روایت نقل کی ہے کہ ابوبکر بن حزم نے سلیمان بن عبدالملک کے آخری عہد خلافت میں کاغذ، قلم، دوات اور روشنائی کے دفتری اخراجات کے اضافہ کے لیے لکھا تھا۔ یہ خط ابھی بارگاہ خلافت میں پہنچا ہی تھا کہ خلیفہ سلیمان کا انتقال ہو گیا۔ لہذا وہ اس بارہ میں کوئی اضافہ نہ کر سکے۔ خلیفہ کے انتقال کے بعد عمر بن عبدالعزیزؒ مسند خلافت پر بیٹھے تو ابوبکر بن حزم کی یہ ڈیمانڈ ان کے سامنے پیش کی گئی۔ آپ نے اس کے جواب میں ابوبکر بن حزم کو لکھا کہ "وہ دن یاد کرو جب تم اندھیری رات میں بغیر روشنی کے کیچڑ میں اپنے گھر سے مسجد نبوی جایا کرتے تھے اور آج خدا کی قسم! تمہاری حالت اس سے کہیں بہتر ہے۔ ان چیزوں کے اخراجات میں اضافہ نہیں ہو سکتا۔ تم

Marfat.com

قلم باریک کر لو اور سطریں قریب قریب لکھا کرو۔ اپنی اس قسم کی ضروریات میں کفایت شعاری سے کام لو۔ میں مسلمانوں کے بیت المال سے ایسی رقم صرف کرنا ہرگز پسند نہیں کرتا جس سے ان کو کوئی فائدہ نہ پہنچے۔ (طبقات ابن سعد جلد ۵ ص ۲۹۶، سیر اعلام النبلاء جلد ۵ ص ۱۳۲) اسی طرح کی ہدایات آپ نے دوسرے گورنروں کو بھی لکھیں کہ کوئی گورنر ریاست یا کوئی کارکن بڑے کاغذ پر جلی قلم سے نہ لکھے۔ خود آپ کے اپنے فرامین بھی مختصر اور باریک قلم سے ہوتے۔ چنانچہ روایات میں ہے کہ آپ کے فرامین ایک بالشت سے زیادہ نہ ہوتے تھے۔ (سیر اعلام النبلاء جلد ۵ ص ۱۳۳، طبقات ابن سعد جلد ۵ ص ۲۹۵) گویا کہ قومی خزانہ کے بارہ میں آپ نے اس قدر احتیاط فرمائی کیونکہ آپ سمجھتے تھے کہ اس فضول خرچی اور اسراف کی بھی روز قیامت پرسش ہوگی۔

بیت المال کے مصارف

اسلام ایک اجتماعی دین ہے۔ زندگی کا اجتماعی مزاج اور نوع انسان کی آ[illegible] اجتماعی پہلو اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ مسلمان ایک خاندان کی طرح رہیں اور کائنات کی جن اشیاء اور قوتوں کو اس پورے خاندان کی تحویل میں دیا گیا ہے۔ ان سے استفادہ میں سارے مسلمانوں بلکہ انسانوں کو ایک خاندان کے افراد کی طرح طرز عمل اختیار کرنا چاہیے۔ چنانچہ سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔

کونوا عباداللہ اخواناً (مسلم، باب النہی عن التحاسد والتباغض)

اللہ کے بندے اور ایک دوسرے کے بھائی بن کر رہو۔

حجۃ الوداع کے موقع پر آپ نے اپنے خطبہ میں ارشاد فرمایا:

ان کل مسلم اخ للمسلم وان المسلمین اخوۃ

(ابن ہشام جلد ۳ ص ۷۶)

ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے اور سارے مسلمان آپس میں بھائی ہیں۔

صحیح اور صالح اجتماعیت اس وقت وجود میں آتی ہے جب ہر فرد دوسرے افراد کا پورے اجتماع کا اور طرز زندگی کا وفادار اور بہی خواہ بن کر زندگی گذارے جس میں فرد اور اجتماع دونوں کی فلاح مضمر ہو۔ چنانچہ ایک روایت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد

فرمایا:

"دین خیر خواہی کا نام ہے۔ بے شک دین خیر خواہی کا نام ہے۔ سُن لو! دین خیر خواہی کا نام ہے۔ صحابہ کرامؓ نے پوچھا: یارسول اللہ! کس کی خیر خواہی؟ فرمایا: اللہ کی، اس کی کتاب کی، اس کے رسولؐ کی اور مومنین کے ائمہ (یعنی اصحاب امر) کی اور عام مومنین کی"۔ (ابوداؤد، باب النصیحۃ)

اسلامی شعور اور زندگی کا اسلامی مزاج ریاست کی ضرورت اور اہمیت کو اور زیادہ مستحکم کر دیتا ہے۔ اسلامی ریاست مسلمانوں کے مشترکہ مقاصد کی ضامن اور ان کے جذبہ اخوت وتعاون کی اعلیٰ ترین مظہر بن کر ابھرتی ہے۔ اسلام نے اجتماع کو قیام دین، دعوت الخیر، شہادت الناس، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی جو ذمہ داریاں سونپی ہیں، ریاست اس کی اولین ذمہ دار قرار پائی ہے۔ ریاست دوسرے اجتماعی اداروں کی نگرانی کرتی ہے۔ فرد کی جان ومال، عزت وآبرو، عقل وفہم اور دین واخلاق کی محافظ بن کر رہتی ہے۔ افراد کے تزکیہ اور زندگی کے حصول میں مدد دیتی ہے۔ چنانچہ اسلامی ریاست کی اطاعت اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کا براہ راست تقاضا بلکہ اس کے ہم معنی ہے کیونکہ اللہ کے رسولؐ نے فرمایا:

"جس نے میری اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی اور جس نے امام کی اطاعت کی اس نے میری اطاعت کی اور جس نے میری نافرمانی کی اس نے اللہ کی نافرمانی کی اور جس نے امام کی نافرمانی کی اس نے میری نافرمانی کی"۔

(بخاری، کتاب الاحکام جلد۲ ص)

اسلامی ریاست کے بغیر اسلامی اجتماع کا تصور دشوار ہے۔ اس حیثیت کو نہایت احسن طریق ہے۔ اس حدیث میں یوں بیان کیا گیا ہے۔ فرمایا:

لااسلام الّا بجماعة، ولا جماعة الّا بالامارة
،ولاامارة الّا باطاعة

(مسند دارمی باب فی ذہاب العلم)

"اسلام بغیر جماعت کے کچھ نہیں، جماعت بغیر نظم امارت کے کچھ نہیں اور امارت بے معنی ہے اگر اس کی اطاعت نہ کی جائے۔"

Marfat.com

جب ریاست اللہ کی فرماں بردار ہو تو پھر امیر ریاست کوئی ہو اس کی اطاعت ضروری ہے۔ چنانچہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"سنو اور اطاعت کرو، اگرچہ تمہارے اوپر ایک چھوٹے سر والے حبشی غلام کو امیر مقرر کر دیا جائے"۔ (بخاری، باب السمع والطاعۃ للامام)

جب ریاست کا سربراہ شریعت کے خلاف کام کرے اور حکومت کی پالیسی اسلامی ہدایت سے منحرف ہو تو اس وقت حق بات کہنی چاہیے اور کسی کی پروا نہیں کرنی چاہیے۔ لیکن حکومت پر تنقید اس وقت سخت مشکل ہو جاتی ہے جب ملامت سے آگے بڑھ کر تنقید کی وجہ سے حکام کے ظلم و جور کا نشانہ بننے کا اندیشہ ہو۔ ایسی صورت میں بھی عوام کو تنقید کی تاکید کی گئی اور اسے سب سے بڑا جہاد قرار دیا گیا۔ اسلام کی اسی تعلیم کے پیش نظر سیدنا عمر بن خطابؓ نے اعلان فرمایا تھا:

"لوگو! تم میں سے میرے نزدیک سب سے زیادہ محبوب وہ آدمی ہے۔ جو مجھے میرے عیوب بتلائے"۔ (طبقات ابن سعد جلد ۳ ص ۲۹۲)

شریعت اسلامی ان ہدایات وضوابط کا مجموعہ ہے جو اسلام کے کلی فکر اور اس کے مجموعی مزاج سے ابھرتے ہیں۔ "شریعت کی وضع وترتیب کا شرعی مقصود یہ ہے کہ مکلف کو اپنی خواہشات کی بندگی سے نکالا جائے تاکہ جس طرح وہ اضطراری طور پر اللہ کا بندہ ہے اسی طرح اختیاری طور پر بھی اللہ کا بندہ بن جائے"۔ (الموافقات للشاطبی جلد ۲ ص ۱۶۸)

شریعت کا مقصد اس کے علاوہ یہ بھی ہے کہ انسانی زندگی قائم رہے اور اس کو خوش اسلوبی اور سہولت کے ساتھ گذارا جاسکے۔ دنیا میں اس کو ایسی فلاح نصیب ہو جو آخرت کی فلاح کا پیش خیمہ ثابت ہو۔ مفکرین اسلام اس بات پر متفق ہیں کہ شریعت کا مقصد انسانی مفادات کا تحفظ اور اس کے مصالح کا حصول ہے کیونکہ احکام شریعت کی بنیاد حکمتوں اور مصالح پر رکھی گئی ہے۔ چنانچہ حافظ ابن قیمؒ نے لکھا ہے:

"شریعت کی بنیاد حکمتوں پر رکھی گئی ہے۔ اس میں اصل توجہ معاش اور معاد میں انسانی مصالح کی طرف ہے۔ شریعت سراپا عدل، مجسم رحمت اور سراسر حکمت و مصلحت ہے۔ دنیا اور آخرت دونوں میں فلاح وسعادت اس سے وابستہ ہے"۔
(اعلام الموقعین جلد ۳ ص ۱۰۱)

اسی وجہ سے شریعت اسلامی کا گہرا مطالعہ کرنے والوں نے شریعت کے جملہ احکام کے مطالعہ سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ" وہ بندگان خدا کے مصالح کی خاطر وضع کی گئی ہے"۔ (الموافقات شاطبی، جلد۲ ص ٦) وہ بنیادی مصالح کیا ہیں جن کا تحفظ انسان کی اولین ضرورت ہے؟ وہ بنیادی ضروریات پانچ ہیں:

(۱) دین (۲) جان (۳) نسل (۴) مال اور (۵) عقل

(الموافقات جلد ا ص ۳۸، الاحکام فی اصول الاحکام سیف الدین آمدی جلد ۳ ص ۳۹۴)

انسان کی ان بنیادی ضروریات کے تحفظ کے لیے اقتدار کا ہونا ضروری ہے جو مفاد عامہ کے لیے کام کر کے ان ضروریات کا سختی کے ساتھ تحفظ کروائے اور اس کے لیے قانون وضع کرے۔ اسراف وتبذیر سے پرہیز، اپنے زائد از ضرورت مال سے اہل حاجت کی مدد کرنا یا سامان تجارت کو منصفانہ قیمتوں پر فروخت کرنا۔ عام حالات میں افراد کی اخلاقی ذمہ داری ہے، لیکن اگر ملک کی معیشت کو تنگ حالی کا سامنا ہو، ارباب دولت وثروت سے اہل حاجت کی ضرورتیں پوری نہ ہو رہی ہوں اور اشیاء ضرورت کی قلت کے بغیر صرف نفع اندوزی کی خاطر عوام سے زیادہ قیمتیں وصول کی جا رہی ہوں، تو بنیادی انسانی مصالح کے تحفظ کے لیے ضروری ہو جاتا ہے کہ قانون اور قوت نافذہ کو حرکت میں لایا جائے اور ان ہدایات کی حکماً تعمیل کرائی جائے۔ اس اجمال کی تفصیل کچھ یوں ہے کہ انسان کو مال کے ضائع کرنے کا اختیار نہ دیا جائے کیونکہ مال اللہ تعالیٰ کی امانت ہے اور امین کو امانت کے ضائع کرنے کا اخلاقی اور شرعی طور کوئی حق نہیں۔ وہ مال کو مقاصد حیات کے حصول کا ذریعہ بنائے اور جو کچھ اس منشاء کے خلاف ہوگا وہ اضاعت مال ہے جس کو قرآن حکیم نے "فساد" کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔ (البقرۃ: ۲۰۵) خود سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی احادیث میں "اضاعت مال" سے منع فرمایا۔ (فتح الباری جلد ۱۱ ص ۲۶۲)

سیدنا عمر فاروقؓ نے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کے مطابق اسلامی ریاست کو ایک فلاحی مملکت اس وقت بنایا جب کی پوری دنیا میں نہ تو فلاحی مملکت کو کوئی تصور تھا اور نہ ہی کوئی فلاحی مملکت موجود تھی بلکہ دنیا کی بڑی بڑی حکومتیں ٹیکسوں کے ذریعہ لوگوں کے خون کو چوس کر اپنے امراء اور حکام کے عیش وآرام کے لیے اس کو صرف کرتی تھیں اور خود ان کے عوام فقر و مسکنت کی چکی میں پس رہے ہوتے تھے۔ ایک اسلامی ریاست کی

Marfat.com

سب سے پہلی ذمہ داری کفالت عامہ، معاشی ترقی کا اہتمام اور تقسیم دولت کے اندر پائے جانے والے تفاوت کو کم کرنا ہے۔

کفالت عامہ سے مراد یہ ہے کہ ایک اسلامی ریاست میں رہنے والے ہر شخص کی بنیادی ضروریات زندگی کی تکمیل کا اہتمام کیا جائے۔ ان بنیادی ضرورت میں غذا، لباس، مکان اور علاج شامل ہیں۔ اس تکمیل کی کئی صورتیں ہیں جن کی تفصیل کا یہ موقع نہیں، لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تاکید فرمائی ہے کہ ایک ریاست کی ذمہ داری ہے کہ محروم افراد کی بنیادی ضروریات کی تکمیل کا اہتمام کرے۔ چنانچہ ابو مریم ازدیؓ فرماتے ہیں کہ میں سیدنا معاویہؓ کے پاس گیا۔ انہوں نے مجھے پوچھا: "ابو فلاں! کیسے تشریف لائے؟" میں نے کہا! میں آپ کو ایک فرمان رسولؐ کے بارے میں خبردار کرنے آیا ہوں جسے میں نے سُنا ہے۔ میں نے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو خود یہ فرماتے سُنا ہے کہ

"جسے اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے بعض امور کا نگران بنایا ہے اور وہ ان کی ضروریات اور فقر سے بے پروا ہو کر بیٹھ رہا، اللہ تعالیٰ بھی اس کی ضروریات اور فقر سے بے نیاز ہو جائے گا"۔

سیدنا معاویہؓ نے یہ سُن کر ایک شخص کو عوام کی ضروریات پوری کرنے پر مامور کر دیا۔
(ابوداؤد: باب فیما یلزم الامام من امر الرعیۃ)

ابوعبید نے اپنی کتاب الاموال میں سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک خط نقل کیا ہے جو آپ نے ایک نو مسلم قبیلہ کے سردار زرعہ بن ذی یزن کے نام لکھا تھا۔ آپؐ نے اس خط میں یہ بتایا کہ: "مال کا جو حصہ بطور زکواۃ وصول کیا جائے گا وہ صدر ریاست کے ذاتی مصرف میں نہیں آئے گا بلکہ اہل حاجت اور ضرورت مند لوگوں کو دیا جائے گا اور یہ اطمینان دلایا گیا کہ جو فرد بھی ضرورت یا مصیبت سے پریشان ہوگا خواہ وہ مال دار ہو یا مفلس وقلاش، اللہ کا رسول (اسلامی ریاست کے صدر کی حیثیت سے) سہارا دینے کے لیے موجود ہے"۔

یہ اللہ کے رسول کا سہارا اور رئیس مملکت ہونے کے ناطے ان کی سرپرستی ہی کا تقاضا ہے کہ فتوحات کی وسعت کے بعد جب بیت المال میں کافی مال آنے لگا تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ اعلان فرما دیا کہ جو لوگ مقروض ہوں اور وفات پا جائیں ان کے

Marfat.com

قرضے اسلامی ریاست کے بیت المال سے ادا کیے جائیں گے۔ (کتاب الاموال ص ۲۰۲)
امام بخاریؒ نے بھی اس بارہ میں ایک روایت نقل کی ہے۔ کہ جب اللہ تعالیٰ نے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم پر فتوحات کا دروازہ کھول دیا تو آپؐ نے فرمایا:

"جو مسلمان قرض چھوڑ کر وفات پا جائے اس کے قرض کی ادائیگی میرے ذمہ ہو گی اور جو مال چھوڑ جائے وہ اس کے وارثوں کے لیے ہوگا"۔

(بخاری: باب قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم من ترک کلا اور ضیاعاً فالیّ)

امام ترمذی اور امام ابوداؤد نے بھی اس مضمون کی روایات اپنی کتاب میں نقل کی ہیں۔ نیز امام ابوعبید کی کتاب الاموال ص ۲۳۷ میں حدیث ملاحظہ فرمائیں۔

یہ وہ اصول تھا جو سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے صدر مملکت ہونے کی حیثیت سے بنایا اور اس پر عمل بھی فرمایا، لہذا جو افراد اسلامی ریاست کی صدارت کے منصب پر آپ کے بعد فائز ہوئے انہیں اس بارہ میں اپنی ذمہ داریوں کا پورا شعور تھا بلکہ اسلامی ریاست کے خلیفہ کا مطلب ہی سیدنا سلمان فارسیؓ نے یہ بیان فرمایا ہے کہ:

الذی یقضی بکتاب اللّٰہ ویشفق علیٰ الرعیة
شفقة الرجل علیٰ اهله (کتاب الاموال ص ۶)

"یعنی خلیفہ وہ ہے جو کتاب اللہ کے مطابق فیصلے کرے اور اپنی رعایا پر اس طرح شفقت کرے جس طرح آدمی اپنے اہل وعیال پر شفقت کرتا ہے"۔

عوام کی معاشی ضروریات کی تکمیل کا سیدنا عمر بن خطابؓ کو کتنا خیال تھا اس کا اندازہ اس خطبہ سے کیا جا سکتا ہے۔ جو قادسیہ کی فتح کی خوش خبری سنانے کے بعد آپ نے عوام کے سامنے دیا تھا۔ آپ نے فرمایا:

"مجھے اس بات کی انتہائی فکر رہتی ہے کہ جہاں بھی تمہاری کوئی ضرورت دیکھوں اسے پورا کروں۔ جب تک ہم سب مل کر اسے پورا کرنے کی گنجائش رکھتے ہوں۔ جب ہمارے پاس اتنی گنجائش نہ رہ جائے تو ہم باہمی امداد کے ذریعہ گذر اوقات کریں گے۔ یہاں تک کہ سب کا معیار زندگی ایک سا ہو جائے۔ کاش تم جان سکتے کہ میرے دل میں تمہارا کس قدر خیال ہے، لیکن میں یہ بات تمہیں اپنے عمل کے ذریعہ ہی سمجھا سکتا ہوں۔ خدا کی قسم! میں بادشاہ نہیں ہوں کہ تم

Marfat.com

لوگوں کو اپنا غلام بنا کر رکھوں بلکہ اگر میں اس کو اپنی ذاتی ملکیت نہ سمجھوں بلکہ تمہاری شے سمجھ کر تمہاری طرف واپس کر دوں اور تمہاری خدمت کے لیے تمہارے پیچھے پیچھے چلوں یہاں تک کہ تم گھروں میں سیر ہو کر کھا پی سکو تو تمہارے ذریعہ فلاح پاؤں گا۔ اگر میں اسے اپنا بنا لوں اور تمہیں اپنے پیچھے پیچھے چلنے اور اپنے حقوق کے مطالبہ کے لیے اپنے گھر آنے پر مجبور کر دوں تو تمہارے ذریعے میرا انجام خراب ہوگا۔ دنیا میں کچھ عرصہ میں خوشی منا لوں گا لیکن آخرت میں عرصہ دراز تک غمگین رہوں گا۔ میرا حال یہ ہوگا کہ نہ کوئی مجھ سے کہنے والا ہوگا اور نہ کوئی میری بات کا جواب دے گا کہ میں اپنا کوئی عذر بیان کر کے معافی حاصل کر سکوں"۔ (البدایہ والنہایہ جلد ۷ ص ۴۶)

فلاحی مملکت کے قیام کے لیے یہ ضروری ہے کہ تقسیم دولت کے اندر پائے جانے والے تفاوت کو کم کیا جائے۔ چنانچہ اسلامی فلاحی مملکت کی معاشی پالیسی کا ایک راہ نما اصول یہ بھی ہے کہ معاشرہ میں تقسیم دولت کے اندر جو تفاوت پایا جاتا ہے وہ کم سے کم ہو اور دولت کسی ایک طبقہ کے اندر مرتکز ہو کر نہ رہ جائے بلکہ پورے سماج میں اس کی گردش ہو جیسے خون پورے جسم میں گردش کرتا ہے۔ انہی اصولوں کو قرآن حکیم کے ایک جملہ نے واضح فرما دیا:

کے لایکون دولة بین الاغنیاء منکم (الحشر: ۷)

"تا کہ ایسا نہ ہو کہ دولت تمہارے صاحب ثروت لوگوں کے درمیان ہی چکر کھاتی رہ جائے"

صاحب ثروت لوگوں کے درمیان گردش کو روکنے کے لیے اسلام نے نظام زکوٰۃ نافذ کیا۔ اس سے بھی یہ تفاوت کم ہوتا ہے اور دولت مندوں کے مال کا ایک حصہ غرباء اور فقراء کی طرف منتقل ہوتا رہتا ہے۔ (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو احقر کی کتاب "اسلام کا نظام زکوٰۃ) لیکن اسلامی ریاست کی طرف سے بھی اس بارہ میں بہت کچھ کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ تقسیم دولت کی مساوات کی ہی یہ پالیسی تھی کہ سیدنا عمرؓ نے اپنے عہد خلافت میں عراق اور شام کی مفتوحہ زمینوں کو فوجیوں کے درمیان تقسیم نہ کیا (کتاب الاموال ص ۵۹، فتوح البلدان، بلاذری ص ۱۵۶) جب مصر فتح ہوا تو وہاں کی زمینوں اور عمارتوں کے بارہ

Marfat.com

میں بھی سیدنا عمرؒ نے یہی پالیسی اختیار کی۔

(کتاب الاموال لابی عبید ص ۵۸، فتوح مصر عبدالحکم ص ۸۲، ص ۸۸)

آپ نے آٹھ سال تک اس قسم کی کئی پالیسیاں اختیار کیں لیکن پھر اپنے دور خلافت کے آخری سال اپنی رائے تبدیل کی، چنانچہ آپ کے غلام اسلم فرماتے ہیں کہ:

"میں نے سیدنا عمرؒ کو فرماتے سنا ہے کہ اگر میں آئندہ سال اس موقع تک زندہ رہا تو تقسیم مال میں آخر کے لوگوں کو سرفہرست لوگوں سے ملا دوں گا تاکہ سب برابر ہو جائیں"۔ (کتاب الاموال ص ۲۶۳)

اسی روایت کو طبقات میں ان الفاظ میں نقل کیا گیا ہے۔

"میں نے سیدنا عمر بن خطابؓ کو یہ کہتے سُنا کہ خدا کی قسم اگر میں اگلے سال اس موقع پر زندہ رہا تو آخر کے لوگوں کو شروع کے لوگوں سے ملا دوں گا اور ان سب کو حصے کے اعتبار سے ایک جیسا کر دوں گا"۔

(طبقات ابن سعد جلد ۳ ص ۳۰۱)

ابن حزم کی ایک روایت سے یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ آپ امراء کی فاضل دولت لے کر اسے فقراء اور مہاجرین کے درمیان تقسیم کر دینا چاہتے تھے۔

(محلّٰی لابن حزم جلد ۶ ص ۱۵۸)

تاریخ کے اوراق اس بات کی شہادت دیتے ہیں کہ جب بھی مسلمان حکمرانوں نے اسلامی ہدایات کو اپنا راہ نما بنایا تو انہوں نے اپنی ذمہ داری کو محسوس کیا اور اس کو ملک میں رائج کیا، کیونکہ کفالت عامہ کی ذمہ داری ایک بہت بڑی ذمہ داری ہے۔ چنانچہ جب سیدنا عمر بن خطابؓ کے ہم نام اور عزیز سیدنا عمر بن عبدالعزیزؒ خلیفہ ہوئے تو آپ نے کفالت عامہ کی ذمہ داری کی گراں باری کو پوری طرح محسوس کیا اور رونے لگے۔ آپ کی اہلیہ محترمہ فرماتی ہیں کہ میں ایک رات آپ کے پاس گئی۔ آپ اپنے مصلّٰی پر تھے اور زار و قطار رو رہے تھے۔ آپ کی ڈاڑھی آنسوؤں سے تر تھی۔ میں نے پوچھا: کیا کوئی نئی بات ہو گئی۔ آپ نے روتے ہوئے فرمایا:

"امت محمدیہ کی پوری ذمہ داری میرے کندھوں پر ہے۔ لہذا میں بھوکے فقیر، بے سہارا مریضوں، مجاہدین، مظلوم اور ستم رسیدہ افراد، غریب الدیار

Marfat.com

قیدیوں، بوڑھے اور نحیف و ناتواں افراد اور ان لوگوں کے بارہ میں سوچ رہا تھا جو بکثرت اہل وعیال والے ہیں، لیکن مال دار نہیں ہیں اور مختلف علاقوں میں بسنے والے اسی قسم کے دوسرے افراد کے بارہ میں متفکر تھا۔ مجھے احساس ہوا کہ عنقریب قیامت کے روز مجھ سے ان کے بارہ میں پوچھا جائے گا اور اللہ کے حضور میرے مقابلہ میں ان لوگوں کے وکیل محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہوں گے۔ (فعلمت ان ربی سیسألنی عنهم یوم القیامة وان خصمنی دونهم محمد صلی الله علیه وسلم) مجھے ڈر لگا کہ جرح میں میری بات ثابت نہ ہو سکے گی تو میں اپنی جان پر ترس کھا کر رونے لگا"۔

(ابن اثیر جلد ۵ ص ۳۴، کتاب الخراج لابی یوسف ص ۱۰، سیرۃ عمر بن عبدالعزیز لابن جوزی ص ۱۸۹، سیرت عمر بن عبدالعزیز لابن عبدالحکم ص ۱۷۸)

نہ صرف یہ کہ آپ کو اپنی ان وسیع ذمہ داریوں کا پورا پورا شعور تھا بلکہ آپ نے واضح طور پر اعلان کر رکھا تھا کہ:

"تم میں سے جس کی بھی کسی ضرورت کا مجھے علم ہو گا اس کو وہ ضرورت پوری کرنے کی میں حتی الامکان پوری پوری کوشش کروں گا"۔

(سیرۃ عمر بن عبدالعزیز لابن الحکم ص ۴۱)

اور تاریخ کے رپورٹر بتاتے ہیں کہ انہوں نے ان کی وہ سب ضرورتیں پوری کیں، لیکن اپنی ضرورتیں پوری نہ کر سکے۔ خود ان کے اپنے بچے بھوکے رہتے لیکن دوسروں کے بچوں کو پیٹ بھر کر کھانا کھلایا۔ عید کے روز ان کے بچے پرانے کپڑے پہنتے تھے، لیکن دوسرے بچوں کو انہوں نے نئے کپڑے پہنائے۔

آپ کے زمانے میں ایک مرتبہ زبردست قحط پڑا تو عرب کے کچھ لوگ ایک وفد کی شکل میں آپ کے پاس آئے۔ انہوں نے آپ سے گفتگو کرنے کے لیے ایک شخص منتخب کیا۔ اس نے آپ سے کہا:

"اے امیر المومنین! ہم ایک شدید ضرورت کی وجہ سے آپ کے پاس حاضر ہوئے ہیں۔ ہمارے جسم کی چمڑی سوکھ گئی ہے، کیونکہ اب ہڈیاں بھی میسر نہیں آتیں اور ہماری مشکل کا حل صرف بیت المال کے ذریعہ ممکن ہے۔ اس مال کی

Marfat.com

حیثیت تین میں سے ایک ہوسکتی ہے یاتو خدا کے لیے ہے یا بندوں کے لیے یا پھر آپ کے لیے۔ خدا کو اس کی ضرورت نہیں۔ اگر بندگان خدا کے لیے ہے تو اسے انہیں دے دیجئے۔ اگر آپ کا ہے تو صدقہ کے طور پر ہمیں دے دیجئے۔ اللہ تعالیٰ صدقہ کرنے والوں کو جزائے خیر دے گا''۔

یہ سن کر آپ کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں اور حکم دیا کہ ان لوگوں کی تمام ضروریات بیت المال سے پوری کی جائیں۔

(البرالمسبوک فی نصائح الملوک ص ۶۱)

آپ کے سوانح نگاروں نے لکھا ہے کہ جب بھی کوئی ضرورت مند آپ کے پاس آیا آپ نے اس کی ضرورت پوری کرنے کا اہتمام فرمایا۔

(سیرۃ عمر بن عبدالعزیز ابن جوزی ص ۵۶)

آپ کو اس کی بڑی فکر رہتی تھی کہ رعایا فقر و فاقہ سے نجات پا جائے۔ چنانچہ ایک دفعہ ایک شخص مدینہ طیبہ سے آپ کے پاس آیا۔ آپ نے اس سے پوچھا کہ فلاں مقام پر جو فقیر بیٹھا کرتے تھے ان کا کیا حال ہے؟ اس نے بتایا کہ وہ لوگ اب وہاں نہیں بیٹھتے۔ اللہ نے ان کو وہاں بیٹھنے سے بے نیاز کر دیا ہے۔

(سیرۃ عمر بن عبدالعزیز لابن جوزی ص ۷۶)

مملکت اسلامیہ کی ان گراں بار ذمہ داریوں کے باردوش سے سبک دوش ہونے کے لے آپ دن رات متفکر رہتے۔ اسی فکر میں ان کا انتقال ہوا اور ان کی اہلیہ محترمہ اور دوسرے لوگوں کا بیان ہے کہ ان کے جسم پر گوشت کے بجائے صرف ہڈیاں نظر آتی تھیں۔

میں سمجھتا ہوں کہ عمر بن عبدالعزیزؒ کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے اپنے جسم کا گوشت سکھا کر اور شبانہ روز کوشش کر کے بیت المال کو پھر مسلمانوں کی مشترکہ امانت بنا دیا۔ ان سے پہلے بیت المال کا روپیہ بڑے بڑے لوگوں کی جائز وناجائز ضروریات پر خرچ ہوتا تھا، لیکن آپ نے اس کا کل اندوختہ پبلک کی ضرورت کے لیے وقف کر دیا۔ ان کی آمدنی کا بڑا حصہ خالص رعایا کے مفاد کے کاموں میں صرف کیا جاتا تھا۔ ملک میں جتنے اپاہج اور معذور اشخاص تھے ان سب کے نام رجسٹر میں درج تھے۔ ان سب کو گذراوقات کے لیے حکومت کی طرف سے وظیفہ ملتا تھا۔ (الاصابہ جلد ۵ ص ۸۰) جو

Marfat.com

عمال اور کارکنان حکومت اس بارہ میں ذرا بھی غفلت سے کام لیتے تھے ان کی گوش مالی کی جاتی تھی، لہذا ہر کارکن بڑے محتاط طریقے سے ان معاملات کو سرانجام دیتا تھا۔ ابن سعد نے لکھا ہے کہ "دمشق کے بیت المال سے ایک اپاہج شخص کے وظیفہ کے سلسلہ میں میموان ابن مہران نے کہا کہ ان لوگوں کے ساتھ حسن سلوک تو کیا جا سکتا ہے۔ لیکن انہیں صحیح اور تندرست آدمی کے برابر وظیفہ نہیں دیا جا سکتا۔ کسی طریقہ سے سیدنا عمر بن عبدالعزیزؒ کو اس بارہ میں اطلاع مل گئی تو انہوں نے نہایت عتاب آمیز خط لکھا جس سے اس کے ہوش ٹھکانے آ گئے۔ (طبقات ابن سعد جلد ۵ ص ۲۸۱)

عمر بن عبدالعزیزؒ نے وظیفہ کا ایک طریقہ یہ اختیار کیا کہ اکثر لوگوں کو نقد روپیہ کے بجائے جنس وظیفہ میں دیتے تھے۔ چنانچہ بعض لوگوں کو فی کس ساڑھے چار ارب کے حساب سے غلہ ملتا تھا۔ (ابن سعد جلد ۵ ص ۲۵۵) قرض داروں کے قرض کی ادائیگی کا بھی بیت المال میں ایک حصہ رکھا ہوا تھا۔ (ابن سعد جلد ۵ ص ۲۵۷) علاوہ ازیں سیدنا عمر بن الخطابؓ کی طرح شیر خوار بچوں کے لیے وظائف مقرر فرمائے۔ (ایضاً) ایک عام لنگر خانہ بھی تھا جس سے فقرا اور مساکین کو کھانا بھی ملتا تھا۔ (ابن سعد جلد ۵، ص ۲۷۹)

عام مستحقین کو صدقات اور خیرات کی رقم تقسیم ہوتی تھی۔ چنانچہ ایک دفعہ آپ نے ایک شخص کو تقسیم مال کے لیے رقہ بھیجا۔ اس نے وہاں جانے سے عذر کیا کہ آپ مجھے ایسی جگہ بھیج رہے ہیں جہاں میں کسی کو نہیں پہچانتا۔ وہاں امیر و غریب سب ہیں۔ مجھے کیا پتہ کہ صدقات و خیرات کا مستحق کون ہے۔ آپ نے فرمایا کہ جو شخص تمہارے سامنے ہاتھ پھیلائے اسے دو۔ وہ یقیناً مستحق ہو گا۔ (زرقانی شرح موطاء جلد ۴ ص ۲۳۷) اس سے یہ بھی پتہ چلا کہ اس زمانہ میں غیر مستحق ہاتھ نہیں پھیلاتا تھا۔

ان مصارف کے علاوہ اور بھی بیت المال کے جو مفید مصارف تھے۔ آپ بے دریغ ان نیک مصارف میں قومی خزانہ صرف کرتے۔ اس فیاضانہ داد و دہش سے قومی خزانہ پر بہت بار پڑا۔ آمدن کم اور خرچ زیادہ ہو گیا۔ اس بارہ میں بعض گورنروں نے آپ کو توجہ بھی دلائی تو آپ نے فرمایا: "جب تک ہے دیتے چلے جاؤ"۔

(سیرۃ عمر بن عبدالعزیز لابن جوزی ص ۸۵)

بیت المال کا جو تصور اسلام نے دیا ہے۔ وہ دنیا کے کسی اور مذہب نے نہیں دیا۔

Marfat.com

خلفائے راشدین کے زمانہ میں بیت المال کا جو تصور تھا وہ بعد کے زمانوں میں نہیں رہا۔ سیدنا فاروق اعظمؓ کے عہد خلافت میں خلیفہ کا حق بیت المال پر صرف دو درہم کا تھا لیکن بعد کے زمانوں کے خلفاء سارے بیت المال کو اپنے باپ دادا کی ملکیت سمجھنے لگے اور اسے اپنی ذاتی ملکیت سمجھتے ہوئے اپنے آپ پر اور اپنے چہیتوں پر بے دریغ خرچ کرتے تھے۔ عمر بن عبدالعزیزؒ نے حکومت کو بیت المال کا صحیح اسلامی تصور دیا، چنانچہ انہوں نے بیت المال کا اپنے کو کسٹوڈین سمجھا اور بیت المال کو ہاتھ تک نہ لگایا بلکہ اس سے بالکل مستغنی رہے۔

ان کے نزدیک بیت المال میں صرف اس کے حق دار کا حصہ تھا خود امیر المومنین کا بھی اس میں کوئی حصہ نہ تھا۔ چنانچہ وہب بن منبہ ایک متقی پرہیز گار اور اللہ والے بزرگ تھے۔ آپ نے بیت المال کے سلسلہ میں ان کے ساتھ بھی وہ برتاؤ کیا جو ایک خلیفہ راشد کو کرنا چاہیے تھا۔ ہوا یہ کہ آپ بیت المال کے منتظم تھے اور بیت المال کی کچھ رقم کم ہوگئی۔ آپ نے عمر بن عبدالعزیزؒ کو لکھا کہ بیت المال میں ایک دینار (اور دوسری روایت کے مطابق چند دینار) کم ہیں۔ عمرؒ نے ان کو جواب میں لکھا: میں آپ کو متہم نہیں کرتا۔ مجھ سے اس مال کے بارہ میں مسلمان جھگڑا کرنے والے ہیں۔ جتنے دینار کم ہیں براہ نوازش اتنے بیت المال میں جمع کر دیں۔ چنانچہ وہب بن منبہ نے اتنے دینار اپنی جیب سے اس میں جمع کر دیے۔ (سیر ابن جوزی ص ۸۷)

اسی طرح ایک اور واقعہ تاریخ کے اوراق میں آپ کی دیانت و امانت کے بارہ میں ملتا ہے کہ ایک مرتبہ آپ کے بیٹے نے درخواست کی کہ بیت المال میں سے مجھے میری شادی کا خرچہ دے دیا جائے۔ آپ سے قبل خلفاء کے بیٹے اپنی شادی کا خرچہ بیت المال ہی سے کرتے تھے۔ آپ نے اپنے بیٹے کی اس عرض داشت کو مسترد کر دیا حالانکہ آپ کی واضح ہدایات تھیں کہ بیت المال سے نادار اور قلاش لوگوں کی شادیاں کروا دی جائیں۔ آپ کا وہ بیٹا نادار بھی تھا اور قلاش بھی۔ اگرچہ وہ خلیفہ کا بیٹا تھا لیکن خلیفہ خود نادار تھا۔ آپ نے بیٹے کے نادار ہونے کے باوجود اس کی درخواست مسترد کر دی کیونکہ اس کی ایک بیوی پہلے سے موجود تھی۔ عمرؒ نے نہ صرف اس کی درخواست کو مسترد کیا بلکہ ناراض ہو کر اسے لکھا:

"خط تمہارا موصول ہوا۔ اس میں مرقوم ہے کہ میں مسلمانوں کے مال سے سو

Marfat.com

کنوں کو جمع کر دوں حالانکہ مہاجرین کے بیٹوں میں سے کسی کے پاس ایک بیوی بھی نہیں کہ وہ اس کے ذریعہ عفیف اور پاک دامن رہے۔ خبردار! آئندہ مجھے اس قسم کی کوئی درخواست نہ کرنا۔ گھر کے برتن اور دوسرا سامان فروخت کر کے شادی کر لو۔"

ایک طرف تو اپنے بیٹے کو عمرؒ نے یہ لکھا اور دوسری طرف کوفہ کے گورنر کو یہ لکھا کہ تم نے لکھا ہے کہ فوجیوں کو مدد دینے کے بعد تمہارے پاس بیت المال میں رقم بچ گئی ہے، لہٰذا یہ بچی ہوئی رقم اسے دے دو جس پر واجبی قرض ہے یا پھر اس کو دے دو جس نے نکاح کر لیا ہو مگر اس کے پاس گھر کے اخراجات چلانے کے لیے نقد روپیہ نہ ہو۔

(سیرین ابن عبدالحکم ص ۲۷)

یہ وہ خلیفہ تھے کہ انہوں نے اپنی اولاد کو بیت المال سے ہر قسم کا فائدہ اٹھانے اور غلاموں اور جانوروں سے انتفاع حاصل کرنے سے ایک قلم محروم رکھا۔ انہوں نے اپنے جد امجد سیدنا فاروق اعظمؓ کی روش اور طریقہ پر چل کر اپنی ذاتی ضرورتوں کے لیے ذاتی چراغ جلایا اور جو پانی موسم سرما میں وضو کے لیے گرم کرتے تھے اور جو پھل وغیرہ وہ کبھی کھاتے تھے اس پر اپنا ذاتی پیسہ خرچ کرتے تھے یہاں تک کہ بیت المال کا عنبر جب تقسیم کیا جاتا تو اس کو کاٹتے وقت اس کی جو خوشبو پھیلتی، اس کو نہ سونگھنے کے لیے اپنا ناک بند کر لیا کرتے تھے اور اگر آپ کے پاس سرکاری سواری پر کوئی ہدیہ بھیجا جاتا تو اسے فروخت کر کے اس کی قیمت سرکاری جانوروں کو چارہ کھلانے میں صرف کر دیتے تھے۔ (سیرۃ ابن جوزی ص ۱۱۱، سیرۃ ابن عبدالحکم ص ۵۲، محاسن السلوک لمحمد تمیم ص ۷۸) اس خلیفہ نے اپنے خواص کو بھی یہ اختیار نہ دیا تھا کہ وہ سرکاری مال یا غلام یا جانور کو اپنی ذات کے لیے استعمال کر لے۔ چنانچہ ایک دفعہ ایک غلام نے ایک شخص کو سرکاری گھوڑے پر آپ کی اجازت کے بغیر سوار کر دیا۔ پہلے خلفاء کے لیے یہ ایک معمولی بات تھی اور اکثر وہ سرکاری سواریوں اور غلاموں کو اپنے ذاتی کاموں میں استعمال کرتے، لیکن عمر بن عبدالعزیزؒ نے اس کو بلا کر فرمایا:

"جب تک اس کا کرایہ بیت المال میں جمع نہیں کرائے گا اپنی جگہ سے ہل نہیں سکے گا۔"

چنانچہ اس نے اس کا کرایہ بیت المال میں جمع کرا دیا۔ (کتاب الخراج ابی یوسف ص ۱۸۶)

عمر بن عبدالعزیزؒ کے نزدیک بیت المال میں سب مسلمانوں کا حق تھا اور ہر شخص

Marfat.com

اس میں سے اپنے حق کے مطابق لے سکتا تھا ان کی خواہش تھی کہ مستحق لوگ بیت المال میں سے اپنا حق جو بنتا ہے وہ پورا پورا لیں اور کوئی شخص ان کو ان کے حق سے محروم نہ کرے۔ ان کے نزدیک سرکاری مہمان خانہ بھی حکومت کے بیت المال سے چلنا چاہیے چنانچہ انہوں نے ایک سرکاری مہمان خانہ بھی قائم کیا کیونکہ آپ کے والد عبدالعزیزؒ نے جب وہ مصر کے گورنر تھے، ایک سرکاری مہمان خانہ قائم کیا تھا، چنانچہ عمرؒ نے بھی بیت المال میں مسافروں کا ایک حصہ مقرر کیا تھا۔ آپ کے نزدیک قرض داروں کے لیے بھی بیت المال میں حصہ مقرر تھا جن سے ان کے قرضوں کی ادائیگی ہوتی تھی۔ پھر ان کے نزدیک قرض دار کی جو تعریف تھی وہ دوسرے لوگوں سے مختلف تھی۔ چنانچہ ایک مرتبہ آپ نے اپنے گورنر کو لکھا کہ قرض داروں کے قرض بیت المال سے ادا کیے جائیں۔ گورنروں نے آپ کو لکھا کہ ہم دیکھتے ہیں کہ ایک شخص کے پاس گھر، گھریلو سامان، نوکر اور گھوڑا موجود ہے، لیکن اس سب چیزوں کے باوجود اس پر قرض بھی ہے، کیا اس شخص کا قرض بھی بیت المال سے اتار دیا جائے؟ آپ نے ان کے جواب میں لکھا: ''مسلمانوں کے لیے ایک گھر کا ہونا ضروری ہے تاکہ وہ اپنا اور اپنے بال بچوں کا سر چھپا سکے اور اس کے لیے ایک خادم کا ہونا بھی ضروری ہے جو اندرون خانہ اور بیرون خانہ اس کا ہاتھ بٹا سکے اور گھوڑے کا ہونا بھی ضروری ہے جو اس کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جا سکے اور گھریلو سامان کا ہونا بھی ضروری ہے تاکہ وہ اچھے طریقے سے اپنے گھر کو چلا سکے۔ ان اشیاء کے باوجود اس شخص کا شمار قرض داروں میں ہے اگر اس کے ذمہ کچھ قرض ہے، اس لیے اس شخص کا قرض اتار دیا جائے۔

(سیرۃ ابن عبدالحکم ص ۲۷۰)

سیدنا عمر بن عبدالعزیزؒ کے نزدیک بیت المال درہم و دینار جمع کرنے کا مکان نہیں کہ درہم و دینار اور سونا چاندی اس میں جمع ہو کر ایک منجمد پہاڑ بن جائیں اور ان سے سیراب کرنے والا سیلاب جاری نہ ہو۔ آپ کے خیال میں بیت المال میں مال جمع کرنے کی ضرورت ہی نہ تھی بلکہ اس مال سے رعایا کی ضرورتوں کو پورا کیا جائے۔ آپ کے بیت المال کے اس نظریے اور تصور نے بیت المال کے محافظین کو پریشان کر دیا کیونکہ ان کا نظریہ اس کے بالکل برعکس تھا۔ ان کے ہاں بیت المال کا تصور یہ تھا کہ اس میں مال جمع کیا جائے اور وہ پھر خرچ نہ ہو بلکہ جمع ہی رہے جیسا کہ آج کے وزیراعظموں اور صدروں کا

Marfat.com

نظریہ ہے۔ چنانچہ آپ اکثر و بیشتر اپنے گورنروں کو یہ لکھتے رہتے کہ بیت المال کو لوگوں کی ضروریات میں خرچ کیا جائے اور اگر کوئی گورنر آپ کو لکھتا کہ آپ نے بیت المال کو نقصان پہنچایا ہے تو عمرؒ اس کو جواب میں لکھتے کہ جو کچھ بیت المال میں ہے اس کو خرچ کرتے، ہو پھر جب اس میں کچھ باقی نہ رہے تو اس کو کپڑے سے بھر دو۔ (سیرۃ ابن جوزی ص ۵۸)

اسلامی مملکت میں بلکہ ہر حکومت میں کچھ شہر مالدار ہوتے ہیں اور کچھ نادار۔ اس بارہ میں آپ کا نظریہ یہ تھا کہ مالدار شہر نادار شہر کی ضروریات کو پورا کرے اگرچہ مالدار شہر کے پاس کچھ باقی نہ بچے۔ چنانچہ جب آپ نے مغصوبہ جاگیریں اور جائدادیں واپس دلوائیں تو عراق کا مال ختم ہوگیا۔ آپ نے حکم فرمایا کہ اب شام عراق کی ضروریات کو پورا کرے۔ آپ کی یہ پالیسی نہایت اچھی تھی اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس زمانہ میں مملکت اسلامیہ ایک طاقتور اور اپنے پاؤں پر کھڑی ہونے والی اکائی بن گئی اور اس کا کوئی شہر ایسا نہ تھا جو نادار اور غریب ہو۔ اور اگر کسی شہر میں ناداری اور غریبی کا سایہ پڑ جاتا تو دوسرے مالدار شہر اس نادار شہر کی مدد کے لیے پہنچ جاتے اور اس کی ضروریات نہایت احسن طریق سے پوری کرتے۔

اس زمانے میں بیت المال ایک ٹکسال کا کام بھی کرتا یعنی اس میں درہم و دینار ڈھالے جاتے تھے اور وہ درہم و دینار واپس لے لیے جاتے جو پرانے ہو جایا کرتے تھے اور نئے ان لوگوں کو سپلائی کیے جاتے۔ (سیرۃ ابن جوزی ص ۹۰، سیرۃ ابن عبدالحکم ص ۲۷۱) افسوس کہ آج پاکستان میں جو نوٹ گردش کر رہے ہیں وہ اس قدر خراب ہوتے ہیں کہ بعض دفعہ کوئی دکاندار ان خراب، غلیظ اور پھٹے پرانے نوٹوں کو لینے کے لیے تیار نہیں ہوتا لیکن ہمارے بنک باوجود اس بات کے کہ ان کے پاس نئے نوٹوں کے انبار لگے ہوئے ہیں، ان پرانے نوٹوں کو تبدیل نہیں کرتے۔ یہ اس جمہوری دور کی بات ہے لیکن اس خلفائی دور میں پرانے درہم و دینار بھی تبدیل ہوتے تھے تاکہ تجارت کو فروغ حاصل ہو اور لوگوں کو نقصان نہ ہو۔

مختصر یہ کہ سیدنا عمرؒ بن عبدالعزیز نے قومی خزانہ کو قوم کے لیے وقف کر دیا اور ملت اسلامیہ کے مساکین، فقراء، ناداروں، مسافروں اور دوسرے مستحقین کے لیے بیت المال کے دروازے کھول دیے۔ ان کے وظائف جاری کیے اور بالغوں اور نابالغوں کے

Marfat.com

وظائف میں فرق رکھا۔ آپ نے اپنے گورنروں کو لکھا کہ پندرہ سال کا بچہ بالغ ہے اور اس سے کم عمر نابالغ کے حکم میں آتا ہے۔ (کتاب الخراج لابی یوسف ص ۱۷۵) اور اس طریقہ سے بیت المال کے مصرف میں جس قدر خرابیاں پیدا ہو چکی تھیں۔ اس کو آہستہ آہستہ ختم کیا حالانکہ آپ کے فرزند عبدالملک ان پر زور دیتے تھے کہ اصلاح کے احکام کو جلدی نافذ کریں اور آپ ان کو ایک بات کہتے تھے کہ بیٹا! جلدی نہ کرو کیونکہ خرابیاں بہت زیادہ ہیں۔ اگر ان کو جلدی سے رفع کرنے کی کوشش کی گئی تو فتنہ پیدا ہونے کا خطرہ ہے۔ خود اللہ تعالیٰ نے بھی شراب کی دو دفعہ مذمت کی اور پھر تیسری دفعہ اس کو حرام قرار دیا۔

(العقد الفرید جلد۴ ص ۴۳۸، الموافقات جلد۲ ص ۹۴)

سیدنا عمر بن عبدالعزیزؒ نے سرکاری بیت المال کا کچھ ایسا انتظام کیا کہ بیت المال میں خود بخود مال آتا تھا اور آپ اس کو دونوں ہاتھوں سے لوگوں میں خرچ کرتے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ خوشحال ہو گئے۔ مغصوبہ جائدادیں اور اموال واپس دلانے کے بعد جب آپ نے اپنی پوری توجہ غرباء اور مساکین میں مال تقسیم کرنے کی طرف کی تو متمول لوگوں نے زکوٰۃ اور صدقات ادا کرنے میں پیش قدمی کرنی شروع کر دی۔ چنانچہ بیت المال کے لیے مال جمع کرنے والے ان سے بہت سا مال اکٹھا کر کے لائے اور انہیں فقراء اور مساکین میں بانٹ دیا کیونکہ خود امیر المومنین عمرؒ اور ان کے عمال یہ سمجھنے لگے تھے کہ اس زکوٰۃ سے کیا فائدہ جو وقت پر غریبوں اور ناداروں کے ہاتھوں میں نہ پہنچے تاکہ وہ اپنی ضروریات کو پورا کر سکیں۔ امیر المومنین کے حکم کے مطابق اگر حکام کو زکوٰۃ کا روپیہ تقسیم کرنے کے لیے منتظم بنایا جاتا تو انہیں اس تقسیم میں تاخیر کی اجازت نہ تھی اور اگر وہ تاخیر کرتے تو ان سے اس بارہ میں باز پرس ہوتی۔ چنانچہ وہ زکوٰۃ تقسیم کرنے میں کوئی تاخیر نہ برتتے۔ عیدالفطر کے موقع پر ایک شخص بہت سی زکوٰۃ لایا اور عمر بن عبدالعزیزؒ کے مشورہ کے لیے اس نے اس کو روکے رکھا اور تقسیم نہ کیا۔ عمرؒ نے لکھا: بخدا! لوگوں نے مجھے اور تمہیں اپنے خیالات اور گمانوں کے مطابق نہیں پایا۔ آج تک تم نے اسے کیوں روکے رکھا؟ میرا یہ خط موصول ہوتے ہی فوراً اس کو مستحق لوگوں میں تقسیم کر دو۔

اسی طرح صدقہ فطر کے بارہ میں بھی بارگاہ خلافت سے یہی حکم تھا کہ اپنے اپنے علاقہ کے لوگوں سے صدقہ فطر وصول کرو۔ اور یہ صدقہ نہ آزاد سے معاف کیا جائے اور نہ

Marfat.com

غلام سے، نہ چھوٹے اور نہ بڑے سے، اور نہ مرد اور نہ عورت سے۔ ہر شخص سے گیہوں سے آدھا صاع اور کھجوروں کا ایک صاع وصول کیا جائے۔ اس کا طریقہ یہ تھا کہ مالداروں کے ہر قبیلے سے دو شخص ایسے چنے جاتے جو دیانت دار اور امین ہوتے تھے اور ان کو حاکم شہر منتخب کرتا تھا۔ وہ جمع کی ہوئی زکوٰۃ کو شہر لے جا کر شہریوں میں تقسیم کرتے تھے۔ دیہاتی اس سے مستغنی اور بے نیاز تھے کیونکہ ان میں کوئی مفلس نہیں ہوتا تھا۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا کہ محصل زکوٰۃ وصول کرتا اور اسی وقت ان کے فقراء اور مساکین کو جمع کر کے ان میں وہ تقسیم کر دیتا۔ اس سے ہر شخص خوش حال اور مالدار ہو گیا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جب آئندہ سال فقراء اور مساکین کو زکوٰۃ و صدقات لینے کے لیے بلایا جاتا تو صدقات قبول کرنے کے لیے کوئی فقیر و مسکین نہ ملتا تھا۔ چنانچہ سیدنا عمر بن عبدالعزیزؒ کے ڈھائی سالہ دور خلافت میں حالت یہ ہو گئی تھی کہ اگر ایک شخص مال کثیر لے کر آتا اور کہتا کہ یہ مال مستحق فقراء اور مساکین میں تقسیم کر دو تو کوئی فقیر نہ ملتا اور مجبوراً اسے اپنا مال واپس لے کر لوٹنا پڑتا کیونکہ عمر بن عبدالعزیزؒ نے لوگوں کو خوش حال اور مال دار بنا دیا تھا۔ چنانچہ یحییٰ بن سعید بتاتے ہیں کہ عمر بن عبدالعزیزؒ نے ایک مرتبہ مجھے صدقہ وصول کرنے کے لیے افریقہ بھیجا۔ میں نے صدقہ وصول کر کے فقراء اور مساکین کو تلاش کیا تو مجھے وہاں کوئی بھی مستحق زکوٰۃ نہ ملا۔ آخرکار میں نے اس مال سے غلام خرید کر انہیں آزاد کر دیا اور ان کی ولاء مسلمانوں کو ملی۔ (سیرۃ ابن جوزی ص ۸۵، ص ۸۷، سیرۃ ابن عبدالحکم ص ۶۹، ص ۱۲۸، العقد الفرید جلد ۴ ص ۴۳۶)

غیر مسلموں سے برتاؤ

ایک اسلامی ریاست میں غیر مسلموں سے اسی طرح سلوک کیا جاتا ہے جیسا کہ مسلمانوں کے ساتھ اور جس طرح ایک مسلمان کے خون کا قصاص ہے یا اس کے اعضائے بدن کے عوض اعضائے بدن کا قصاص ہے ویسا ہی ایک ذمی کے قاتل سے قصاص لیا جاتا ہے اور ایک "مستامن" کے قاتل سے بھی وہی قصاص لیا جائے گا۔ (مستامن وہ ہے جو غیر اسلامی ملک میں رہتا ہے لیکن امن لے کر اسلامی ریاست میں آ کر آباد ہوا اور ذمی بن گیا) بلکہ بعض لحاظ سے ایک ذمی کے حقوق ایک مسلمان سے بھی اسلامی ریاست میں زیادہ ہیں جو اموال یا اشیاء مسلمانوں کو رکھنا حرام ہیں بلکہ تلف کرنا ضروری ہے۔ اگر وہ اشیاء تلف کر

دی گئیں تو ان پر کوئی ضمان نہیں، لیکن اگر وہ اشیاء ایک ذمی کی ملکیت میں ہوں اور کوئی مسلمان اسے تلف اور ضائع کر دے تو اس مسلمان کے ذمہ ضمان واجب ہے۔ چنانچہ اگر کوئی مسلمان کسی غیر مسلم کی شراب یا خنزیر کے گوشت کو تلف کر دے تو اس پر ضمان واجب ہے۔ (کمافی درالمختار)

یہ تو ایک ذمی کی جان اور مال کا حال ہے۔ اسلام نے اس کی ننگ و ناموس کا بھی اسی طرح تحفظ کیا ہے جیسا کہ ایک مسلمان کی عزت و آبرو کا تحفظ کیا ہے، چنانچہ کسی ذمی کی آبروریزی اہانت اور تذلیل خواہ قول سے ہو یا اشارہ و کنایہ سے ہو، سامنے ہو یا اس کی غیبت میں، قطعاً حرام ہے یہاں تک کہ ذمی کی غیبت کرنا بھی حرام ہے۔ گویا کہ اسلامی ریاست میں ایک مسلمان اور ذمی کے حقوق میں کوئی فرق نہیں ہے اور اس کو بھی وہ تمام تحفظات حاصل ہیں جو ایک مسلمان کو حاصل ہیں۔ چنانچہ شرح شرعۃ الاسلام ص ۲۸ جلد ۲ میں ہے کہ:

"رعیت کے تمام انواع و اصناف میں مساوات کو ملحوظ رکھا جائے۔ کسی کو کسی پر اس کے مرتبہ یا حال کی وجہ سے تقدیم و ترجیح نہ دی جائے۔ قاضی کو چاہیے کہ مدعی اور مدعیٰ علیہ میں کسی بات کا فرق نہ کرے، نہ ان کی مجلس میں، نہ اس کی طرف دیکھنے میں اور نہ ہی گفتگو میں"۔

حقوق و معاملات کی مساوات کا یہ دائرہ صرف مسلمانوں ہی تک محدود نہیں بلکہ غیر مسلم ذمی اور مستامن کو بھی شامل ہے۔ چنانچہ سیدنا عمرؓ کے سامنے ایک مقدمہ پیش ہوا جس میں ایک فریق مسلمان تھا اور دوسرا یہودی۔ یہودی سچا تھا لہذا آپ نے ڈگری اس کے حق میں دی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور سیدنا ابوبکرؓ نے اپنی حکومت میں ذمی رعایا کو وہ سب حقوق دیے جو اسلام نے انہیں دیئے ہیں۔ اس کے مقابلہ میں اس زمانہ میں روم و فارس کی حکومتوں میں نہ تو آتش پرستوں کو وہ حقوق دیے گئے تھے اور نہ ہی سلطنت روم میں عیسائیوں کے وہ حقوق تھے حالانکہ وہ رومیوں کے ہم مذہب تھے۔ یہی وجہ تھی کہ مصر کی فتح کے وقت قبطی باوجود عیسائی ہونے کے مسلمانوں کی بہی خواہ تھے کیونکہ جو حقوق انہیں مسلمانوں نے دیئے تھے وہ قیصر روم نے نہیں دیے تھے۔ یہودیوں کا حال تو عیسائیوں سے بھی بدتر تھا۔ وہ ہر قسم کے انسانی حقوق سے محروم تھے۔ فارس میں عیسائی تھے ان کی حالت

Marfat.com

اور بھی قابل رحم تھی۔ چنانچہ اسلامی حکومت نے غیر مسلموں کے ساتھ جو معاہدات کیے ان سے پتہ چلتا ہے کہ مسلمانوں نے اپنی غیر مسلم رعایا کو کیا کیا حقوق دیے۔ بیت المقدس کا جو معاہدہ سیدنا عمرؓ کی موجودگی میں ہوا جس میں بطور گواہان سیدنا خالد بن ولیدؓ، سیدنا عمرو بن العاصؓ، سیدنا عبدالرحمان بن عوفؓ اور سیدنا معاویہ بن ابی سفیانؓ کے دستخط تھے، اس معاہدہ میں صاف طور پر لکھا گیا کہ عیسائیوں کے جان و مال اور مذہب ہر طرح سے محفوظ ہوں گے۔ ان کے گرجے نہ توڑے جائیں گے اور نہ ان کی عمارتوں کو کسی قسم کا کوئی نقصان پہنچایا جائے گا، اور نہ ان کے احاطوں میں دست اندازی کی جائے گی۔ یونانی باوجود اس کے کہ مسلمانوں سے لڑے تھے اور دراصل مسلمانوں کے حقیقی دشمن وہی تھے، ان کے جان و مال کو بھی پورا پورا تحفظ دیا گیا اور ان کے گرجاؤں اور معبدوں سے کوئی تعرض نہ کیا گیا۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ بیت المقدس کے عیسائی اگر وطن سے نکل کر رومیوں سے جا ملیں تو اس پر بھی ان سے کوئی تعرض نہ کیا جائے گا۔ کیا کوئی حکومت مفتوحہ ملک کے باشندوں کو اس طرح کا عدل و انصاف مہیا کر سکتی ہے؟ (طبری جلد ۳ ص ۱۰۵)

سیدنا عمرؓ نے ذمیوں کی جان و مال کو مسلمانوں کے جان و مال کے برابر قرار دیا اور یہی اسلامی تعلیم ہے۔ چنانچہ اگر کسی مسلمان نے کسی ذمی کو قتل کر دیا تو سیدنا عمرؓ نے اس کے بدلہ میں مسلمانوں کو قتل کرانے سے بھی دریغ نہ کیا۔ امام شافعیؒ نے روایت کی ہے کہ قبیلہ بکر بن وائل کے ایک شخص نے حیرہ کے ایک عیسائی کو قتل کر دیا۔ سیدنا عمرؓ کو جب پتہ چلا تو آپ نے لکھ بھیجا کہ قاتل قصاص کے لیے مقتول کے وارثوں کو دے دیا جائے۔ چنانچہ وہ مقتول کے وارث حنین نامی کو دے دیا گیا اور اس نے اس کو قصاص میں قتل کر دیا (الدرایہ فی تخریج الہدایہ ص ۳۶۰) مال اور جائیداد کو بھی پورا تحفظ دیا اور جس قدر زمینیں غیر مسلموں کے قبضہ میں تھیں، ان کو اسی حیثیت سے بحال رکھا گیا جس حیثیت سے وہ فتح سے پہلے تھیں، یہاں تک کہ مسلمانوں کو ان زمینوں کا خریدنا بھی خلاف قانون قرار دے دیا گیا۔

سیدنا عمرؓ نے شام کی فتح کے بعد سیدنا ابوعبیدہؓ کو جو فرمان لکھا، اس میں فرمایا:

''مسلمانوں کو منع کرنا کہ وہ ذمیوں پر کسی قسم کا کوئی ظلم نہ کرنے پائیں، نہ ان کو کوئی نقصان پہنچائیں اور نہ ان کا مال بے وجہ کھائیں اور جس قدر شرائط آپ نے ان سے طے کی ہیں۔ ان سب کو پورا کیا جائے''۔ (کتاب الخراج ص ۸۲)

ایک مرتبہ شام کے ایک کاشتکار نے یہ شکایت بارگاہ خلافت میں کی کہ مسلمان فوج نے اس کی زراعت کو پامال کر دیا ہے۔ سیدنا عمرؒ نے اس کو قومی خزانہ سے دس ہزار درہم بطور معاوضہ دلوائے اور تمام اضلاع کے حکام کو ایک گشتی مراسلہ ارسال فرمایا کہ ذمیوں پر کسی قسم کی کوئی زیادتی نہ ہونے پائے۔ (کتاب الخراج لابی یوسف ص ۶۸)

سیدنا عمرؓ نے اپنے بعد آنے والے خلیفہ کو ذمیوں کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کی تلقین فرمائی اور فرمایا کہ ان سے کیے گئے عہد کی پابندی کی جائے اور ان کا دفاع کیا جائے اور ان پر ان کی برداشت سے زیادہ بار نہ ڈالا جائے۔ (کتاب الخراج ص ۱۲۶)

امام بخاریؒ نے آپ کی وصیت کو جو آپ نے بعد میں آنے والے خلیفہ کو کی تھی، ان الفاظ میں نقل کیا ہے کہ:

"میں ان لوگوں کے حق میں وصیت کرتا ہوں جن کو خدا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذمہ دیا گیا ہے (یعنی ذمی) کہ ان سے جو عہد ہے اس کو پورا کیا جائے اور ان کی حمایت میں لڑا جائے اور ان کو ان کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہ دی جائے"۔ (بخاری جلد ا ص ۱۸۷)

یہ وصیت تو سیدنا عمرؓ نے اپنے بعد آنے والے خلیفہ کو کی تھی۔ لیکن سیدنا عمر بن عبدالعزیزؒ نے بھی اس وصیت پر پورا پورا عمل کیا۔ چنانچہ آپ نے اپنے عہد خلافت میں ذمیوں کے ساتھ عدل وانصاف کا برتاؤ کیا۔ انہوں نے جس طرح ذمیوں کے حقوق کی حفاظت کی اور ان کے ساتھ ہر معاملہ میں نرمی برتی اس کی مثال عہد فاروقی کے علاوہ اور کسی دور میں شاید ہی ملے۔ مسلمانوں کی طرح ان کی عزت وآبرو اور جان و مال کی حفاظت کی اور ان کے مذہبی معاملات میں کسی قسم کی کوئی دخل اندازی نہیں کی۔ جزیہ کی وصولی میں ان کے ساتھ وہی نرمی اور آسانی برتی جو سیدنا فاروقؓ نے برتی تھی اور شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ انہوں نے اپنے عہد خلافت میں سیدنا سالم بن عبداللہ بن عمرؒ کو خط لکھا تھا کہ مجھے صدقات وغیرہ کے بارہ میں سیدنا عمر بن خطابؓ کا طریقہ لکھ کر ارسال فرمائیں۔ انہوں نے صدقات اور حکومت کے بارہ میں سیدنا عمرؓ کا طرز عمل تو انہیں لکھ دیا لیکن ساتھ ہی یہ بھی لکھا کہ اگر آپ اپنے اس زمانہ میں سیدنا عمرؓ کی حکومت کی طرح حکمرانی کے فرائض انجام دے دیں تو آپ ان سے بڑھ جائیں گے۔ کیونکہ نہ آپ کا زمانہ سیدنا عمرؓ کے زمانے

Marfat.com

کی طرح ہے اور نہ ہی آپ کے زمانے کے لوگ سیدنا عمرؓ کے زمانے کے لوگوں کی طرح ہیں۔ (تاریخ الخلفاء ص ۲۲۱) آپ نے سیدنا عمرؓ کی طرح اپنے زمانے کے مختلف گورنروں اور کارکنان حکومت کو لکھا کہ کوئی شخص ذمیوں پر کسی قسم کی کوئی زیادتی نہ کرے اور ان کے حقوق کا اسی طرح تحفظ کرے جس طرح مسلمانوں کے حقوق کا تحفظ کیا جاتا ہے۔ چنانچہ آپ نے ذمی کے خون کی وہی قیمت قرار دی جو مسلمانوں کے خون کی تھی۔ ایک دفعہ حیرہ میں ایک مسلمان نے ایک ذمی کو قتل کر دیا۔ آپ کو پتہ چلا تو آپ نے وہاں کے گورنر کو لکھا کہ قاتل کو مقتول کے ورثاء کے حوالے کر دیا جائے۔ وہ چاہیں قتل کریں چاہیں معاف کر دیں۔ گورنر نے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے قاتل کو مقتول کے ورثاء کے حوالے کر دیا اور ذمیوں نے اسے قصاص میں قتل کر دیا۔ (نصب الرایہ جلد ۳ ص ۳۶۰) یہ ایک اسلامی ریاست کا خاصا ہے وگرنہ اور کسی ریاست میں ایسا نہیں ہوتا۔

ایک مرتبہ عدی بن ارطاط کو لکھا کہ ذمیوں کے ساتھ نرمی اور حسن سلوک کا برتاؤ کرو۔ ان میں جو بوڑھا یا نادار ہو جائے اس کی کفالت عامہ کے تحت اس کی گذران دو اور اگر اس کا کوئی رشتہ دار ہو تو اسے اس کی کفالت کا حکم دو جس طرح تمہارا کوئی غلام بوڑھا ہو جائے یا بڑھاپے نے اسے معذور کر دیا ہو تو اسے آزاد کرنا پڑے گا یا مرتے دم تک اس کی کفالت کرنی پڑے گی۔ (طبقات ابن سعد جلد ۵ ص ۲۸۰)

شاہی خاندان سے جب آپ نے مسلمانوں کی غصب شدہ املاک چھین کر انہیں اصل مالکوں کو واپس کیں تو اس وقت ذمیوں کی مغصوبہ زمینیں بھی واپس دلائیں۔ اس سلسلہ میں ایک ذمی نے دعویٰ دائر کیا کہ عباس بن ولید جو شاہی خاندان کا چشم وچراغ تھا، نے میری زمین پر غاصبانہ قبضہ کر لیا ہے۔ سیدنا عمر بن عبدالعزیزؒ نے عباس سے جواب دعویٰ کے لیے کہا۔ اس نے کہا: یہ زمین ولید نے مجھے جاگیر میں دی ہے اور میرے پاس اس کی دستاویز موجود ہے۔ ذمی نے اپنے دعویٰ کا یہ جواب سُن کر کہا: "امیرالمومنین! میں آپ سے کتاب اللہ کے مطابق اس کا فیصلہ چاہتا ہوں"۔ آپ نے فرمایا: "کتاب اللہ ولید کی سند پر مقدم ہے"۔ چنانچہ آپ نے عباس بن ولید سے زمین چھین کر ذمی کو واپس لوٹا دی۔
(سیرت عمر بن عبدالعزیزؒ ص ۱۰۴، البدایہ والنہایہ جلد ۹ ص ۲۱۳)

آپ کا حکم تھا کہ کوئی مسلمان کسی ذمی کے مال پر دست درازی نہ کرے۔ چنانچہ

اس ہدایت کے اثرات تھے کہ کوئی مسلمان کسی غیر مسلم کے مال اور زمین پر دست درازی نہیں کرسکتا تھا۔ جو ایسا کرتا اسے قرار واقعی سزا ملتی تھی۔ چنانچہ ایک مرتبہ ایک مسلمان ربیعہ شودی نے ایک سرکاری ضرورت کے تحت ایک نبطی کا گھوڑا بیگار میں پکڑ لیا اور اس پر سواری کی۔ یہ ایک معمولی بات تھی۔ آپ سے پہلے بھی ایسا ہوتا تھا۔ آج بھی گھوڑے کیا عوام کی کاریں اور گاڑیاں بیگار میں پکڑ لی جاتی ہیں اور ان کو کئی کئی روز تک استعمال میں لایا جاتا ہے۔ عوام روتے رہتے ہیں اور حکومت کے کارندوں کے کانوں پر جوں نہیں رینگتی کیونکہ عہدیداروں کی ایک خوبی یہ بھی ہوتی ہے۔ کہ وہ بہرے ہوتے ہیں عوام کے رونے اور چلانے کی آواز انہیں سُنائی نہیں دیتی۔ وہ "یک چشم" بھی ہوتے ہیں۔ کہ انہیں صرف اپنا آپ دکھائی دیتا ہے۔ عوام دکھائی نہیں دیتے۔ لیکن عمر بن عبدالعزیزؒ کو جب اس بات کا پتہ چلا تو اس عہدے دار کو چالیس کوڑے لگوائے تا کہ دوسروں کے لیے باعث عبرت ہو۔

(طبقات ابن سعد جلد ۵ ص ۲۷۶)

سیدنا فاروقؓ کے زمانہ میں غیر مسلموں سے خراج اور مال گذاری وصول کرنے میں نہایت نرمی برتنے کی ہدایات دی گئی تھی، لیکن اس کے باوجود آپ کو ہر وقت یہ خیال پریشان کرتا رہتا تھا۔ کہ کہیں ان پر زیادتی تو نہیں کی گئی۔ چنانچہ جب آپ اس دنیا سے رخصت ہو رہے تھے۔ اس وقت بھی ذمیوں کا ہی خیال آپ کے ذہن میں اضطراب پیدا کر رہا تھا۔ حالانکہ آپ کا ہر سال یہ معمول تھا کہ جب عراق کا خراج آتا تو ۱۰ افراد کوفہ سے اور ۱۰ بصرہ سے طلب کیے جاتے تھے اور سیدنا عمرؓ ان سے چار دفعہ تاکید کے ساتھ قسم لیتے تھے۔ کہ مال گذاری کے وصول کرنے میں تمہارے ساتھ کچھ سختی تو نہیں کی گئی۔ (کتاب الخراج لابی یوسف ص ۶۵) شہادت سے دو تین روز قبل کا واقعہ ہے کہ تمام افسران بندوبست کو بلایا اور مال گذاری کی تشخیص کے بارہ میں ان سے گفتگو کی گئی۔ دوران گفتگو آپ اس سے بار بار پوچھتے رہے کہ آپ لوگوں نے ان سے بندوبست مال گذاری میں سختی تو نہیں کی۔

سیدنا عمر بن عبدالعزیزؒ نے بھی اسی طرح جزیہ، خراج اور مال گذاری کی وصولی میں ذمیوں کے لیے بڑی آسانیاں پیدا کر دیں اور اس سلسلہ میں جتنی بدعنوانیاں گذشتہ حکمرانوں نے پیدا کر دی تھیں ان سب کا تدارک کر دیا۔ حجاج بن یوسف ثقفی نے ابن

Marfat.com

اشعث کی حمایت کے الزام میں عراق کے ذمیوں کے جزیہ کی مقدار بڑھا دی تھی۔ آپ کو پتہ چلا تو آپ نے فوری طور پر اسے کم کر دیا۔ (فتوح البلدان بلاذری ص ۷۴)

تاریخ کے اوراق سے پتہ چلتا ہے کہ آپ کے عہد خلافت میں ذمیوں کے ساتھ اتنی نرمی برتی گئی کہ اس سے عام لوگوں کو کئی نقصانات اٹھانے پڑے۔ آپ کے زمانہ میں غلہ کا نرخ گراں ہو گیا۔ ایک شخص نے آپ سے اس گرانی کا سبب پوچھا۔ فرمایا:

"پہلے خلفاء ذمیوں کو جزیہ کی وصولی میں ناقابل برداشت تکالیف دیتے تھے، اس لیے وہ جس نرخ پر بھی ہو سکتا تھا غلہ فروخت کر دیتے تھے اور میں ہر شخص کو صرف اتنی تکلیف دیتا ہوں جس کو وہ برداشت کر سکے اس لیے اب ہر ذمی جس طرح چاہتا ہے فروخت کرتا ہے۔
(کتاب الخراج لابی یوسف ص ۷۶)

عمرؒ کا محبت واحترام کی بنیاد پر ذمیوں سے سلوک کرنا اسلام کے اصولوں کے عین مطابق تھا اور آپ سے ان کے حسن سلوک کی بنیادیں محبت واحترام پر اٹھائی گئی تھیں۔ (تاریخ الشعوب الاسلامیہ جلد ا ص ۱۸۴) آپ کو یہ بات پسند تھی کہ غیر مسلم اور ذمی ایک اسلامی حکومت میں رہ کر اپنے آپ بالکل محفوظ ومصئون سمجھیں۔ حجاج بن یوسف ثقفی نے اہل ذمہ پر بڑی سختی کی ہوئی تھی۔ اس نے یہ قانون بنایا ہوا تھا کہ وہ ذمیوں کے غلہ کے گوداموں کو سربمہر کروا دیتا تھا اور اس وقت تک مہر نہ کھولتا تھا جب تک وہ جزیہ ادا نہ کرتے۔ لیکن عمرؒ کو یہ بات ناپسند تھی۔ وہ کسی صورت نہیں چاہتے تھے کہ ذمیوں کے وقار واحترام کو ٹھیس لگے۔ (سیرۃ ابن جوزی ص ۸۸)

اہل ذمہ کے ساتھ اس سلوک کو دیکھ کر کئی شہروں کے کوتوال آپ کی اجازت کے بغیر ہی اہل ذمہ کے مظالم کو رفع کر دیا کرتے تھے۔ چنانچہ ایک روز آپ نے کوتوال شہر عمرو بن مہاجر کو بلوایا لیکن وہ موجود نہ تھا۔ پھر جب وہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ نے اس سے پوچھا: کہاں تھے؟ اس نے جواب دیا میں اہل کتاب کے مظالم رفع کرنے کے لیے باہر گیا ہوا تھا۔ عمرؒ نے اس کا یہ عذر سُن کر اس سے کوئی تعرض نہ کیا۔
(سیرۃ ابن عبدالحکم ص ۱۶۴)

عمرؒ نے اہل ذمہ کی دل جوئی کے لیے مختلف علاقوں میں عیسائیوں پر جزیہ میں تخفیف کر دی حتیٰ کہ قبرص، ایلہ اور نجران کے عیسائیوں پر بھی تخفیف جزیہ کے قانون کو نافذ

Marfat.com

کیا۔ (تاریخ الشعوب الاسلامیہ جلد ا ص ۱۸۱) عمرؒ نے خراج مصر کے رئیس اسامہ بن زید کو قبطیوں کی حمایت کرتے ہوئے معزول کیا تھا۔ جب زریق بن حیان مصر کی چنگی پر مقرر تھے۔ تو عمرؒ نے ایک خط کے ذریعہ انہیں حکم دیا کہ نقدی اور تجارتی اموال میں چالیسواں حصہ چنگی وصول کی جائے اور اگر چالیس دینار سے کم نقدی یا مال ہو تو بیس دینار پر اسی حساب سے وصول کیا جائے اور بیس سے کم دینار سے کچھ کم پر کچھ نہ لیا جائے۔ اور ذمیوں سے تجارتی اموال پر بیس دینار پر ایک دینار اور دس دینار سے کم پر کچھ نہ لیا جائے۔

(کتاب الخراج لابی یوسف ص ۱۳۷)

جب تک اہل ذمہ جزیہ ادا کرتے رہے۔ عمر بن عبدالعزیزؒ نے انہیں کسی قسم کی کوئی تکلیف اور تنگی نہیں دی۔ انہیں ہر قسم کی پوری پوری آزادی تھی۔ بلکہ بعض لحاظ سے ان کے حقوق مسلمانوں سے بھی زیادہ تھے۔ عمرؒ اپنے گورنروں کو ہر وقت یہی تلقین کرتے رہتے تھے۔ کہ ذمیوں کو تمہارے ہاتھوں کسی قسم کی کوئی تکلیف نہیں ہونی چاہیے۔ چنانچہ آپ نے گورنر کوفہ زید بن عبدالرحمٰن کو حکم دیا کہ ذمیوں کو تنگ کرنے سے باز رہیں۔ آخر کار وہ رُک گئے اور آپ نے عبدالرحمٰن بن نعیم کو لکھا کہ جس گرجا گھر، آتش کدہ یا عبادت خانہ پر تم سے صلح کر لی گئی ہے اس کو ہرگز منہدم نہ کرو۔ (طبری جلد ۵ ص ۳۶۴) اور ابن جوزیؒ نے لکھا ہے۔ کہ جب بنوامیہ کے امراء نے سیاحت کا ارادہ کیا تو آپ نے ان سے یہ عہد لیا کہ وہ ذمیوں کو نہیں ستائیں گے اور نہ قوم کے کسی شخص کو تنگ کریں گے۔

(ابن جوزی ص ۷۷)

عمر بن عبدالعزیزؒ ایک نہایت دین دار شخص تھے اس وجہ سے ان کی نگاہ سے یہ بات اوجھل نہ تھی کہ دنیا میں عبادت خانوں کا باقی رہنا لوگوں کے لیے باعث صلاح وفلاح ہے۔ وہ عبادت خانے خواہ کسی دین وملت کے ہوں۔ کیونکہ کوئی مذہب بھی لوگوں کو بداخلاقی اور بدتہذیبی نہیں سکھاتا بلکہ عبادت خانوں ہی میں جا کر لوگوں کو اخلاق اور ان کی تہذیب میں حسن اور نکھار پیدا ہوتا ہے اور ان کی معاشرت درست ہوتی ہے۔ ایک مرتبہ دو خارجیوں نے آکر آپ سے ذمیوں کے بارہ میں استفسار کیا کہ کیا انہیں طاقت سے زیادہ تکلیف دی جاسکتی ہے؟ آپ نے جواب میں فرمایا: کہ جب اللہ تعالیٰ کسی کو اس کی طاقت کے اندر تکلیف دیتا ہے۔ تو ہم کون ہیں جو ان کو ان کی طاقت سے زیادہ تکلیف دیں؟

Marfat.com

اس نے پھر پوچھا کہ اگر اہل ذمہ کے عبادت خانے یعنی گرجے وغیرہ ڈھا دیے جائیں تو کیا حرج ہے؟ عمرؒ نے فرمایا: ایسا ہرگز نہیں ہوسکتا۔ اس نے بہت اصرار کیا لیکن آپ نے اس کی یہ بات ہرگز نہیں مانی اور فرمایا یہ عبادت خانے اور گرجے میری رعایا کی صلاح اور اصلاح میں شامل ہیں۔ (سیرۃ ابن عبدالحکم ص ۱۷۴)

ذمی تو پھر بھی انسان اور اللہ کی مخلوق ہیں۔ سیدنا عمرؒ تو جانوروں پر بھی شفقت اور نرمی برتتے تھے اور ان کو کسی قسم کی تکلیف سے گریز فرماتے۔ اس زمانے میں جانوروں پر بڑا ظلم و تشدد ہوتا تھا۔ گھوڑوں کو بڑی بھاری بھاری لگامیں ڈالی جاتی تھیں۔ ان پر ان کی طاقت سے زیادہ بوجھ ڈالا جاتا تھا۔ ان کے جسموں میں لوہے کے سوئے گھونپے جاتے تھے تاکہ وہ تیز چلیں اور ریس میں اور لہو و لعب کے طور پر گھوڑوں کو دوڑایا جاتا تھا۔ سیدنا عمرؒ نے ان تمام چیزوں کو اپنے ایک حکم کے ذریعہ ممنوع اور قابل تعزیر قرار دے دیا اور ناحق گھوڑوں کے دوڑانے پر بھی پابندی لگا دی گئی۔ عبدالرحمٰن بن نعیم کو ایک مرتبہ ایک خط میں کچھ ہدایات دیں۔ ان میں یہ ہدایات بھی تھی کہ بکری کو ذبح خانے تک گھسیٹ کر نہ لایا جائے اور اسے تیز چھری سے ذبح کیا جائے۔ (طبری جلد ۵ ص ۳۲۴) اور گورنر مصر کو لکھا کہ مجھے پتہ چلا ہے کہ تمہارے ہاں لوگ اونٹ پر ایک ایک ہزار رطل (ساڑھے بارہ من) بوجھ لادتے ہیں، میں حکم دیتا ہوں کہ کوئی شخص چھ سو رطل سے زیادہ اونٹ پر بوجھ نہ لادے۔ (ابن عبدالحکم ص ۱۶۶)

گذشتہ خلفاء نے ذمیوں کے مذہبی حقوق بھی پامال کیے ہوئے تھے۔ آپ نے ان حقوق کو ازسرنو قائم کیا۔ چنانچہ دمشق میں ایک گرجا عرصہ سے مسلمان خاندان کی جاگیر میں چلا آ رہا تھا۔ سیدنا عمر بن عبدالعزیزؒ جب مسند نشین خلافت ہوئے تو عیسائیوں نے ان کے پاس اس کا دعویٰ کیا۔ آپ نے فوری طور پر اس کو واپس دلا دیا۔ ایک مسلمان نے ایک گرجے کی بابت یہ دعویٰ کیا کہ وہ اس کی ملکیت ہے۔ سیدنا عمر ثانیؒ نے فرمایا: "اگر یہ عیسائیوں کے معاہدہ میں ہے تو تم اس کو نہیں لے سکتے، یہ ان کا رہے گا"۔ (فتوح البلدان ص ۱۳۰)

عمر بن عبدالعزیزؒ ذمیوں کو نہ صرف عام مسلمانوں کے برابر سمجھتے تھے بلکہ شاہی خاندان جو اپنے کو دوسرے مسلمانوں کے مقابلہ میں اعلیٰ و ارفع تصور کرنے لگے تھے، ان

Marfat.com

کے برابر سمجھتے تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ ہشام نے غرور و تمکنت میں جو شاہی خاندان میں پیدا ہو گیا تھا، ایک عیسائی سے سخت کلامی کی۔ عمر بن عبدالعزیزؒ نے اس کو ڈانٹا اور سزا دینے کی دھمکی دی یہاں تک کہ ہشام کا دماغ ٹھکانے آ گیا۔

بیت المال کے محاصل میں اضافہ

اسلام نے صرف نظام حکومت کے اچھا ہونے پر زور نہیں دیا بلکہ اسلام نے حاکم حکومت کے اچھا ہونے پر بھی بڑا زور دیا ہے۔ اگر حاکم اچھا ہے تو نہ صرف رعایا خوش حال ہو گی۔ مگر حکومت کے محاصل میں بھی اضافہ ہو گا۔ لوگوں میں دیانت و امانت، صدق و راستبازی اور فرائض وحقوق کی ادائیگی کا جذبہ ابھرے گا۔ سیدنا عمر فاروقؓ کے زمانہ میں جب انہوں نے عراق کی زمینوں کا بندوبست کیا تو دوسرے سال خراج کی مقدار آٹھ کروڑ سے دس کروڑ بیس لاکھ درہم تک پہنچ گئی اور پھر ہر سال اس میں معتدبہ اضافہ ہوتا رہا۔ مصر سے جو خراج آپ کو وصول ہوتا تھا اس کی مقدار ایک کروڑ بیس لاکھ دینار تھی اور مورخین نے لکھا ہے کہ سیدنا عمرؓ کے زمانہ میں مصر سے جس قدر خراج وصول ہوا اس کے بعد والے زمانوں میں اتنا خراج کبھی وصول نہیں ہوا۔ یہ ان کی رعایا پروری اور عدل گستری کی برکت تھی۔ علامہ مقریزی نے لکھا ہے۔ کہ یہ ایک کروڑ بیس لاکھ دینار کی رقم خراج کی نہیں بلکہ جزیہ کی رقم تھی۔ خراج کی رقم اس کے علاوہ تھی۔ شام سے جو خراج وصول ہوتا تھا اس کی مقدار ایک کروڑ چالیس لاکھ دینار تھی۔ اسی طرح ملک مین خوش حالی کا دور دورہ تھا۔ ہر طرف برکات خداوندی کا نزول تھا۔ کھیتی باڑی اور زراعت نے بڑی ترقی کی اور رعایا خوش وخرم تھی۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ آپ کے گورنر محاصل کی وصولی میں نرمی برتتے۔ کسی پر سختی نہ کرتے اور لوگوں کو ادائیگی میں مہلت دیتے اور ناجائز طریقے سے اور ناجائز اشیاء کے محاصل وصول نہ کرتے۔

سیدنا عمر بن عبدالعزیزؒ سے پہلے کے خلفاء لوگوں سے ناجائز محاصل وصول کرتے۔ وصولی میں ظلم وتعدی سے کام لیتے۔ وصول کرتے وقت سختی اور تشدد کرتے۔ آپ نے ان سب چیزوں کا سدباب کر دیا۔ اب بغیر کسی سختی اور تعدی کے ٹیکس اور خراج وجزیہ وصول ہوتا اور پھر اس کے مصارف بھی کثیر تھے۔ لیکن ان کثیر مصارف کے باوجود بیت

Marfat.com

المال کی آمدنی میں حیرت انگیز اضافہ ہوا۔ عراق کی آمدنی حجاج بن یوسف کے ظالمانہ دور سے کہیں زیادہ تھی۔ آمدنی کے اس اضافہ کو دیکھ کر عمر بن عبدالعزیزؒ فرمایا کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ حجاج پر لعنت کرے۔ اس کو نہ دین کا سلیقہ تھا اور نہ دنیا کا۔ وہ لوگوں پر سختی کرنے اور ناجائز طریقے اختیار کرنے کے باوجود بھی قومی خزانے کی آمدنی میں کوئی اضافہ نہ کر سکا۔ اس کے ظالمانہ دور میں عراق سے صرف دو کروڑ اسی لاکھ درہم وصول ہوتے تھے۔ اس نے کاشت کاروں کو بیس لاکھ درہم زمین کی آباد کاری کے لیے قرض کے طور پر دیے تو ایک کروڑ سات لاکھ درہم اضافہ ہوا۔ باوجود اس ویرانی کے جب عراق میرے قبضہ میں آیا تو میں نے بارہ کروڑ چالیس لاکھ درہم وصول کیے اور اگر زندہ رہا تو سیدنا عمر فاروقؓ کے زمانہ سے بھی زیادہ رقم وصول کروں گا۔ حالانکہ دور فاروقی ایک سنہری دور تھا۔ (فتوح البدان ص)

یہ سب کچھ ان کی نیکی کی برکات تھی۔

Marfat.com

عوامی خدمات

ایک اسلامی فلاحی مملکت کا کام لوگوں کو خوش حال بنانا اور ان کی بنیادی ضروریات زندگی کو پورا کرنا ہے، لیکن اس کے ساتھ لوگوں کو اسراف سے روکنا ہے۔ اسراف کو ایک حدیث میں "اضاعت مال" سے بھی تعبیر کیا گیا ہے۔ چنانچہ ایک حدیث میں سرکار دو عالم صلی علیہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"قیل وقال کرنے، بہت زیادہ سوالات دریافت کرنے، مال کو ضائع کرنے، خود نہ دینے اور دوسروں سے مانگنے، ماں کی نافرمانی کرنے اور بچیوں کو زندہ درگور کرنے سے منع فرمایا ہے"۔ (بخاری، کتاب الرقاق، الادب المفروض ۴۵)

"کثرۃ سوال کا ایک معنی یہ بھی ہے "زیادہ مال مانگنا"۔

(فتح الباری جلد ۱۱ ص ۲۶۲)

بعض الفاظ کی تبدیلی کے ساتھ یہ روایت موطا امام مالک اور مسند دارمی میں آئی ہے۔ مسلم میں یہی مضمون ایک مفصل روایت میں بھی آیا ہے۔ اس کی شرح فرماتے ہوئے امام نوویؒ لکھتے ہیں:

"اضاعت مال سے مراد غیر شرعی طور پر مال کو صرف کرنا ہے اور بے جا تلف کرنا ہے۔ ممانعت کی وجہ یہ ہے کہ یہ معاشرہ میں بگاڑ پیدا کرنے کے ہم معنی ہے اور اللہ تعالیٰ فساد پیدا کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ مزید برآں یہ کہ جب کوئی شخص اپنا مال ضائع کر دے گا تو کسی دوسرے کے مال پر قبضہ کرنے کی فکر میں رہے گا"۔ (نوری شرح مسلم، کتاب الاقضیہ جلد ۲ ص)

Marfat.com

اضاعت مال کی بعض شکلیں غیر کاروباری اور انفرادی بھی ہیں۔ ان میں سے بعض اسراف کے تحت آتی ہیں اور بعض غیر شرعی مصارف کے تحت آتی ہیں۔ ان میں سے ایک ''تبذیر'' ہے اور دوسری ''اسراف''۔ ان دونوں میں فرق ہے۔ ''اسراف'' کا اطلاق عموماً ایسے مال پر ہوتا ہے جو جائز مقصد کے لیے ہو لیکن حد اعتدال سے متجاوز ہو اور ''تبذیر'' غیر شرعی اغراض سے متعلق صرف مال اور اس طرح اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کے ہم معنی ہے۔ ''تبذیر'' کرنے والے کو شیطان کا بھائی کہا گیا ہے۔ (الاسراء: ۲۶،۲۵) اور امام بخاریؒ نے سیدنا ابن عباسؓ سے روایت نقل کی ہے کہ جب ان سے پوچھا گیا کہ ''مبذرین'' کون ہیں۔ فرمایا:

الذین ینفقون فی غیر حق (الادب المفرد ص ۶۵)

جو ناحق مصارف میں مال خرچ کریں۔

باطل نظریات وخیالات کی اشاعت یا فحش باتوں کی اشاعت حرام ہے۔ ایسے کاموں کے لیے مال خرچ کرنا ''تبذیر'' کہلاتا ہے۔ یہی حال دوسرے حرام کاموں کا ہے۔

جو بات مال کے سلسلہ میں کہی گئی ہے وہی اگر اشیاء استعمال کے وصفی معیار کے بارہ میں بھی سامنے رکھی جائے تو اسراف کا ایک دوسرا پہلو واضح ہوتا ہے۔ ایک حاجت کی تشفی اگر ایک مخصوص معیار کے سامان سے اتنی ہی ہو سکتی ہے جتنی کہ اس سے برتر معیار سے تو اس حاجت کی تشفی کے لیے برتر معیار کے سامان کا طلب کرنا ایک مسرفانہ طلب قرار دی جا سکتی ہے، لہٰذا اب ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ''اسراف'' نام ہے ضروریات کی تکمیل کے لے مقدار یا معیار کے اعتبار سے زائد از ضرورت مال صرف کرنے کا۔ حدیث میں اس اسراف سے بھی امت کو روکا گیا۔

اسراف سے امت کو بچانے کے لیے سیدنا عمرؒ نے اپنے تمام گورنروں کو لکھا:

''بلند وبالا عمارتیں نہ تعمیر کرو کیونکہ یہ طرز عمل بدترین زمانے کی علامت ہے''۔

(الادب المفرد ص ۶۲)

ظاہری نگاہ میں اگرچہ ایک فرد آزاد ہے۔ کہ وہ اپنے وسائل وذرائع کو مباح اور جائز ضرورتوں اور کاموں پر جس طرح چاہے صرف کرے، مثال کے طور پر اگرچہ علاج اور علم بنیادی ضرورتیں ہیں، لیکن ایک شخص انہیں نظر انداز کر کے اپنا مال اپنے گھر کی زینت اور

Marfat.com

آرائش پر صرف کرنے کا پورا پورا حق رکھتا ہے۔ لیکن یہ طرز عمل اسلامی طریقہ زندگی سے مناسبت نہیں رکھتا۔ اسلام انسانی زندگی کو ایک بامقصد کام سمجھتا ہے اور مقصدی زندگی کا خاصہ ہے کہ ضرورتوں کو زیب و زینت پر ترجیح دی جائے۔ اسلامی فقہ میں اس بات کی صراحت موجود ہے کہ بنیادی ضرورتوں کو نظر انداز کر کے زینت وآرائش کے امور پر مال صرف کرنا اسراف میں داخل ہے۔ اسلام نے بنیادی ضروریات زندگی کی تکمیل کو ضروری قرار دیا ہے۔ (الموافقات جلد۲ ص ۱۷۶۔ ۱۷۷، ص ۱۸۱)

اس کے علاوہ اسلام نے لذت دنیا میں انہماک، مبالغہ کی حد تک آرام وسہولت کی طلب اور عیش وعشرت میں غرق ہو جانے والی زندگی کو از حد ناپسندیدہ قرار دیا ہے اور حضور علیہ السلام نے فرمایا: ''خبردار! عیش کوشی سے اجتناب کرنا کیونکہ اللہ تعالیٰ کے اچھے بندے عیش کوشی نہیں کرتے''۔ (مشکواۃ باب فضل الفقراء)

سیدنا عمرؓ نے کفالت عامہ کے فریضہ کی انجام دہی کچھ اس طریقہ سے کی کہ آج عقل حیران رہ جاتی ہے۔ ۱۸ ھ میں عام الرمادہ کے سال میں لوگوں نے دیکھا کہ صدر ریاست سیدنا فاروق اعظمؓ نے جس احساس ذمہ داری اور چستی، تن دہی اور حسن انتظام کے ساتھ اپنی ذمہ داریاں ادا کیں وہ آنے والے حکمرانوں کے لیے ہمیشہ ایک نمونہ رہیں گی۔ کفالت عامہ کی ذمہ داری کے بارہ میں سیدنا عمرؓ کا تصور اتنا وسیع اور ہمہ گیر تھا کہ آپ فرماتے تھے: ''اگر دارالاسلام کی حدود کے اندر کوئی جانور بھی بھوک سے مر جائے تو مجھے اندیشہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حضور مجھے اس کے لیے جواب دہ ہونا پڑے گا۔

(طبقات ابن سعد جلد۳ ص ۳۰۵)

آپ کفالت عامہ کی ذمہ داری میں دوا اور علاج کو بھی داخل سمجھتے تھے۔ جو حکمران جانوروں کے علاج کو بھی اپنی ذمہ داری سمجھتا ہو وہ انسانوں کے علاج کو بدرجہ اولیٰ اپنی ذمہ داری میں داخل سمجھے گا۔

آپ اپنے ماتحت حکام کو بھی اس ذمہ داری کی طرف توجہ دلاتے رہتے تھے۔ چنانچہ آپ نے ایک مرتبہ سیدنا ابوموسیٰؓ کو ہدایت فرمائی:

''لوگوں کے گھروں میں ان کے لیے فراخی کا سامان فراہم کرو اور ان کے متعلقین کو کھلانے کا سامان کرو''۔ (سراج الملوک، طرطوشی ص ۱۰۹)

Marfat.com

عمر ثانیؒ نے بھی اسلام کی انہی تعلیمات کے تحت کفالت عامہ کے اس نظام کو پھر سے بحال کیا اور اپنے مختصر دور خلافت میں اس کی پوری پوری کوشش کی کہ رعایا خوش حال اور آسودہ ہو جائے۔ ان کے آنگن میں فراخی ناچے اور وہ اپنی بنیادی ضروریات سے فارغ ہو کر توجہ الی اللہ کی طرف مصروف ہوں۔ چنانچہ آپ نے مظالم کے انسداد، ناجائز ٹیکسوں کی منسوخی اور عام داد و دہش سے رعایا کو آسودہ حال بنا دیا اور لوگوں نے دیکھا کہ ملک کے طول وعرض میں غریبی اور افلاس کا نام ونشان باقی نہ رہا اور حالت یہ ہو گئی کہ لوگ صدقہ وخیرات تقسیم کرنے کے لیے لے جاتے تو کوئی انہیں قبول کرنے والا نہ ہوتا اور بعض روایات میں ہے کہ لوگ صدقہ وخیرات تقسیم کرتے تھے اور ایک سال کے بعد وہ لوگ جو پہلے صدقہ لیتے تھے خود دوسروں کو صدقہ دینے لگتے تھے۔ (طبقات ابن سعد جلد ۵ ص ۲۵۶) اور حافظ ابن حجرؒ نے نقل کیا ہے کہ سیدنا عمر بن عبدالعزیزؒ نے لوگوں کو اس قدر مالا مال کر دیا تھا کہ پورے ملک میں کوئی صدقہ لینے والا اور حاجت مند باقی نہ رہ گیا تھا۔ (فتح الباری جلد ۶ ص ۴۵۱) آپ کے زمانہ میں خوش حالی اور آسودگی اس حد تک پہنچ گئی تھی۔ کہ لوگوں کا دولت کے نشہ میں کبر ونخوت میں مبتلا ہو جانے کا خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔ چنانچہ عدی بن ارطاط نے آپ کو لکھا کہ اہل بصرہ اس قدر دولت مند اور خوش حال ہو گئے ہیں کہ مجھے اندیشہ ہے کہ وہ دولت میں منہمک ہو کر فخر وغرور نہ کرنے لگیں۔ آپ نے اسے جواب میں لکھا کہ اللہ تعالیٰ جب اہل جنت کو جنت میں داخل کریں گے تو ان کے لیے الحمدللہ کہنا پسند کیا اس لیے تم بھی لوگوں کو حکم دو کہ وہ اس نعمت پر خدا کا شکر بجا لائیں۔ یہی ان کے لیے بہتر ہے۔ (طبقات ابن سعد جلد ۵ ص ۲۸۲)

رفاہِ عام کے کام

اسلام صرف نماز روزہ کا مذہب نہیں ہے۔ بلکہ اس نے رفاہِ عام کے کاموں کی بھی ترغیب دی ہے اور ان کاموں کے کرنے کو بھی اسی طرح باعث اجر وثواب قرار دیا ہے۔ جس طرح نماز روزہ باعث اجر و ثواب ہے۔ سیدنا عمرؒ نے اپنے عہد خلافت میں رفاہِ عامہ کے اتنے کام کیے کہ تاریخ انگشت بدندان ہے۔ موجودہ زمانہ میں ہر حکومت میں یہ محکمہ موجود ہے جس کو پبلک ورکس ڈیپارٹمنٹ (P.W.D) کا نام دیا جاتا ہے۔ لیکن یہ محکمہ

اسلام میں سب سے پہلے سیدنا عمر فاروقؓ نے قائم کیا۔ اس محکمہ کے ذمہ سرکاری عمارات کی تعمیر و مرمت، سڑکیں بنانا، ہسپتال بنانا اور نہریں کھودنا تھا۔ آج کل عرب دنیا میں اس کو "نظارت عامہ" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس زمانہ میں ہسپتال قائم نہیں ہوئے تھے، لیکن اور سب چیزیں اس محکمہ میں موجود تھیں۔ سیدنا عمرؓ نے مختلف سرکاری عمارتیں بھی بنوائیں، سڑکیں بھی تعمیر کرائیں اور نہرائیں بھی کھدوائیں جس کی تفصیل ہم نے اپنی کتاب "سیرت حضرت عمر فاروقؓ" میں دی ہے۔ سیدنا عمر بن عبدالعزیزؒ نے بھی رفاہ عامہ کے کاموں کی طرف پوری پوری توجہ دی۔ بلکہ میں سمجھتا ہوں کہ آپ نے جس قدر اصلاحات کیں وہ بھی دراصل رفاہ عامہ ہی کے کام تھے۔ آپ نے تمام ملک میں کثرت کے ساتھ سرائیں بنوائیں۔ چنانچہ آپ نے سلیمان بن ابی السری گورنر سمرقند کو لکھا کہ وہاں کے تمام راستوں میں کثرت سے سرائیں بنوائی جائیں تاکہ اندرون ملک سفر کرنے والے لوگوں کو اس سے فائدہ پہنچے۔ اور نہ صرف سمرقند میں بلکہ اپنے علاقہ کے تمام شہروں میں سرائیں تعمیر کرائیں اور جو مسلمان ادھر سے گذریں ان کی ایک دن رات کی مہمان نوازی اور کھانا پینا مفت مہیا کیا جائے۔ ان کی سواریوں کی حفاظت کی جائے اور جو مسافر سفر کے دوران مریض ہو جائیں ان کو دو دن اور دو رات اپنے ہاں ٹھیراؤ اور ان کا علاج معالجہ بھی کیا جائے۔ اگر کسی مسافر کے پاس گھر تک پہنچنے کا سامان نہ ہو تو اسے گھر تک پہنچنے کا سامان بھی مہیا کیا جائے۔ خراسان کے گورنر کو لکھا کہ وہاں بھی مسافروں کے قیام کے لیے سرائیں بنوائی جائیں۔ (طبقات ابن سعد جلد ۵ ص ۲۵۴) علاوہ ازیں ایک عام لنگر خانہ قائم کیا جس میں فقراء اور مساکین کو دونوں وقت کا کھانا ملتا تھا۔ دنیا آج اتنی ترقی کرنے کے باوجود ابھی تک وہ رفاہ عامہ کا کام نہیں کر سکی جو سیدنا عمر فاروقؓ اور سیدنا عمر بن عبدالعزیزؒ نے اپنے اپنے زمانوں میں کیا۔

جن چیزوں کے بارہ میں عمر بن عبدالعزیزؒ کو یقین ہو جاتا کہ وہ لوگوں کے لیے مفید ہیں آپ ان کے کرنے کا فوری حکم صادر فرما دیتے۔ چنانچہ ایک مرتبہ عدی بن فضیل نے آ کر آپ سے عذبہ میں کنواں کھودنے کی اجازت مانگی۔ آپ نے عدی سے پوچھا کہ عذبہ کہاں ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ بصرہ سے دو روز کی مسافت پر۔ عمرؒ نے اس بات پر افسوس کا اظہار کیا کہ ایسی جگہ پر پانی نہیں ہے۔ پھر آپ نے انہیں کنواں کھودنے کی اجازت

مرحمت فرما دی۔ کہ سب مسافر اس پانی کے حق دار ہیں۔ (الکامل للمبرد جلد ا ص ۹۱)
چنانچہ وہاں کنواں کھودا گیا اور تمام لوگ اس کے پانی سے مستفید ہوئے۔

زمین کی کاشت بھی لوگوں کے لیے نہایت ضروری ہے تا کہ لوگ اس کی پیداوار سے نفع حاصل کر سکیں۔ چنانچہ آپ نے عبدالحمید بن عبدالرحمٰن کو خراج کے بارہ میں جو کچھ لکھا اس میں ایک بات یہ بھی تحریر فرمائی: "غیر آباد زمینوں پر پوری پوری توجہ دو۔ اگر اس میں اصلاح کی معمولی سی بھی گنجائش ہو تو اس کو درست کرادو تا کہ لوگ اس میں کاشت کر سکیں اور ان کو فائدہ ہو۔ (کتاب الخراج لابی یوسف ص ۸۶)

Marfat.com

دینی خدمات

ویسے تو سیدنا عمر بن عبدالعزیزؒ کی نظام حکومت میں ہر اصلاح دراصل دینی خدمت کی روح اپنے اندر سموئے ہوئی تھی، کیونکہ یہ ایک دینی جذبہ ہی تھا جو اموی خاندان کی مخالفت کے باوجود ان سے یہ ساری اصلاحات کروا رہا تھا، لیکن اس کے باوجود انہوں نے اسلامی حکومت کی مردہ رگوں میں زندگی کی لہر دوڑا دی کیونکہ ایک اسلامی حکومت کا مقصد وحید ہی دنیا میں اسلام اور اس کی اقدار کی نشر واشاعت ہے۔ اس کام کا بیڑا سب سے پہلے سیدنا فاروق اعظمؓ نے اٹھایا اور یہ ان کی حکومت کی خصوصیات میں سے ہے کہ انہوں نے دور دور تک لوگوں کے دلوں میں اسلام کو اتار دیا۔ آپ کا مقصد اسلام کو تلوار کے زور پر پھیلانا نہیں تھا جیسا کہ بعض مستشرقین یہ الزام لگاتے ہیں۔ اسلام اپنے ذاتی محاسن کی وجہ سے پھیلا اور اس نے جس سرعت کے ساتھ لوگوں کے دلوں کو مسخر کیا اس کی نظیر کسی مذہب میں نہیں ملتی۔

سیدنا عمر بن عبدالعزیزؒ نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ اموی خلفاء کے زمانہ میں جو جو کچھ جادۂ شریعت سے ہٹ گیا تھا آپ نے اس کو شریعت اسلامیہ کے مطابق کر دیا۔ گورنروں کے نام آپ کے جو فرامین جاتے تھے ان سب میں اسلام اور اس کی اقدار کی نشر واشاعت، شریعت کا احیاء اور بدعت کے استیصال کی تاکید ہوتی تھی۔ (طبقات ابن سعد جلد ۵ ص ۲۵۲) عدی بن عدی کو ایک فرمان لکھا کہ "ایمان چند فرائض، چند احکام اور چند سنن کا نام ہے۔ جس نے ان اجزاء کی تکمیل کر لی اس نے ایمان کو مکمل کر لیا اور جس نے

Marfat.com

اس کی تکمیل نہیں کی اس نے ایمان کو مکمل نہیں کیا۔ اگر میں زندہ رہا تو ان تمام اجزاء کو تمہارے سامنے واضح کر دوں گا تاکہ تم لوگ اس پر عمل کرو اور اگر مر گیا تو مجھے تمہارے ساتھ رہنے کی کوئی تمنا بھی نہیں ہے"۔ (بخاری جلد ا ص، باب بنی الاسلام علیٰ خمس)

انہی دینی اصلاحات کے باعث آپ کے عہد خلافت میں ہر کام میں دینی روح آپ کی ایک امتیازی خصوصیت بن گئی تھی۔ چنانچہ طبری وغیرہ مورخین نے لکھا ہے کہ "ولید بن عبدالملک عمارتوں کا دلدادہ تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے زمانہ میں لوگوں کو عمارتیں بنانے کا شوق پیدا ہو گیا۔ سلیمان بن عبدالملک کو عورتوں اور نکاح کا شوق تھا لہٰذا اس کے زمانہ میں لوگ لونڈیوں اور شادیوں کے شوقین ہو گئے تھے۔ اب جب عمر بن عبدالعزیزؒ نے مسند خلافت پر قدم رکھا تو لوگوں کا مذاق بدل گیا۔ اب نہ تو عمارتوں کا شوق تھا اور نہ زیادہ شادیوں کا رواج بلکہ اب لوگوں میں دین اور اس کی اشاعت اور عبادت کا شوق پیدا ہو گیا۔

ہر قوم کی ترقی کا پہلا زینہ علم ہے۔ اس وجہ سے آپ نے شریعت کے احیاء کے لیے دینی تعلیم کی اشاعت کا خاص اہتمام فرمایا۔ آپ نے قاضی ابوبکر بن حزمؒ کو لکھا کہ لوگوں کو چاہیے کہ وہ علم کی بکثرت اشاعت کریں۔ تعلیم کے لیے حلقہ درس میں بیٹھیں تاکہ نہ جاننے والے جان لیں اور جاہل علم سے آشنا ہوں۔ ایک اور گورنر کو لکھا کہ لوگوں کو حکم دو کہ وہ اپنی مسجدوں میں علم کی اشاعت کریں کیونکہ سنت رسولؐ مردہ ہو چکی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ وہ زندہ ہو۔ (سیرۃ عمر بن عبدالعزیز ص ۴)

جب تک علماء فکر معاش سے فارغ البال نہ ہوں وہ توجہ سے علم کی اشاعت نہیں کر سکتے۔ اس وجہ سے آپ نے اپنے گورنروں کو لکھا کہ جو علماء علم کی نشر و اشاعت میں معروف ہیں انہیں فکر معاش سے مطمئن کر دیا جائے تاکہ وہ پوری توجہ سے یہ فریضہ انجام دے سکیں۔ حمص کے گورنر کو لکھا کہ "جن لوگوں نے دنیا کو چھوڑ کر اپنے آپ کو فقہ کی تعلیم کے لیے وقف کر دیا ہے، بیت المال سے ان کا سو سو دینار وظیفہ مقرر کر دیا جائے تاکہ وہ فقہ کی تعلیم و تدریس احسن طریقہ سے انجام دے سکیں۔ (سیرت عمر بن عبدالعزیز ص ۹۵) علماء کے علاوہ طلبہ کے وظائف بھی مقرر فرمائے تاکہ وہ دل جمعی سے علم حاصل کر سکیں۔
(جامع بیان العلم لابن عبدالبر ص ۸۸)

دور افتادہ شہروں میں دینی تعلیم کی اشاعت کے لیے مختلف علماء کو سرکاری طور پر

Marfat.com

بھیجا۔ چنانچہ سیدنا عبداللہ بن عمرؓ کے غلام سیدنا نافعؒ کو جن کا علم حدیث میں ایک نہایت بلند مقام تھا اور جن کا نام آج بھی سند میں سلسلہ الذھب کی حیثیت رکھتا ہے، تعلیم حدیث کے لیے مصر بھیجا۔ (حسن المحاضرۃ للسیوطی جلد ا ص ۱۹۹) قاری جبلؒ بن عامان کو قرآت کی تعلیم کے لیے مصر و مغرب بھیجا۔ (حسن المحاضرۃ جلد ا ص ۱۱۹) یزید بن ابی مالک دمشقی کو اور حارث یجد الاشعری کو بدوؤں کی تعلیم کے لیے مقرر فرمایا۔ ان کے علاوہ جہاں جہاں بھی علم کی نشر و اشاعت کے لیے اساتذہ اور علماء کی ضرورت تھی وہاں موزوں آدمیوں کو بھیجا تاکہ وہ احسن طریق سے تعلیم دے سکیں۔

مسجد دمشق، الجامع الاموی

جس جگہ آج دمشق میں الجامع الاموی بنی ہوئی ہے، قدیم زمانے میں اس جگہ کلدانیوں کے مشہور دیوتا مشتری کا صنم کدہ بنا ہوا تھا۔ کلدانیوں کے عقیدہ کے مطابق دیوتا مشتری دیانتوں اور عبادتوں کا دیوتا تھا۔ جب وہاں عیسائیوں کا قبضہ ہوا تو انہوں نے کلدانیوں کے اس صنم کدہ کو گرجا میں تبدیل کر دیا۔ پھر جب مسلمانوں نے دمشق کو فتح کیا تو یہ شہر آدھا جنگ سے فتح ہوا تھا اور آدھا صلح سے۔ شہر میں مغربی سمت سے سیدنا ابوعبیدہ بن الجراحؓ داخل ہوئے اور مشرقی جانب سے سیدنا خالد بن ولیدؓ لڑتے ہوئے شہر میں داخل ہوئے۔ پھر یہ دونوں اسلامی لشکر گرجا کے پاس آ کر مل گئے۔ (مسالک الابصار جلد ا ص ۱۸۳) اب اسلامی قوانین کی رو سے آدھے شہر کے احکام الگ تھے اور دوسرے آدھے شہر کے احکام جو صلح سے فتح ہوا تھا الگ تھے، لیکن فصیل کے باہر کا حصہ چونکہ جنگ سے فتح ہوا تھا اس لیے اس پر جنگ سے فتح ہونے کا حکم جاری کیا گیا۔ دمشق کے مفتوحہ علاقوں میں مسلمانوں نے تمام پرانے گرجے خواہ وہ جنگ سے فتح کیے تھے یا صلح سے فتح ہوئے تھے، ان کے حال پر چھوڑ دیے اور سیدنا خالد بن ولیدؓ نے اہل دمشق کو یہ تحریر لکھ دی "میں نے تمہاری جانوں، اولاد، اموال اور گرجوں کے بارہ میں امن دے دیا ہے"۔ اس امن نامہ پر سیدنا ابوعبیدہ بن جراحؓ، یزید بن ابی سفیانؓ اور سیدنا شرحبیل بن حسنہؓ نے گواہیاں ثبت کیں۔ (تاریخ مدینہ و دمشق ص ۵۶۹) لیکن بڑے گرجے کو دو برابر حصوں میں تقسیم کر دیا گیا تاکہ صلح و جنگ کی یادگار رہے۔ اس وجہ سے آدھا گرجا عیسائیوں کے پاس رہا اور آدھا

Marfat.com

مسلمانوں کے پاس۔ مسلمانوں نے اپنے آدھے حصہ کو مسجد میں شامل کر دیا اور دونوں فریق ساتھ ساتھ عبادت کرتے رہے۔ پھر مسلمانوں کو عیسائیوں کی عبادت سے اپنی عبادت میں خلل اندازی محسوس ہوتی تھی، اس وجہ سے ولید بن عبدالملک نے اپنے عہد خلافت میں حسن تدبیر کے ساتھ عیسائیوں کی رضامندی سے عیسائیوں کا حصہ بھی مسلمانوں کو دلوا دیا۔ مسلمانوں کے عیسائیوں کے آدھے حصہ کو جو انہوں نے اپنی رضامندی سے مسلمانوں کو دے دیا تھا گرا کر مسجد میں شامل کرلیا اور اس کے عوض میں انہیں کنیسہ مریم دے دیا گیا۔ (مسالک الابصار جلد ا ص ۱۷۹) ولید نے یہاں ایک خوبصورت مسجد بنوائی جس کو "الجامع الاموی" کہا جاتا ہے۔

روایات میں ہے کہ ولید بن عبدالملک نے اس مسجد کی تعمیر کی ابتدا اس سن میں کی جس سن میں عمر بن عبدالعزیزؒ مدینہ منورہ کے گورنر مقرر کیے گئے تھے۔ اس مسجد کی تعمیر بیس سال تک جاری رہی اور اس کی تعمیر میں ۱۲ ہزار معماروں اور کاریگروں نے حصہ لیا یہ اس وقت عجائبات عالم میں شمار ہونے لگی۔ (شذرات الذہب جلد ا ص ۹۷) اس کی تعمیر میں دمشق اور اس کے نواح کے لوگوں نے حصہ لیا اور مصری اور عراقی فوج بھی اس کی تعمیر میں شریک رہی۔ پھر اگر کسی شامی کے پاس ایک پیسہ بھی بچتا تو وہ اسے مسجد کی تعمیر میں بطور چندہ دے دیتا مختلف لوگوں نے سنگ مرمر اور طرح طرح کے پتھر اس مسجد کی تعمیر کے لیے اتنی مقدار میں جمع کر دیے تھے جن کی قیمت کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ اس کی تعمیر کے وقت رنگا رنگ پتھر اور نقش و نگار اس کی دیواروں پر بنائے کہ لوگ دیکھ دیکھ کر حیران بھی ہوتے تھے اور خوش بھی۔ لوگوں کے اس چندہ کے علاوہ ولید بن عبدالملک نے اس کی تعمیر پر چار بڑے بڑے بھرے ہوئے صندوق خرچ کیے جن کی تعداد اڑتالیس ہزار دینار بتائی جاتی ہے۔

اس کی تعمیر پر نہ صرف اندرون ملک کے کاریگر اور معمار تھے بلکہ بیرون ملک سے بھی کاریگروں کی ایک بہت بڑی کھیپ درآمد کی گئی تھی جو ولید نے شاہ روم کو حکم دے کر منگوائے تھے۔ بعض کتابوں میں بیرون ملک سے آئے ہوئے معماروں کی تعداد دو سو بتائی گئی ہے جو اپنے فن میں بہت ماہر تھے۔ (مسالک الابصار جلد ا ص ۱۸۳) معمار مسجد تعمیر کر رہے تھے کہ اسکا ایک گنبد گر گیا۔ ولید ان کی اس چال کو سمجھ گیا۔ ان کی یہ بددیانتی تھی۔

Marfat.com

انہوں نے جان بوجھ کر یہ گنبد کمزور بنایا تھا تاکہ ادھر یہ دمشق چھوڑ کر جائیں ادھر یہ گنبد گر جائے۔ ولید نے خود آ کر اس گنبد کو درست کروایا اور معماروں کی نگرانی پر اپنے بھائی سلیمان بن عبدالملک کو چھوڑ گیا اور اسے تاکید کی کہ مسجد کی تکمیل تک یہیں رہنا اور ہر چھوٹے بڑے کام کو بغور دیکھنا۔ چنانچہ دوسری بار یہ گنبد نہایت مضبوط بنا اور اس کا کلس سونے کا بنوایا گیا۔ مسجد کی تعمیر پر وافر روپیہ صرف ہوتے دیکھ کر اہل دمشق نے یہ افواہ اڑا دی کہ ولید نے ملک کا سارا روپیہ مسجد کی دیواروں اور نقش و نگار پر برباد کر دیا ہے۔ ولید نے انہیں بتایا کہ تم لوگ چونکہ اپنی عمارتوں، حماموں اور دوسری چیزوں پر فخر کرتے ہو اس لیے میں نے تمہارے فخر کے لیے ایک یہ مسجد بھی فراہم کر دی ہے۔ مسجد ابھی پایہ تکمیل نہ پہنچی تھی کہ ولید فوت ہو گیا۔ بعد میں اس کے بھائی سلیمان بن عبدالملک نے اس کو مکمل کروایا۔ اس میں چھ سو زنجیریں سونے کی معلق کی گئیں جن میں قندیلیں لٹکائی گئی تھیں۔ یہ زنجیریں عمر بن عبدالعزیزؒ کے زمانے تک قائم رہیں۔ (حیاۃ الحیوان دمیری جلد ا ص ٦٦)

سلیمان بن عبدالملک کے انتقال کے بعد جب عمر بن عبدالعزیزؒ خلیفہ ہوئے تو عیسائیوں نے ان کے پاس آ کر گرجا کا مطالبہ کیا۔ آپ نے فرمایا: گرجا تو مسجد میں تبدیل ہو گیا ہے لیکن یاد رکھو کہ دمشق کا بیرونی حصہ جنگ سے فتح ہوا تھا، اس وجہ سے تمہارا اس گرجا پر کوئی حق نہیں۔ اگر تم لوگ اصرار کرتے ہو تو ہم تمہارا گرجا تمہیں واپس کر دیں گے مگر توما کا گرجا منہدم کرا دیں گے کیونکہ وہ حصہ بھی جنگ سے فتح ہوا ہے اور وہاں مسجد بنوا دیں گے۔ یہ جواب سن کر عیسائی پریشان ہو گئے۔ چنانچہ انہوں نے کہا کہ ہم یہ گرجا چھوڑ دیتے ہیں آپ اس کے عوض گرجا توما سے دست بردار ہو جائیں۔ ایک روایت میں ہے کہ عیسائیوں نے اس کو منظور نہ کیا۔ آخرکار آپ نے محمد بن سویدا النہری کو لکھا کہ عیسائیوں کو گرجا واپس کر دیا جائے مگر یہ کہ وہ خوشی سے چھوڑنے پر راضی ہوں۔ مسلمانوں کو عمرؒ کا یہ حکم سخت ناگوار گزرا۔ خود گورنر دمشق محمد بن سویدا النہری نے بھی اس کو ناپسند کیا۔ چنانچہ اس نے علماء وقت سے مشورہ کیا اور انہیں بتایا کہ کیا ہم انہیں مسجد دے دیں حالانکہ ہم نے اس میں اذانیں دی ہیں، نمازیں پڑھیں ہیں؟ کیا مسجد منہدم کروا کر گرجا بنوا دی جائے گی؟

علماء میں سے ایک شخص نے کہا کہ عیسائیوں کے شہر کے اردگرد بڑے بڑے گرجے ہیں جیسے دیر مران، توما اور الراہب وغیرہ۔ اگر عیسائی اپنا یہ گرجا مانگتے ہیں تو ہم

Marfat.com

انہیں دینے کے لیے تیار ہیں لیکن شہر کے ارد گرد کے تمام گرجے منہدم کرا دیے جائیں گے اگر وہ یہ گرجے نہیں گروانا چاہتے تو وہ ہمارے لیے یہ گرجا چھوڑ دیں جو مسجد میں تبدیل ہو گیا ہے۔ اس کے عوض میں ہم ان کے تمام گرجے چھوڑ دیں گے اور اس سلسلہ میں ہم انہیں ایک دستاویز لکھ کر دے دیتے ہیں۔ جب یہ تجویز عیسائیوں کے سامنے رکھی گئی تو تین روز کے غور وفکر کے بعد انہوں نے محمد بن سوید گورنر دمشق سے کہا کہ ہمیں یہ تجویز منظور ہے۔ یہ تجویز خلیفہ عمرؒ کو بھی لکھ کر بھیج دی گئی۔ انہیں بھی اس تجویز سے خوشی اور مسرت ہوئی، چنانچہ آپ نے عیسائیوں کو اس بارہ میں ایک تحریر لکھ دی کہ ان کے گرجے انہدام اور رہائش سے محفوظ و مصئون رہیں اور اس تحریر پر کئی گواہوں نے بھی دستخط کیے۔

(کامل ابن اثیر جلد ۵ ص ۵)

عیسائیوں کے ساتھ تنازعہ تو ختم ہو گیا لیکن ایک اور مسئلہ اس بارہ میں اٹھ کھڑا ہوا، وہ یہ کہ عمرؒ نے مسند نشین خلافت ہوتے ہی ملک میں اصلاحات کرنی شروع کر دیں۔ ان اصلاحات کا مقصد لوگوں کی معاشرتی اور معاشی حالت کو بہتر بنانا تھا۔ آپ نے دیکھا کہ بیت اللہ، مسجد نبوی اور دمشق کی الجامع الاموی پر سونے کے پترے، قندیلیں لٹکانے کے لیے سونے کی زنجیریں اور رنگارنگ پتھر لگے ہوئے ہیں۔ عمرؒ کے نزدیک لوگوں میں عدل گستری اور ان کی معاشی اور اقتصادی حالت کو بہتر بنانا اور شہروں کی تنظیم وغیرہ مساجد اور بیت اللہ پر سونے کے پترے چڑھانے سے بہتر تھا۔ چنانچہ آپ نے غور وفکر کے بعد فرمایا: میں نے کچھ مال ایسے دیکھے ہیں جو ناحق خرچ کیے گئے ہیں۔ ان کے خرچ کرنے کا کوئی جواز نہیں۔ میں انہیں تلاش کر کے واپس لینے والا ہوں۔ میں ان عمارتوں سے رنگ رنگ کے پتھر اتار کر وہاں پلستر کروا دوں گا اور سونے کے پترے اور زنجیریں اتار کر سرکاری بیت المال میں جمع کروا دوں گا اور ان کے عوض وہاں قندیلوں کو رسیوں سے لٹکا دوں گا خواہ وہ اشیاء مسجد نبوی کی ہوں یا دمشق کی مسجد کی یا کسی اور جگہ کی۔ چنانچہ عمرؒ نے سب سے سونے کی زنجیریں اتروائیں اور انہیں فروخت کر کے ان کی قیمت بیت المال میں جمع کرا دی اور وہاں سونے کی جگہ اور دھاتوں کی زنجیریں لٹکا دیں۔ (حیاۃ الحیوان جلد ۱ ص ۶۶)

اہل دمشق کو عمرؒ کا یہ فعل سخت ناگوار گزرا۔ چنانچہ اشراف دمشق کا ایک وفد جن میں خالد بن عبداللہ قسری بھی تھے، عمرؒ سے ملا۔ خالد بن عبداللہ نے خلیفہ عمرؒ سے سلسلہ کلام

شروع کیا اور کہا: ''امیر المومنین! ہمیں پتہ چلا ہے کہ آپ فلاں فلاں کام کرنا چاہتے ہیں''۔ آپ نے فرمایا ''ہاں''۔ خالد نے کہا ''بخدا! ایسا کرنا درست نہیں اور نہ ہی آپ کی شان کے مناسب ہے۔ یہ بات سن کر عمرؒ غصہ میں آ گئے اور ان کی رگ فاروقی پھڑک اٹھی۔ آپ نے فرمایا ''ایسا کس کے مناسب ہے؟ کیا تیری کافرہ ماں کے لائق ہے (خالد ایک عیسائی ام ولد کے بیٹے تھے) اگرچہ یہ الفاظ کہنے عمرؒ کی شان کے خلاف تھے لیکن اس وقت غصہ کی حدت میں یہ الفاظ ان کے منہ سے نکل گئے۔ خالد نے جواب میں کہا: ''امیر المومنین! اگر وہ کافرہ تھی تو اس نے بیٹا تو مومن جنا''۔ اس جواب نے عمرؒ کو بحر ندامت میں ڈبو دیا اور انہوں نے جواب دیا کہ تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ اچھا، آپ حضرات کے آنے کا مقصد کیا ہے؟ بخدا! واقعی ایسا میرے لائق نہ تھا۔ خالد نے کہا ''ہم شامی ہیں اور ہمارے بھائی مصری اور عراقی ہیں اور ہم سب مجاہد ہیں۔ ہم میں سے ہر ایک شخص پر ضروری اور واجب ہے کہ روم سے چھوٹے چھوٹے رنگ برنگی پتھروں کا ایک ایک بورا اٹھا کر لے جائے اور ایک ہاتھ مربع سنگ مرمر اٹھا کر لے جائے۔ چنانچہ اسے عراق اور حلب والے لاد کر لاتے ہیں پھر کرایہ دے کر دمشق لاتے ہیں۔ اسی طرح حلب اور شام والے بھی اپنے اطراف سے دمشق لاتے ہیں۔ میں بھی یہی کہنا چاہتا تھا کہ یہ آپ کے لیے مناسب نہ تھا کہ آپ ان پتھروں کو اکھاڑ کر بازار میں فروخت کر کے ان کی رقم بیت المال میں جمع کرا دیں۔ خالد بن عبداللہ قسری کے منہ سے یہ بات سن کر عمر بن عبدالعزیزؒ خاموش ہو گئے۔ لیکن یہ خاموشی اس وجہ سے نہ تھی کہ عمرؒ اپنے ارادے سے باز آ گئے تھے بلکہ وہ بدستور اپنے ارادے پر مصر رہے اور اپنے اس ارادہ کو عملی جامہ پہنانے پر اتر آئے۔ آپ نے چاہا کہ سب سے پہلے مسجد دمشق کے قبہ سے سونا اتارا جائے کیونکہ یہ نمازیوں کی نماز میں خلل ڈالتا ہے۔ لوگوں نے جب امیر المومنین کے اس ارادے کو بھانپا تو عرض کیا ''امیر المومنین! اس قبہ پر مسلمانوں کا مال اور ان کی عطیات و ہدایا صرف ہوئے ہیں۔ اگر آپ اس کا سونا اتار دیں گے تو کوئی مفید نتیجہ برآمد ہونے والا نہیں۔ آپ نے مسلمانوں کے اس اعتراض پر اس کو چونے سے سفید کرنے کا ارادہ فرمایا۔ آپ سے کہا گیا: ''ایسا کرنے سے مال کا ضیاع ہوگا؟'' آپ نے پھر اس کو کنکروں سے ڈھانپنا چاہا۔ اس پر آپ سے کہا گیا: کیا آپ بیت اللہ کی نقل اتارنا چاہتے ہیں؟

Marfat.com

آپ اسی کشمکش کی حالت میں تھے کہ آپ کے پاس ڈاک لانے والا آ گیا۔ اس نے مصر کے گورنر کا آپ کو پیغام دیا کہ روم سے ایک کشتی آئی ہے جس میں دس رومی آئے ہیں جو امیر المومنین سے ملاقات کے خواہاں ہیں۔ آپ نے ملاقات کی اجازت تو دے دی لیکن ان کے ساتھ مسلمان بطور جاسوس لگا دیا اور حکم فرمایا کہ وہ ان کی تمام باتیں مجھ تک پہنچا دیں۔ وہ دس رومی دمشق پہنچ کر باب برید کے پاس قیام پذیر ہوئے۔ پھر وہ اجازت لے کر مسجد دمشق میں داخل ہوئے اور اس دروازے پر پہنچے جو قبلہ رخ ہے۔ یہاں انہوں نے سر اٹھا کر جو مسجد کا گنبد دیکھا تو ان کے رئیس نے پوچھا "اسلام کی کتنی مدت ہے؟" دوسرے نے جواب دیا "سو سال"۔ یہ سن کر وہ رئیس بے ہوش ہو کر گر پڑا۔ جب وہ ہوش میں آیا تو اس کے ساتھیوں نے اس سے رومی زبان میں پوچھا: آپ بے ہوش کیوں ہو گئے تھے؟ اس نے جواب دیا میں اس عظیم الشان عمارت کو دیکھ کر خوشی اور مسرت سے بے ہوش ہو گیا تھا۔ عمرؒ کو جب اس بات کی اطلاع ملی تو آپ نے فرمایا کہ چونکہ دشمن نے مجھے غصہ دلا دیا ہے لہٰذا اب مسجد کے گنبد کا سونا نہیں اتاروں گا تا کہ اس کی عظمت و سطوت قائم رہے۔
(مسالک الابصار جلد ا ص ۱۹۰۔۱۹۲)

اشاعت اسلام

ایک اسلامی حکومت کا مقصد اسلام کی نشر و اشاعت ہے لیکن بزور اور تخویف کے ذریعہ سے کسی کو مسلمان بنانے کی سخت مخالفت کی گئی ہے۔ چنانچہ قرآن حکیم میں ہے "لا اکراہ فی الدین" یعنی دین میں کسی پر کوئی جبر نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نجران کے عیسائی آپ کی خدمت میں مدینہ طیبہ حاضر ہوئے اور آپ سے مصالحت کر کے جزیہ دینا قبول کیا تو سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو عہد نامہ لکھ کر ان کو دیا اس میں مسلمانوں کی جانب سے یہ اقرار تھا کہ نجران کے عیسائیوں کو کسی صورت بھی مذہب کی تبدیلی پر مجبور نہ کیا جائے گا اور نہ ہی ان سے عشر لیا جائے گا۔ (فتوح البلدان) یہ ہے شریعت اسلامیہ کا حکم اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طرز عمل۔

جب صاحبان اقتدار اپنے عیش و عشرت کی فکر میں ہوں تو انہیں پھر اشاعت اسلام کی کوئی فکر نہیں ہوتی۔ سیدنا عمر بن عبدالعزیزؒ نے سلطنت اسلامیہ کی حدود میں توسیع

Marfat.com

کے بجائے اسلام کی توسیع واشاعت کو اپنا مقصد حکومت قرار دیا اور اس کے لیے ہر قسم کی مادی اور اخلاقی ذرائع بھی اختیار فرمائے۔ چنانچہ فوج کے امراء کو خاص طور پر یہ ہدایت دی گئی تھی کہ رومیوں کے کسی لشکر اور کسی جماعت کے ساتھ اس وقت تک جنگ نہ کی جائے جب تک کہ انہیں اسلام کی دعوت نہ دے دی جائے۔ (طبقات ابن سعد جلد ۵ ص ۲۵۰) اور تمام گورنروں کو یہ ہدایت دی گئی تھی کہ ذمیوں کو اسلام کی دعوت دی جائے اور جو ذمی اسلام کو قبول کر لے اس کا جزیہ معاف کر دیا جائے۔ اسلام چونکہ ایک دعوتی دین ہے اور اس کی نشر واشاعت کا مدار دعوت پر ہے۔ چنانچہ آپ کے اس دعوتی طریقہ سے اسلام کی بڑی اشاعت ہوئی۔ تنہا جراح بن عبداللہ حکمی والی خراسان کے ہاتھوں پر چار ہزار ذمی مسلمان ہوئے (طبقات ابن سعد جلد ۵ ص ۲۸۵) اسماعیل بن عبداللہ ابی المہاجر والی مغرب کی تبلیغ سے سارے مغرب میں اسلام پھیل گیا۔ (فتوح البلدان ص ۳۵۷) اور مختلف شہروں اور علاقوں میں اس دعوت سے ذمی اس کثرت سے مسلمان ہوئے کہ متعدد گورنروں کو خراج اور جزیہ کی آمدنی گھٹ جانے کا خدشہ لاحق ہوگیا۔ چنانچہ انہوں نے امیر المومنین کو اس جانب توجہ بھی دلائی لیکن سیدنا عمر بن عبدالعزیزؒ نے اس بات کی مطلق پروانہ کی۔ بعض گورنروں کو انہوں نے یہ لکھا کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے ہادی بنا کر بھیجا تھا نہ کہ محصل خراج بنا کر"۔ (مقریزی جلد ا ص ۱۲۵) اور بعضوں کو لکھا کہ "میں یہ بات پسند کرتا ہوں کہ سارے ذمی مسلمان ہو جائیں اور ہماری تمہاری حیثیت صرف ایک کاشتکار کی رہ جائے کہ ہم اپنے ہاتھوں سے روزی کما کر کھائیں۔ (سیرۃ عمر بن عبدالعزیز لابن جوزی ص ۹۹) بعض گورنروں نے آپ کو یہ تجویز پیش کی کہ ذمی چونکہ جزیہ کے خوف سے مسلمان ہوئے ہیں لہٰذا ختنہ کر کے ان کا امتحان لیا جائے کہ وہ خلوص سے مسلمان ہوئے ہیں یا صرف جزیہ معاف کرانے کے لیے۔ آپ نے ان کو لکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہادی وراہنما تھے خاتن نہ تھے۔ (طبقات ابن سعد جلد ۵ ص ۲۸۵)

سیدنا عمر بن عبدالعزیزؒ کے دل میں یہی جذبہ ہر وقت انگڑائیاں لیتا رہتا کہ اسلام زمین کے کونہ کونہ میں پھیل جائے اور لوگ غلط راہ چھوڑ کر صحیح راستہ پر گامزن ہو جائیں۔ آپ نہایت زور شور سے علماء کو لکھتے کہ ذمیوں کو اسلام کی دعوت دو۔ ذمیوں کے مسلمان ہونے کی صورت میں اگر کوئی حاکم سرکاری خزانہ کے خالی ہونے کی شکایت کرتا تو

Marfat.com

آپ اسے ڈانٹ دیتے تھے۔ ایک مرتبہ آپ نے عبدالحمید بن عبدالرحمٰن کو لکھا: ''تم نے مجھے لکھا ہے کہ حیرہ کے بہت سے یہودی، عیسائی اور مجوسی مسلمان ہیں حالانکہ ان کے ذمہ جزیہ کی بھاری رقم واجب الادا ہے۔ تم نے مجھ سے ان سے جزیہ وصول کرنے کی اجازت طلب کی ہے۔ یاد رکھو! اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خیر کی دعوت دینے والا بنا کر بھیجا جزیہ وصول کرنے والا بنا کر نہیں بھیجا۔ اگر غیر مسلم دائرہ اسلام میں داخل ہو جائیں تو ان کے مال میں صدقہ ہے جزیہ نہیں۔ ان کی میراث ان کے اعزاء و اقرباء کے لیے ہے۔ اگر وہ ان میں سے نہیں ہوں تو اس کی میراث مسلمانوں کے بیت المال میں جمع ہوگی اور اگر وہ کوئی خیانت کرے گا تو اس کی طرف سے اس مال سے دیت دی جائے گی۔

(کتاب الخراج لابی یوسف ص ۱۳۶)

عمر بن عبدالعزیزؒ اور ان کے گورنروں کی سوچ میں بڑا فرق پیدا ہوگیا تھا۔ گورنروں کی سوچ مال اکٹھا کرنا تھی اور عمرؒ کو اسلام کی اشاعت کی فکر تھی۔ چنانچہ آپ کے زمانے میں مصر کا خراج کم ہونے لگا کیونکہ اکثر قبطی دائرہ اسلام میں داخل ہوگئے تھے۔ مصر کے گورنر نے چاہا کہ نومسلم قبیلوں سے جزیہ وصول کیا جائے لیکن سیدنا عمرؒ نے صاف انکار کر دیا اور یہ لکھا کہ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو داعی بنا کر بھیجا تھا جزیہ وصول کرنے والا بنا کر نہیں بھیجا تھا۔ عدی بن ارطاط کو جب اس نے خراج کے گھٹنے کی شکایت کی، لکھا ''میں تمہارے خط کا مطلب سمجھ گیا۔ بخدا! میری تو یہ تمنا ہے کہ تمام لوگ مسلمان ہو جائیں تاکہ ہم اور تم کسان بن کر اپنے ہاتھوں سے کما کر کھائیں۔

(سیرۃ ابن جوزی ص ۱۰۰، کتاب الخراج لابی یوسف ص ۸۶)

افریقہ میں ایک جماعت بربر تھی جو سیدنا معاویہؓ کے زمانہ میں بہت تنگ کرتی تھی۔ یہ پہلے موسیٰ بن نصیر کے ہاتھ پر مسلمان ہوگئی۔ پھر جب سنہ ۱۰۰ھ میں افریقہ کے گورنر اسماعیل بن عبداللہ بن ابی مہاجر ہوئے تو چونکہ آپ جنگ، خراج اور صدقات کے رئیس تھے اور نہایت اعلیٰ اخلاق کے حامل تھے اس لیے تمام بربر مسلمان ہوگئے اور کوئی بھی غیر مسلم نہ رہا۔

(فتوحات واخبار مصر ص ۲۱۳، ابن الاثیر جلد ۵ ص ۱۰، ظہر الاسلام جلد ۱ ص ۱۲۹۳ احمد امین)

آپ کے جذبہ تبلیغ اسلام اور پھر اس پر مستزاد یہ کہ آپ کے محاسن اخلاق کی

Marfat.com

شہرت کے پیش نظر کچھ ممالک نے آپ کو بذات خود اسلام کے مبلغ بھیجنے کے لیے لکھا کیونکہ اسلام کی طرف ان کا میلان ہوگیا تھا۔ چنانچہ تبت سے کچھ وفود آپ کے خدمت میں حاضر ہوئے اور انہوں نے آپ سے مبلغ بھیجنے کی درخواست کی۔ان کی درخواست کو شرف قبولیت بخشتے ہوئے آپ نے سلیط بن عبداللہ حنفی کو تبت میں اسلام کی تبلیغ کے لیے بھیجا (ملاحظہ ہو تاریخ یعقوبی جلد ۲ ص ۳۶۲) چنانچہ مورخین کے قول کے مطابق آپ کے زمانہ میں اسلام کی غیر معمولی نشرواشاعت ہوئی اور ہر طرف اسلام کا شہرہ پھیل گیا۔

آپ خلافت کو شورائی بنانا چاہتے تھے

اسلام نے خلافت کو شورائی بنایا ہے اور مسلمانوں کو ہر معاملہ میں باہمی مشورہ کا حکم دیا ہے۔ لیکن گذشتہ کئی سالوں سے خلافت نے شہنشاہیت کا روپ دھار لیا ہوا تھا۔ سیدنا عمر بن عبدالعزیزؒ خلافت کو پھر اسی طریق پر لانا چاہتے تھے اور وہ شوریٰ کا طریق تھا۔ بعض حضرات یہ سمجھتے ہیں کہ وہ خلافت کو جمہوری بنانا چاہتے تھے۔ آج کل چونکہ مغرب زدگی کی وجہ سے جمہوریت کا بھوت ہمارے سروں پر سوار ہے، اس وجہ سے ہمیں اب ہر جگہ جمہوریت ہی نظر آتی ہے، جیسے ساون کے اندھے کو ہرا ہی ہرا نظر آتا ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ ہمارے سادہ دل لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ جمہوریت صرف اکثریت کی حکومت کا نام ہے۔ حالانکہ بات ایسی نہیں ہے۔ بلکہ جمہوریت ایک مکمل فلسفہ حیات اور پورا نظام زندگی ہے جو زندگی کے تمام شعبوں پر محیط ہے۔ پروفیسر ڈوئی (DOWEY) اپنی کتاب Ethics of Democracy میں لکھتے ہیں کہ:

"یہ کہنا کہ جمہوریت صرف ایک خاص طرز حکومت کا نام ہے بالکل اسی طرح ہے جیسے یہ کہا جائے کہ مکان صرف اینٹوں کا مجموعہ ہے یا گرجا ایک ایسی عمارت کا نام ہے جو کلس اور منبر پر مشتمل ہے۔" (صفحہ ۱۵)

جمہوریت ایک خلاف اسلام نظریہ ہے

جو حضرات جمہوریت کو اسلامی سمجھتے ہیں یا اسلامی نظام خلافت کو جمہوری سمجھتے ہیں۔ وہ نہ صرف جمہوریت سے ناآشنا ہیں بلکہ اسلامی نظام کی حقیقت سے بھی ناواقف ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جمہوریت کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ ایک سراسر خلاف اسلام

نظریہ ہے۔ جس کے چند موٹے دلائل حسب ذیل ہیں۔

۱۔ جمہوریت کے خلاف اسلام ہونے کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ جمہوریت میں حاکمیت اعلیٰ عوام کی ہوتی ہے جب کہ اسلامی نظام حکومت میں حاکمیت اعلیٰ صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کی ہوتی ہے۔ گویا جمہوریت میں عوام اللہ رب العزت کے مقابل میں ٹھہرتے ہیں۔

سروری زیبا فقط اس ذات بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اک وہی باقی بتان آذری

۲۔ جمہوریت سرمایہ دارانہ نظام کی ایک فرع ہے۔ اس میں امیر لوگ، جاگیردار اور وڈیرے برسر اقتدار آتے ہیں کیونکہ جمہوریت کا مقصد وحید یہ ہے کہ اقتدار کی باگیں عوام کے منتخب نمائندوں جو کہ وڈیرے اور جاگیردار ہوتے ہیں، کے ہاتھوں میں دے دی جائیں۔ نظری طور پر اگرچہ جمہوری ریاست کے ہر فرد کو حاکمیت کے حقوق حاصل ہیں اور کار پردازان حکومت ان کے ترجمان ہوتے ہیں لیکن عملاً حکومت سرمایہ دارانہ اور جاگیردارانہ طبقہ کی خواہشات کے مطابق ہی کی جاتی ہے اور اس طرح ریاست کے باشندوں کا ایک طبقہ دوسرے طبقے کو حاکمیت سے یکسر محروم کر کے ان پر اپنی خواہشات کو مسلط کر دیتا ہے۔ وڈیروں، سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کی سب سے بڑی خواہش یہی ہے کہ اپنے اور اپنے ہم نوا لوگوں کے لیے زیادہ سے زیادہ فوائد حاصل کریں اور مخالفین کو جس قدر ممکن ہو نقصان پہنچائیں۔ ملک کے سارے معاشی ذرائع اس مختصر سے طبقہ کے ہاتھ میں ہوتے ہیں۔ عدالتیں، پریس اور مسلح افواج اسی کے اقتدار کی محافظ اور پاسبان ہوتی ہیں۔ ان حالات میں اگر ملک کے غریب عوام اور مظلوم طبقے ظلم و استبداد کے خلاف آواز بلند کر کے اپنے حالات میں کوئی خوشگوار تبدیلی لانا چاہیں تو وہ سارے راستے مسدود پاتے ہیں۔ اور اگر وہ دادرسی کے سارے آئینی راستوں کو بند پا کر غیر آئینی راستوں کو اختیار کرنے پر مجبور کر دیے جائیں تو یہ نام نہاد عوامی اور جمہوری حکومت ملوکیت سے زیادہ سفاک بن جاتی ہے۔ پھر نہ مساجد کی حرمت قائم رہتی ہے اور نہ پارلیمنٹ کی۔ لوگوں کو گولیوں سے چھلنی کر دیا جاتا ہے۔ مساجد کے فرش عوام کے خون سے لالہ گوں ہو جاتے ہیں اور مخالف اور غریب نمائندگان پارلیمنٹ کو فوج کی وساطت سے اسمبلیوں سے باہر پھینک دیا جاتا ہے۔

اس نظام کو چلانے والے وہ لوگ ہوتے ہیں جو بالعموم سرمایہ داروں کے طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہ مسند اقتدار پر آتے ہی اس لیے ہیں کہ اپنے حقوق کی ہر طرح سے حفاظت کر سکیں، اس لیے ان کے وجود سے ان کے اپنے گروہ کے آدمی تو داد عیش دیتے ہیں، لیکن دوسرے طبقے خصوصاً بندہ مزدور اور ہاریوں کے اوقات نہایت تلخ ہو جاتے ہیں۔

۳۔ جمہوریت چونکہ سرمایہ دارانہ نظام کی ایک فرع ہے لہذا اس میں امراء کے عیش وعشرت کے لے غرباء دن رات مختلف قسم کی صنعتوں میں ڈھور ڈنگروں کی طرح کام کریں گے۔ امراء کی قوت خرید زیادہ ہو گی اور غرباء کی کم۔ نتیجہ یہ ہو گا کہ امراء دن بدن امیر تر اور غرباء روز بروز غریب تر ہوتے چلے جائیں گئے اور امراء کو امیر تر بنانے کے لیے غرباء ذلت کے گڑھے میں گرتے چلے جائیں گئے اور معاشی زبوں حالی کا شکار ہو کر بے دین، ملحد اور اشترا کی ہو جائیں گے۔ کیونکہ جمہوریت کا ردعمل اشتراکیت ہے۔

امراء کا منتہائے مقصود چونکہ دنیوی فوائد ولذائذ سمیٹنا ہوتا ہے، اس وجہ سے ان کی نظروں سے حلال وحرام اور جائز وناجائز کی تمیز اوجھل ہو جاتی ہے۔ انہیں اس بات کی بالکل فکر نہیں رہتی کہ ان کی آمدنی کے ذرائع کن کن طریقوں سے معاشرہ میں ظلم وستم، بے حیائی اور بدمعاشی کو ترقی دے رہے ہیں۔ دولت کے پجاری ہونے کی حیثیت سے ان کا نقطہ نظر صرف یہی رہ جاتا ہے کہ جس طرح سے بھی ممکن ہوں زیادہ سے زیادہ دولت سمیٹ لی جائے۔ اگر ان کی آمدن شراب اور ہیروئن کی فروخت، رقص وسرور کی محفلیں سجانے، فحش اور اخلاق سوز لٹریچر کی اشاعت سے بڑھتی ہے تو وہ فوراً ان کاموں میں اپنا روپیہ لوٹا دیتے ہیں اور وہ اس بات کو قطعاً محسوس نہیں کرتے کہ ان کی ان حرکات سے معاشرہ کو کیا نقصان پہنچا ہے۔ نوجوان نسل میں کتنی آوارگی پیدا ہوئی ہے۔ نشہ آور چیزوں سے کتنے گھر برباد ہوئے ہیں۔ کتنی عصمتیں لٹیں ہیں اور کتنی عفتیں برباد ہوئی ہیں۔ ان کے دل خوف خدا اور آخرت کی جواب دہی سے بالکل خالی ہو جاتے ہیں اور معاشرہ کے مختلف طبقات کے مصائب وآرام کو دیکھ کر ان کے اندر معمولی سا ارتعاش بھی پیدا نہیں ہوتا۔ جب سرمایہ ان کاموں میں لگے گا جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے تو نتیجہ میں فیکٹریاں اور بڑے بڑے کارخانے بند ہو جائیں گے کیونکہ وہ سمجھیں گے کہ ان طریقوں سے زیادہ آسانی کے ساتھ روپیہ سمیٹا جا سکتا ہے۔ پھر فیکٹریوں کے جھنجھٹ میں کون پڑے۔ اس سے ملک میں بے روزگاری

Marfat.com

بڑھے گی اور معاشرہ میں بے شمار معاشی پیچیدگیاں اور ان گنت اخلاقی اور ذہنی بیماریاں پیدا ہوں گی۔

۴۔ جمہوریت میں پارلیمنٹ کے اندر دو گروہوں کا ہونا ضروری ہے۔ ایک حزب اقتدار اور دوسرا حزب اختلاف۔ اقتدار کا مقصد اپنی مرضی کے مطابق قوانین بنانا اور عوام پر ٹھونسنا ہوتا ہے جب کہ حزب اختلاف کی غرض وغایت حزب اقتدار کی ہر بات کی مخالفت ہوتی ہے، حتی کہ اگر حزب اقتدار شریعت بل بھی پیش کرے تو حزب اختلاف اس کی بھی مخالفت کرے گا۔ اس کے برعکس اسلام کے نظام حکومت میں کوئی حزب اختلاف ہے اور نہ کوئی حزب اقتدار، بلکہ پارلیمنٹ کا ہر رکن حزب اقتدار میں بھی ہوتا ہے اور حزب اختلاف میں بھی ہوتا ہے۔ سربراہ مملکت اگر درست بات کرتا ہے تو پارلیمنٹ کا ہر فرد اس کی حمایت کرے گا، لیکن اگر وہ نادرست اور غلط بات کرتا ہے۔ تو ہر فرد کا یہ حق ہے۔ کہ اس کی مخالفت کرے۔ اس کو راہ راست پر لائے۔ اس بات کو مختصر لفظوں میں یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ جمہوریت میں اختلاف (Agree to Differ) کے اصول کے تحت ہوتا ہے۔ جبکہ اسلام میں اختلاف (Differ to Agree) کے اصول کے تحت ہوتا ہے۔

۵۔ یہ جو کہا جاتا ہے کہ جمہوریت میں عوام اور جمہور کی حکومت ہوتی ہے یہ بھی سراسر غلط ہے۔ جمہوریت بھی بالواسطہ ایک ڈکٹیٹر شپ ہوتی ہے بلکہ عام ڈکٹیٹر شپ سے زیادہ بدتر ہوتی ہے کیونکہ ڈکٹیٹر شپ میں تو پھر بھی کچھ احتجاج ہو سکتا ہے، لیکن جمہوریت کے بارہ میں عوام کو یہ فریب دیا جاتا ہے۔ کہ حکومت تو تمہاری اپنی ہے۔ تمہی نے ووٹ دے کر ہمیں اپنے نمائندے مقرر کیا تھا لہذا ہم کچھ نہیں کر رہے۔ بلکہ تم ہی سب کچھ کر رہے ہو۔ اس طریقہ سے عوام کے احتجاج کا گلہ گھونٹ دیا جاتا ہے۔ جمہوریت کس طرح ڈکٹیٹر شپ ہے اس کے تفصیل ہم نے اپنی کتاب فتنہ جمہوریت میں دی ہے۔ وہاں ملاحظہ فرمائیں۔

۶۔ اسلامی نظام حکومت اور جمہوریت میں ایک واضح فرق یہ بھی ہے۔ کہ اسلامی نظام حکومت میں بندوں کو تولا جاتا ہے۔ جب کہ جمہوریت میں بندوں کو گنا جاتا ہے۔ چنانچہ اقبالؒ نے کہا ہے:

جمہوریت وہ طرز حکومت ہے کہ جس میں
بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے

مشہور ماہر سیاسیات ڈاکٹر برکے (Burke) نے جمہوریت کی اسی خرابی کے بارہ میں لکھا ہے:

"جمہوریتوں کی تاریخ یہ بتاتی ہے۔ کہ جمہوریت کی یہ شرائط شاذ ونادر ہی کبھی پوری ہوئی ہیں۔ علمی اعتبار سے جمہوریت دراصل جہالت کی حکمرانی کا نام ہے۔ اس کی ساری توجہ کمیت اور تعداد پر رہتی ہے۔ اس میں ووٹ گنے جاتے ہیں انہیں تولا نہیں جاتا"۔

بہرحال جمہوریت کے بارہ میں یہ چند دلائل تھے۔ جو ہم نے بیان کیے ہیں۔ یہ اسلام سے الگ ایک نظریہ حکومت ہے۔ اسلام سے اس کا کوئی تعلق نہیں لہذا یہ کہنا کہ سیدنا عمر بن عبدالعزیزؒ جمہوری اقدار کا احیاء کرنا چاہتے تھے بالکل غلط ہے۔ آپ اسلام کے شورائی نظام کو پھر سے زندہ کرنا چاہتے۔ جس کو اموی خلفاء نے پامال کر دیا ہوا تھا۔

شورائیت کے اقدامات اور بے بسی

اگرچہ آپ کی دلی تمنا نظام خلافت کو شورائی بنانا تھا لیکن اس کا مستقل تغیر اور تبدیلی آپ کے بس میں نہ تھی کیونکہ اب شاہی خاندان کی موروثی ملوکیت اصولی حیثیت سے مستحکم اور مسلم ہو چکی تھیں اور عام مسلمان بھی اس کے عادی اور خوگر ہو چکے تھے۔ عمر بن عبدالعزیزؒ نے بعض مواقع پر اپنی بے بسی کا اظہار بھی فرمایا تھا۔ چنانچہ ایک مرتبہ فرمایا کہ خلافت کا معاملہ میرے اختیار میں ہوتا تو میں اپنے بعد قاسم بن عبداللہ کو خلیفہ بنا دیا۔ (طبقات ابن سعد جلد ۵ ص ۲۵۴) ایک مرتبہ بنوامیہ کے کچھ لوگوں نے اکٹھے ہو کر آپ سے کہا کہ گذشتہ خلفاء ہمارے ساتھ جو حسن سلوک اور الطاف خسروانہ کرتے تھے آپ نے ان سب میں کمی کر دی ہے جس کی وجہ سے ہمارے عیش وآرام اور گذران میں مشکلات پیدا ہو گئی ہیں۔ اس طریقہ سے انہوں نے آپ پر نہایت برہمی کا اظہار کیا۔ آپ نے ان کی ان سب باتوں کو نہایت غور سے سُنا اور دھمکی آمیز لہجے میں فرمایا: "اگر آئندہ پھر تم نے اس قسم کی باتیں کیں تو سُن لو! میں نہ صرف تمہارا شہر بلکہ عنان خلافت چھوڑ کر مدینہ طیبہ چلا جاؤں گا اور خلافت کا معاملہ شوریٰ پر چھوڑ دوں گا۔ میں اس کے اہل (قاسم بن عبداللہ) کو اچھی طرح پہچانتا ہوں (طبقات ابن سعد جلد ۵ ص ۲۵۳) یہ جواب سُن کر وہ اپنا سا منہ لے کر

Marfat.com

چلے گئے۔

ملوکیت امتیازات کا خاتمہ

اسلام ایک نہایت سادہ دین ہے۔ اس میں کوئی تکلفات نہیں ہیں۔ اسلام کی اس سادگی کو خلفائے راشدین نے قائم رکھا اور مسند خلافت پر بیٹھنے کے باوجود اپنی زندگی نہایت سادہ اور زہد وقناعت سے گذاری، خصوصی طور پر سیدنا عمر فاروقؓ نے دنیا میں سادگی اور زہد وقناعت کی وہ مثال پیش کی کہ چشم آفتاب اس کو دوبارہ دیکھنے کے لیے آج تک ترس رہی ہے۔ سیدنا طلحہؓ فرمایا کرتے تھے۔ کہ قدامت اسلام اور ہجرت کے لحاظ سے بہت سے لوگوں کو سیدنا فاروق اعظمؓ پر فوقیت حاصل ہے۔ لیکن سادگی اور زہد میں وہ سب سے بڑھے ہوئے ہیں۔ قیصر وکسریٰ کی فوجیں ہر محاذ پر شکست کھا رہی ہین۔ مختلف محاذوں پر جرنیلوں اور کمانڈروں کو خطوط لکھے جا رہے ہیں۔ پوری دنیا کے بادشاہوں پر آپ کی شخصیت کی ہیبت طاری ہے لیکن ان کی اپنی حالت یہ ہے کہ کئی کئی پیوند لگا کرتہ زیب تن ہے۔ عمامہ پھٹا ہوا، چپل بوسیدہ، بیوہ عورتوں کے گھروں میں پانی بھرنے کے لیے مشک کاندھے پر، سونے کے لیے خاک کا بستر، چشم فلک نے ایسا سربراہ کم ہی دیکھا ہوگا۔ ایک مرتبہ ایک شخص کو اپنا موٹا کرتہ پیوند لگانے کے لیے دیا۔ اس نے بجائے اس پرانے کرتے کے ایک نرم وملائم کپڑے کا کرتہ پیش کیا۔ سیدنا عمرؓ نے وہ نرم وملائم کرتہ اس کو واپس کر دیا اور اپنا وہی کرتہ لے کر فرمایا: ''یہی اچھا ہے کیونکہ اس میں پسینہ خوب جذب ہوتا ہے''۔
(کنزالعمال جلد ۶ ص ۳۵۰)

بار بار دیکھا گیا کہ مدینہ سے مکہ مکرمہ حج کے لیے جا رہے ہیں۔ دوران سفر خیمہ یا شامیانہ کبھی ساتھ نہیں رکھا۔ جہاں ٹھیرے وہیں کسی درخت کے نیچے چادر ڈال کر سو رہے۔ طبقات ابن سعد کی روایت ہے۔ کہ آپ کا روزانہ خانگی خرچ صرف دو درہم تھا۔ آج کل کے حساب سے اس کا حساب لگا لیں۔ (منتخب الکنز جلد ۴ ص ۴۱۱)

غذا نہایت سادہ اور معمولی تھی۔ عموماً روٹی اور روغن زیتون دسترخوان پر ہوتا تھا۔ روٹی بغیر چھنے آٹے کی ہوتی جسے مہمانوں اور سفراء کو کھانے میں تکلیف ہوتی، کیونکہ وہ ایسی معمولی غذا کھانے کے عادی نہیں ہوتے تھے۔ ایک مرتبہ فرمایا: ''قسم ہے اس ذات کی جس

Marfat.com

کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے اگر قیامت کا خوف نہ ہوتا تو میں بھی تم لوگوں کی طرح دنیوی عیش وعشرت کا دلدادہ ہوتا"۔ (کنزالعمال جلد ۶ ص ۳۴۶)

سیدنا عمرؓ جب ایلیا تشریف لائے تو آپ نے وہاں کے اسقف (پادری) کو اپنا کرتہ دیا جس میں کئی پیوند لگے ہوئے تھے اور جو نیچے سے لمبے سفر کی وجہ سے پھٹ گیا تھا۔ آپ نے پادری سے فرمایا کہ اسے دھو دو اور پیوند لگا دو۔ پادری کرتے کو لے کر گیا اور اس کو دھو کر پیوند لگایا اور اس جیسا ایک اور کرتہ سیا اور اسے لے کر سیدنا عمرؓ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ پادری نے کہا: "یہ آپ کا کرتہ ہے جس کو دھویا ہے اور پیوند لگایا ہے اور یہ دوسرا کرتہ میری طرف سے ہے۔ آپ نے اس کرتے کی طرف دیکھا اور پھر اپنا کرتہ پہن لیا اور دوسرا کرتہ پادری کو واپس لوٹا دیا اور فرمایا: "میرا کرتہ تمہارے کرتے سے بہت اچھا ہے کیونکہ یہ پسینہ خوب جذب کرتا ہے"۔ (منتخب الکنز جلد ۴ ص ۴۰۲)

سیدنا عمرؓ فرمایا کرتے تھے: "خدا کی قسم! میں زندگی کی لذتوں کی پروا نہیں کرتا کہ میں اس بات کا حکم کروں کہ ایک چھوٹی بکری کی کھال نکالی جائے اور وہ بھونی جائے اور یہ حکم دوں کہ اعلیٰ درجے کے گیہوں سے ہمارے لیے روٹیاں بنائی جائیں اور ہمارے لیے کٹے ہوئے مشکیزوں میں نبیذ بنائی جائے اور اس کا رنگ اس طرح ہو جائے جیسے چکور کی آنکھ ہوتی ہے۔ ہم اسے کھائیں اور پئیں۔ لیکن ہم نے یہ ارادہ کیا ہے کہ ہمارا مال آخرت کے لیے باقی رہے کیوں کہ حق تعالیٰ شانہ فرماتے ہیں:

"تم اپنی لذت کی چیزیں اپنی دنیوی زندگی میں حاصل کر چکے ہو اور ان کو خوب برت چکے ہو۔ آج تم کو ذلت کی سزا دی جائے گی۔ اس وجہ سے کہ تم دنیا میں ناحق تکبر کیا کرتے تھے اور اس وجہ سے کہ تم نافرمانیاں کیا کرتے تھے"۔
(الاحقاف:) (حلیۃ الاولیاء لابی نعیم جلد ۱ ص ۴۹)

ایک مرتبہ اپنے عہد خلافت میں سر پر چادر ڈال کر باہر نکلے۔ ایک غلام کو دیکھا کہ گدھے پر سوار جا رہا ہے۔ تھکے ہوئے تھے، لہذا اس سے کہا کہ مجھے بھی اپنے ساتھ بٹھا لو۔ اس نے آپ کی درخواست کے جواب میں فوراً گدھے سے اُتر کر وہ گدھا سواری کے لیے آپ کو پیش کر دیا۔ سیدنا فاروق اعظمؓ نے فرمایا: میں اپنے آرام کے لیے تمہیں تکلیف نہیں دے سکتا۔ تم جس طرح سوار تھے اسی طرح سوار رہو۔ میں تمہارے پیچھے بیٹھ جاؤں

Marfat.com

گا۔ چنانچہ آپ اس غلام کے پیچھے گدھے پر سوار ہو کر مدینہ طیبہ کی گلیوں میں داخل ہوئے اور لوگوں کو امیرالمومنین کو ایک غلام کے پیچھے بیٹھا دیکھ کر نہایت تعجب ہوا۔
(کنزالعمال جلد ۶ ص ۳۴۳)

ایک مرتبہ سیدنا احنف بن قیسؒ رؤسائے عرب کے ساتھ آپ سے ملنے کے لیے گئے۔ دیکھا کہ آپ آستینیں چڑھائے اِدھر اُدھر دوڑ رہے ہیں۔ آپ نے احنفؒ کو دیکھ کر فرمایا: "تم بھی میرا ساتھ دو کیونکہ بیت المال کا ایک اونٹ بھاگ گیا ہے۔ تم جانتے ہوں کہ ایک اونٹ میں کتنے غریبوں کا حق ہے؟"۔ ایک شخص نے آپ کی اس تگ و دو اور جدوجہد کو دیکھ کر کہا: "امیرالمومنین! آپ اس قدر تکلیف کیوں اٹھاتے ہیں؟ کسی غلام کو حکم فرمایئے وہ اس اونٹ کو ڈھونڈ لائے"۔ آپ نے فرمایا:

ای عبد اعبد منی

"یعنی مجھ سے بڑھ کر اور کون غلام ہو سکتا ہے۔"

ایک مرتبہ خطبہ ارشاد فرما رہے تھے۔ خطبہ کے دوران فرمایا: "لوگو! ایک زمانہ میں میں اس قدر نادار اور قلاش تھا کہ لوگوں کو پانی بھر کر دیا کرتا تھا اور وہ اس کے بدلہ میں مجھے کچھ چھوہارے دے دیتے تھے۔ انہی چھوہاروں پر میری گذر بسر تھی"۔ یہ بیان کر کے منبر سے اُتر آئے۔ لوگوں کو آپ کی اس بات سے نہایت تعجب ہوا کہ یہ منبر پر کہنے کی کون سی بات تھی۔ فرمایا: میری طبعیت میں ذرا سا عجب اور غرور آ گیا تھا۔ یہ اس کی دوا تھی"۔

اس طرح کے واقعات سے سیدنا عمرؓ کی زندگی بھری پڑی ہے اور قدم قدم پر ایسے واقعات ملیں گے جن سے پتہ چلتا ہے۔ کہ اتنا پر جلال خلیفہ ہو کر جن کی ہیبت سے قیصر و کسریٰ کانپتے تھے، اتنی سادہ اور عامیانہ زندگی بسر کرتا تھا کہ ایک عام آدمی ان کی پہچان بھی نہیں کر سکتا تھا کہ یہ امیرالمومنین عمرؓ ہیں۔ چنانچہ جب قادسیہ کی جنگ ہو رہی تھی۔ سارے عرب کی نگائیں اس جنگ کے انجام پر لگی ہوئی تھیں اور اسے اپنے ملک کے ثبات و زوال کی میزان سمجھا جا رہا تھا۔ لیکن سب سے زیادہ فکر سیدنا عمرؓ کو تھی۔ وہ صبح ہوتے ہی قادسیہ کے قاصد کے انتظار میں مدینہ طیبہ کے باہر تشریف لے جاتے اور جب سورج کی تمازت تیز ہو جاتی تو واپس آتے۔ ایک روز وہ واپس تشریف لے جا رہے تھے کہ ایک سانڈنی سوار انہیں ملا۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ قادسیہ سے آ رہا ہے۔ سیدنا عمرؓ نے پوچھا

Marfat.com

اللہ کے بندے! وہاں کی کوئی خیر خبر۔ اس نے جواب دیا: "اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو فتح اور ایرانیوں کو شکست دی ہے"۔ سیدنا عمرؓ اس کے ساتھ دوڑتے جا رہے تھے اور محاذ جنگ کے حالات پوچھتے جاتے تھے۔ وہ آپ کو بالکل نہیں پہچانتا تھا۔ اس وجہ سے اونٹ پر بیٹھے بیٹھے ان کے سوالوں کا جواب دے رہا تھا۔ یہ سوار سعد بن عمبلہ فزاری تھا جو سیدنا عمرؓ کے نام پر سپہ سالار لشکر سیدنا بن ابی وقاصؓ کا خط لے کر آ رہا تھا۔ جب یہ دونوں مدینہ میں داخل ہوئے اور لوگوں نے سیدنا عمرؓ کو امیر المومنین کہہ کر سلام کرنا شروع تو سعد بن عمبلہ نے کہا: "اللہ آپ پر رحم فرمائے، آپ نے مجھے کیوں نہ بتایا کہ آپ امیر المومنین ہیں۔" سیدنا عمرؓ نے بڑی سادگی سے جواب دیا! "میرے بھائی! کوئی بات نہیں"۔

اس واقعہ سے اندازہ فرمائیں کہ سیدنا عمرؓ کی زندگی، رہن سہن، بود و باش اور طور طریق کس قدر سادہ تھے کہ وہ سانڈنی سوار قاصد آپ کو پہچان نہیں سکا۔ لیکن جوں جوں زمانہ نبوت سے بعد ہوتا چلا گیا خلفاء کی بود و باش میں تکلفات کے گھنیرے سایے پڑنے لگے یہاں تک کہ اموی خلفاء کے چونچلے اور ان کے تکلفات زندگی شہنشاہیت چونچلوں کی طرح ایک امتیازی حیثیت اختیار کر گئے اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اب خلافت نے شہنشاہیت کا روپ دھار لیا ہے۔ آپ خلافت کو شوارئی تو نہ بنا سکتے تھے۔ کیونکہ سلیمان بن عبدالملک نے آپ کے بعد یزید بن عبدالملک کو خلیفہ نامزد کر دیا تھا اور اگر آپ اس میں کوئی تغیر و تبدل کرتے تو اموی خاندان میں انقلاب و بغاوت کا خطرہ تھا، لیکن آپ نے خلافت کے ان تمام مفاسد کو یک قلم ختم کر دیا جو ان لوگوں کے طرۂ امتیاز تھے، مثلاً خلفاء کے ساتھ نقیب اور علم بردار چلتے تھے۔ آپ نے اس کو بالکل ختم کر دیا۔ چنانچہ خلیفہ ہونے کے بعد جب کوتوال شہر نے پہلی مرتبہ دستور کے مطابق نیزہ لے کر آپ کے ساتھ چلنا چاہا تو آپ نے اسے روک دیا کہ میں اس امتیاز کو پسند نہیں کرتا، کیونکہ میں مسلمانوں کا ایک معمولی فرد ہوں۔ یہ جملہ کہنے کی وجہ سے پھر اسے آپ کے ساتھ نیزہ لے کر چلنے کی جرات نہ ہوئی۔ (سیرت عمر بن عبدالعزیز لابن جوزی ص ۵۳)

علاوہ ازیں آپ نے تمام گورنروں کو فرمان جاری کیا کہ پیشہ ور واعظ جو خلفاء پر سلام بھیجتے ہیں، اس کو فوری طور پر بند کر دیا جائے اور انہیں یہ کہو کہ وہ خلفاء پر سلام بھیجنے کی بجائے عام مسلمانوں کے لیے دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ ان کی حالت پر رحم فرمائے۔

Marfat.com

(طبقات ابن سعد جلد ۵ ص ۲۸۳) میرے لیے کوئی دعا مخصوص نہ کرو بلکہ تمام مسلمان مردوں اور عورتوں کے لیے دعا کریں۔ میں بھی ان میں شامل ہو جاؤں گا کیونکہ الحمدللہ میں بھی ایک مسلمان ہوں۔ (طبقات ابن سعد جلد ۵ ص ۲۸۰)

ابوبکر بن محمد کو لکھا کہ شاہی خاندان کے کسی فرد کو صرف اس لیے کسی بات پر ترجیح نہ دو کہ اس کا تعلق شاہی خاندان سے ہے، کیونکہ میرے نزدیک ان میں اور دوسرے عام مسلمانوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ (طبقات ابن سعد جلد ۵ ص ۲۵۲) پھر اپنے اس حکم کا عملی مظاہرہ بھی کیا۔ وہ اس طرح کہ ایک دفعہ مسلمہ بن عبدالملک ایک فریق مقدمہ کی حیثیت سے آپ کی مجلس میں آیا اور آ کر درباری فرش پر بیٹھ گیا۔ آپ نے اس سے فرمایا کہ دوسرے فریق مقدمہ کی موجودگی میں آپ اس درباری فرش پر بیٹھنے کا کوئی حق نہیں رکھتے۔ تم عام مسلمان کے برابر بیٹھو یا کسی دوسرے کو اپنا وکیل مقرر کر دو۔ یہ الفاظ آپ نے اس شخص کو کہے جو آپ کی بیوی کا بھائی تھا۔ (سیرۃ عمر بن عبدالعزیز ص ۷۳) شاہی خاندان کے لوگوں کے وظائف لوگوں سے زیادہ ہوتے تھے، صرف اس وجہ سے کہ ان کا تعلق شاہی خاندان سے ہے۔ آپ نے اس کے وظائف عام مسلمانوں کے برابر کر دیے جس سے ان کے دلوں میں طوفان تو اٹھا لیکن آپ نے اس کو پرکاہ کے برابر نہ سمجھا۔ اس طریقے سے آپ نے ان تمام امتیازات کو یک قلم منسوخ کر دیا جو ان لوگوں کو صرف اس وجہ سے حاصل تھے کہ ان کا تعلق آل مروان یا دوسرے لفظوں میں شاہی خاندان سے ہے۔

سیدنا عمرؒ سے قبل خلفاء اپنی مرضی سے ہر کام کرتے تھے حالانکہ اسلام میں خلافت کا تصور شورائی ہے اور خلفائے راشدین کے زمانہ میں ہر خلیفہ کی ایک مجلس شوریٰ تھی جس سے وہ اہم معاملوں میں مشورہ کیا کرتے تھے۔ شوریٰ اگرچہ اموی خلفاء کے زمانہ میں بھی تھی۔ لیکن وہ ان سے مشورہ یا تو لیتے ہی نہ تھے یا بہت کم مشورہ لیتے تھے۔ عمرؒ جب برسر اقتدار آئے تو ایک تو آپ کی پشت پر علم و تجربہ تھا جس کی روشنی میں حکمرانی کے فرائض سرانجام دیتے تھے۔ پھر وہ ہر معاملہ میں ژرف نگاہی سے کام لیتے تھے اور نہایت غور و فکر کے ساتھ امور مملکت سرانجام دیتے تھے۔ پھر آپ نے اپنے پاس خیر خواہ مشیروں کی ایک کثیر تعداد رکھی ہوئی تھی جو آپ کے نہایت مخلص، خیر خواہ اور ہمدرد و بہی خواہ تھے۔ آپ تمام اہم امور میں ان سے صلاح و مشورہ لیتے اور ان اہم لوگوں سے اور ہر اس شخص سے جس

Marfat.com

میں آپ خیر وصلاح دیکھتے اور وہ صحابہ کرامؓ میں سے باقی ہو۔ آپ نے صلاح ومشورہ اور راہ نمائی حاصل کرنے میں کبھی کوتاہی نہیں کی۔ (کتاب الخراج لابی یوسف ص ۱۱۴)

خلافت سے قبل جیسا کہ ذکر کیا گیا ہے آپ کی زندگی نہایت مسرفانہ زندگی تھی۔ لیکن بارخلافت اٹھانے کے بعد آپ کی زندگی میں ایک انقلاب برپا ہو گیا اور آپ نے اپنے جسم کو تمام ذاتی کمزوریوں سے پاک صاف کر لیا اور پھر ہمہ تن کاروبار خلافت اور لوگوں کی ضروریات کو پورا کرنے میں مصروف ہو گئے اور روز وشب اسی کام میں گذرتے۔ آپ دربار خلافت میں لوگوں کی خدمت اور ان کی ضروریات پورا کرنے کے لے بیٹھ جاتے اور رات گئے تک ان کی ضروریات کو پورا کرتے رہتے۔ جب کاروبار خلافت ختم ہو جاتا تو آپ پھر اپنا ذاتی چراغ منگوا کر جلاتے اور دو رکعت نفل ادا کر کے اکڑوں بیٹھ جاتے اور ٹھوڑی کے نیچے ہاتھ رکھ جیسے کہ نہایت متفکر ہوں، رونے لگتے اور اتنا روتے کہ آنسو رخساروں پر بہنے لگتے اور صبح صادق تک روتے رہتے اور پھر نماز فجر ادا کرتے۔ کئی مرتبہ آپ کی اہلیہ محترمہ فاطمہ بنت عبدالملک نے آپ سے پوچھا کہ آپ تنہائیوں میں کیوں رو رہے تھے۔ آپ فرماتے: "فاطمہ! میں اس امت کے ہر فرد کا خواہ وہ گورا ہو یا کالا، عربی ہو یا عجمی، امام بنایا گیا ہوں تو میں قانع مسافر کا، نادار محتاج کا اور مجبور اسیر وغیرہ کا جو اطراف ملک میں پھیلے ہوئے ہیں، تصور کر کے رونے لگتا ہوں۔ کہ کل قیامت کے روز حق اللہ تعالیٰ شانہ مجھ سے ان تمام لوگوں کو حساب لے گا اور سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم مجھ سے اس بارہ میں جھگڑا کریں گے تو میں ان کے سامنے کیا عذر پیش کروں گا اور انہیں اس بارہ میں کیا جواب دوں گا۔ بس اسی کے خوف اور ڈر سے میں ساری رات روتا رہا"۔ یہ خشیت الٰہی مفقود ہو چکی تھی۔ عمرؒ نے اس کو پھر زندہ کیا اور قیامت کے روز محاسبہ کا تصور زندگیوں میں اُجاگر کیا۔

Marfat.com

عدالت اور قضاء

اسلام نے عدل وانصاف پر نہایت زور دیا ہے۔ خود قرآن حکیم میں ہے:
"اعدلوا هو اقرب للتقوی" لوگو! عدل کرو عدل تقویٰ کے قریب ہے۔ کیونکہ کسی حکومت کا قیام عدل وانصاف کا مرہون منت ہے۔ اگر کوئی حکومت عدل وانصاف سے کام نہ لے گی تو وہ جلد تباہ وبرباد ہو جائے گی۔ حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ کا ایک ملفوظ ہے کہ حکومت اور کفر تو جمع ہو سکتے ہیں، لیکن حکومت اور ظلم جمع نہیں ہو سکتے۔ اسی وجہ سے ہر خلیفہ راشد نے اپنے دور میں عدل اور انصاف کو قائم کیا۔ سیدنا فاروق اعظمؓ نے اپنے عہد خلافت میں عدل و انصاف کے لیے ایک مستقل محکمہ قائم کیا۔ ان کے ہاں قانون کی نگاہ میں مساوات تھی۔ وہ آزادی اور مساوات سے بے انتہا محبت کرتے تھے۔ آپ نے مسند نشین خلافت ہونے کے بعد اپنا سب سے پہلا خطبہ جو مسجد نبوی میں لوگوں کے سامنے دیا اس میں واضح الفاظ میں فرمایا:

"خدا کی قسم! تمہارا ہر کمزور آدمی میرے نزدیک سب سے قوی ہے تا آنکہ اس کے لیے اس کا حق وصول نہ کروں اور تمہارا ہر طاقتور آدمی میرے نزدیک سب سے کمزور ہے تا آنکہ اس سے حق وصول نہ کرلوں"۔

یہی وجہ ہے کہ آپ کا عدل وانصاف آج تک ضرب المثل ہے۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اللہ کے بندوں میں سب سے زیادہ اللہ اور اس کے حساب سے ڈرنے والے تھے اور لوگوں پر حکومت کرنے میں جس بے لاگ سوجھ بوجھ، باریک بینی، دور اندیشی، خوف

Marfat.com

آخرت اور محاسبہ نفس کی ضرورت ہوتی ہے، اسے خوب جانتے تھے۔ ایک دفعہ جھگڑنے والے ان کے پاس آئے تو سیدنا فاروق اعظمؓ گھٹنوں کے بل بیٹھ گئے اور فرمایا: ''اے اللہ! ان کے بارہ میں مجھے روشنی عطا فرما ان میں سے ہر ایک میرا دین چاہتا ہے''۔

عام طور پر یہ کہا جاتا ہے۔ کہ قضاء اور عدالت کا محکمہ سب سے پہلے سیدنا فاروق اعظمؓ نے قائم فرمایا تھا۔ جیسا کہ پروفیسر ہٹی نے اپنی کتاب ''ہسٹری آف دی عربز'' (ص ۱۷۳) اور علامہ شبلیؒ نے اپنی تصنیف ''الفاروق'' میں یہی لکھا ہے، لیکن ہمارے نزدیک یہ بات محل نظر ہے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ عہدہ خود عہد نبوت میں قائم ہو چکا تھا۔ کتب احادیث میں کتاب الاقضیہ کے عنوان سے جو باب ہے اس کی احادیث و روایات سے صاف پتہ چلتا ہے کہ سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے قاضی کے فرائض، عہدہ کے شرائط وآداب اور شہادت کے احکام وغیرہ نہایت تفصیل سے بیان فرمائے ہیں۔ اگرچہ معاملات حکومت میں آخری فیصلہ آپ ہی کا نافذ ہوتا تھا، لیکن مملکت میں توسیع کے باعث ہر معاملہ اور ہر مقدمہ آپ خود فیصلہ نہیں فرما سکتے تھے۔ اس لیے اپنی جانب سے مختلف علاقوں میں قاضی بھی مقرر فرما دیتے تھے اور ان کو اس سلسلہ میں خاص خاص ہدایت دی تھیں۔ چنانچہ سیدنا علیؓ کو یمن کا قاضی مقرر فرمایا تو انہوں نے عرض کیا کہ میں تو کم عمر ہوں اور مجھ کو قضاء کا کوئی علم نہیں ہے۔ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا! '' اللھم ثبت لسانہ واھد قلبہ '' اے اللہ! اس کی زبان کو استواری بخش اور اس کے قلب کو راہ دکھا۔

(البدایہ والنہایہ جلد ۵ ص ۱۰۷)

سیدنا عمر فاروقؓ کی نگاہ قضاء اور اس کے اصول واحکام پر بہت وسیع تھی۔ سیدنا ابوموسیٰ اشعریؓ کے نام ان کا ایک خط ایک غیر فانی نقش ہے جس میں انہوں نے قضاء کے اصول بیان فرمائے ہیں۔ یہ خط ابوموسیٰ اشعریؓ کو عراق کے قاضی کی حیثیت سے بھیجا گیا تھا۔ اس خط میں سیدنا عمرؓ نے سیدنا ابوموسیٰ اشعریؓ کو لکھا:

''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ اللہ کے بندے امیرالمومنین کی طرف سے عبداللہ بن قیس کے نام! سلام علیک' امابعد! واضح ہو کہ فصل خصومات ایک اہم فریضہ ہے۔ جس پر ہر زمانہ میں عمل درآمد ہوتا رہا ہے۔ جب کوئی مقدمہ تمہارے پاس آئے تو اس کے تمام پہلوؤں کو اچھی طرح سمجھو اور جب صحیح فیصلہ سمجھ میں آ جائے تو

Marfat.com

اسے نافذ کردو کیونکہ زبانی فیصلہ بے سود ہے تاوقتیکہ اسے عملاً نافذ نہ کیا جائے۔ مدعی اور مدعاعلیہ کے ساتھ ایک سا برتاؤ کرو۔ کسی ایک فریق سے بات کرنے یا عدالت میں بٹھانے یا انصاف کرنے میں کوئی امتیاز نہ برتو تاکہ "بڑا آدمی" یہ توقع نہ کرے کہ تم اس کے ساتھ رعایت کرو گے اور غریب اور کمزور کو یہ اندیشہ نہ ہو کہ اس کے ساتھ ناانصافی سے پیش آؤ گے۔ جو شخص دعویٰ کرے اور اس سے گواہ مانگے جائیں اور جو دعویٰ نہ مانے (یعنی مدعا علیہ) اس سے قسم لی جائے۔ مسلمانوں کے درمیان صلح کرانا جائز ہے بشرطیکہ اس سے قرآن کا قانون نہ ٹوٹے۔ اگر کل تم نے کوئی فیصلہ کیا اور آج اس سے بہتر فیصلہ تمہاری عقل اور سمجھ بوجھ نے تمہیں سمجھا دیا تو اپنے پہلے فیصلے کو رد کر سکتے ہو۔ اس لیے کہ حق ازلی ہے اور اس کی طرف رجوع کرنا غلطی پر اڑے رہنے سے بہتر ہے۔ جس مسئلہ میں شبہ ہو اور وہ تمہیں قرآن وحدیث میں نہ ملے تو اس پر غور کرو، پھر غور کرو اور اس کی امثال ونظائر کو اچھی طرح ذہن نشین کر کے قیاس واجتہاد سے کام لو۔ کوئی شخص اگر اپنا دعویٰ ثابت کرنے کے لیے مہلت مانگے تو اسے مہلت دو اور اگر وہ گواہ پیش کر دے تو اس کا حق دلوا دو ورنہ مقدمہ خارج کر دو۔ اس سے شک مٹے گا اور ظلم وستم کی سیاہی دور ہو گی۔ ہر مسلمان ثقہ ہے سوائے ان اشخاص کے جنہیں کسی جرم میں کوڑے لگائے جا چکے ہوں یا جنہوں نے جھوٹی گواہی دی ہو یا ولد ونسب میں مشکوک ہوں۔ تمہاری چھپی ہوئی بداعمالیوں کا معاملہ خدا تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ دنیا میں قانونی سزا سے بچنے کے لیے اس نے گواہی اور حلف ضروری قرار دیا ہے۔ خبردار! تمہارے دل میں اہل مقدمہ سے خفگی، اکتاہٹ یا چڑچڑا پن پیدا نہ ہو کیونکہ جو شخص حق وانصاف کے موقع پر حق وانصاف قائم کرتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کے انعام اور اچھی شہرت کا مستحق ہو جاتا ہے۔ جس کسی نے اپنی نیت درست رکھی اس کے اور لوگوں کے درمیان اللہ کافی ہے اور جو ان سے بناوٹی اخلاق کے ساتھ پیش آیا اس کے لیے اللہ کے رزق اور رحمت کی امید نہ رکھو۔ والسلام! (سنن دارقطنی ص ۵۱۳، عیون الاخبار لابن قتیبہ جلد ۱ ص ۶۶، البیان والتبیین جلد ۲ ص ۱۲۴، نہایۃ الارب نویری جلد ۶

Marfat.com

ص ۲۵۷، اعلام الموقعین جلد۲ ص ۷۱۔۷۲، مبسوط سرخسی جلد ۱۶ ص ۶۰۔ ۶۵، عمر بن الخطاب لابن جوزی ص ۱۳۵، مقدمہ ابن خلدون جلد ۱ ص ۱۸۴، ازالۃ الخفاء جلد۲ ص ۱۱۹ وغیرہ)

ایک اور روایت میں جو قاضی شریح سے مروی ہے، یہ ہے کہ انہوں نے سیدنا عمرؓ کو لکھا کہ فیصلے کس طرح کیے جائیں؟ آپ نے ان کے جواب میں لکھا:

"کتاب اللہ کے مطابق ..... اگر کتاب اللہ میں نہ ہو تو سُنت رسول اللہؐ کے مطابق اور اگر کتاب اللہ میں بھی نہ ہوا اور سنت رسولؐ میں بھی نہ ہو تو پہلے اکابر امت جو فیصلے کر چکے ہیں ان کے مطابق فیصلے کرو اور اگر پہلے صالحین امت بھی اس پر کچھ فیصلے نہ کر پائے ہوں تو چاہو تو آگے بڑھو (یعنی اجتہاد کر لو) اور چاہو تو رُک جاؤ (یعنی یہاں لکھ بھیجو) اور میرے خیال میں تمہارے لیے رُکنا بہتر ہے۔ والسلام! (نسائی جلد۲ ص ۳۰۵)

قضاء کے جو اصول سیدنا فاروق اعظمؓ نے چودہ سو برس قبل مقرر فرمائے تھے۔ وہ اتنے پائدار اصول ہیں۔ کہ زمانے کی کروٹیں بھی انہیں تبدیل نہ کر سکیں۔ انہی اصولوں کو عمر بن عبدالعزیزؒ نے اپنے زمانے میں اپنایا اور عدالت وقضاء کا سارا نظام انہی اصولوں پر چلایا۔

عمر بن عبدالعزیزؒ قاضیوں کو خود چُنتے تھے

عدل کرنے کے لیے قاضی کا عادل ہونا ضروری ہے۔ قاضی اگر غیر عادل، جانب دار اور ظالم ہوگا یا امور عدل سے ناآشنا ہوگا تو وہ کبھی عدل نہیں کر سکے گا۔ اس وجہ سے عمرؒ قاضیوں کا انتخاب خود کرتے تھے۔ وہ اس وقت تک کسی کو قاضی نہ بناتے جب تک اس کا ظاہر و باطن آزما نہ لیتے تھے۔ جب آپ کو مکمل اطمینان ہو جاتا تو پھر اس کو قاضی مقرر فرما دیتے تھے جو عدالت میں سخت اور رعایا پر نرم اور شفیق ہوتے تھے۔ کیونکہ اگر اہل آدمی کا کسی عہدہ کے لیے انتخاب نہ ہو اور اس میں اس کام کی صلاحیت نہ ہو جو کام اسے سونپا گیا ہے تو لوگوں کو اس سے فائدہ نہیں پہنچ سکتا بلکہ اُلٹا نقصان ہونے کا اندیشہ ہوتا ہے۔

Marfat.com

روایات میں ہے کہ سیدنا عمر بن عبدالعزیزؒ جب خلیفہ ہوئے تو آپ نے تمام گورنروں، قاضیوں اور حکام کو ڈرایا اور فرمایا:

"لوگو! اللہ تعالیٰ کی قسم، میں نے کبھی خلافت کی تمنا نہ پوشیدہ طور پر کی اور نہ ظاہری طور پر۔ اگر کوئی شخص میرے خلیفہ بننے کو ناپسند کرتا ہے۔ تو اب ظاہر کر دے"۔

یہ ایک دھمکی تھی۔ لوگ آپ کی اس دھمکی سے خوفزدہ ہو گئے کیونکہ پہلے خلفاء کا ظلم وستم ان کے سامنے تھا اور عمر بن عبدالعزیزؒ سے ان کی بڑی توقعات وابستہ تھیں۔ چنانچہ آپ کا یہ اعلان سُن کر ایک شخص بولا: "سبحان اللہ! خلفائے راشدین جب خلیفہ ہوئے تو انہوں نے یہ الفاظ تو نہیں فرمائے تھے اور عمرؒ یہ الفاظ فرما رہے ہیں"۔

(العقد الفرید جلد ۴ ص ۴۳۳)

عمر بن عبدالعزیزؒ کی اس دھمکی نے لوگوں پر خصوصی طور پر اور اچھے عمال اور قاضیوں پر بڑا اثر کیا کیونکہ عمرؒ سے پہلے کے خلفاء ایسے قاضی اور حکام منتخب کر کے لوگوں پر مسلط کرتے تھے جو ظلم ڈھانے پر پوری قدرت رکھتے ہوں، حتیٰ کہ اسلامی دنیا ایک عظیم اخلاقی مصیبت میں پھنس گئی تھی اور اسی میں ایک زمانے تک کروٹیں لیتی اور کراہتی رہی۔ لیکن عمرؒ نے قاضی مقرر کرنے پر علم ومعرفت کے ساتھ ایک اور لازمی شرط قرار دے دی تھی اور وہ یہ کہ قاضی کو ایک بہترین نمونہ بن کر عوام میں رہنا ہوگا یا بہترین نمونہ بننے کے لیے اور اچھی حالت کے لیے خود کو تیار کرنا ہوگا۔ چنانچہ آپ کی رائے میں قاضی کا مندرجہ ذیل پانچ خوبیاں سے متصف ہونا ضروری ہے۔

۱۔ وہ قرآن وسنت کا عالم ہو۔

۲۔ بردبار اور باوقار ہو۔

۳۔ صابر اور منکسر المزاج ہو۔

۴۔ پاک دامن ہو۔

۵۔ اہم مسائل میں مشورہ کرنے والا ہو۔

ان پانچ خوبیوں کا حامل شخص عمرؒ کے نزدیک قاضی بننے کی اہلیت رکھتا تھا اور اگر ان میں سے کسی میں ایک خوبی بھی کم ہوتی تو عمرؒ اس میں وہ عیب سمجھتے۔ آپ انہی لوگوں

میں سے قاضی منتخب فرمایا کرتے تھے جن میں یہ پانچوں خوبیاں ہوتی تھیں۔ اس وجہ سے آپ کے عہد خلافت میں قاضیوں کا طبقہ اپنی اصابت رائے اور تقویٰ کی وجہ سے ضرب المثل تھا۔ یہ لوگ امور عدالت میں ماہر ہوتے تھے اور راتوں کو جاگ کر عدالت کے طریقے محفوظ کر لیا کرتے تھے۔ عمرؒ کسی شخص کو آزمائے بغیر اس کو قاضی مقرر نہ کرتے تھے۔

عمر بن عبدالعزیزؒ جب کسی کو قاضی مقرر فرماتے تو اس کے بارہ کرید کر کے ساری معلومات فراہم کرتے کہ یہ تقویٰ وطہارت میں کیسا ہے؟ علم وفقہ میں اس کا کیا مرتبہ ہے؟ اس کے ظاہر وباطن میں کوئی فرق ہے کہ نہیں؟ یہ کرید آپ اس لیے کرتے کہ کہیں آپ کسی کے ظاہری حالات سے دھوکہ نہ کھا جائیں۔ جب پورا پورا اطمینان ہو جاتا تو پھر آپ اس کو قاضی یا عامل مقرر فرماتے۔ چنانچہ بلال بن ابی بردہ کو آپ نے اسی تحقیق وتفتیش سے مسترد کیا تھا۔ یہ بلال بن ابی بردہ ایک ہوشیار، ذہین، ذکی اور نہایت عقل مند شخص تھا۔ وہ بظاہر بڑا دیندار تھا لیکن اس کا باطن اتنا ہی خراب اور گندہ تھا۔ یہ نہایت لالچی، طمعی اور حریص تھا۔ یہ عمرؒ کی خدمت میں خناصرہ میں حاضر ہوا اور آپ کو ان الفاظ میں خلافت کی مبارک باد دی کہ عمرؒ نہایت متاثر ہوئے۔ اس نے کہا:

> "امیرالمومنین! اگر کسی کو خلافت سے شرف حاصل ہوا ہو تو آپ سے خلافت کو شرف حاصل ہوا ہے اور اگر کسی کو خلافت سے زینت ملی ہو تو آپ سے خلافت کو زینت ملی ہے"۔

عمرؒ نے ان ریمارکس پر اس کا شکریہ ادا کیا کیونکہ مبارک باد کے یہ الفاظ نہایت متاثر کن تھے۔ پھر یہ شخص مسجد میں گیا اور ایک ستون کے پاس کھڑے ہو کر نماز پڑھنے لگا۔ عمر بن عبدالعزیزؒ نے علاء بن مغیرہ سے کہا کہ اگر اس کا باطن بھی ظاہر کی طرح ہے تو یہ واقعی عراق کا حاکم ہونے کا اہل ہے اور اس کی خدمات سے فائدہ اٹھانا ضروری ہے۔ علاء نے کہا: ابھی تحقیق کر کے اس کے مکمل حالات آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔ چنانچہ اسی وقت مسجد میں گئے۔ دیکھا کہ وہ مغرب اور عشاء کے مابین لگا تار نوافل پڑھ رہا ہے۔ علاء نے کہا: آپ جلدی سے نماز سے فارغ ہو جایئے مجھے آپ سے کوئی ضروری بات کرنی ہے۔ چنانچہ وہ جلدی سے فارغ ہو کر علاء کے پاس آیا۔ علاء نے کہا۔ "آپ کو پتہ ہے کہ امیرالومنین کی نگاہ میں میرا کیا مقام ہے۔ اگر میں امیرالمومنین کے سامنے عراق کی گورنری

Marfat.com

کے لیے آپ کا نام پیش کر دوں تو آپ مجھے کیا دیں گے؟ بلال نے کہا: میں اس کے بدلہ میں آپ کو ایک سال کی تنخواہ دے دوں گا جو کہ دس لاکھ بنتی ہے۔ علاء نے کہا: آپ مجھے یہ لکھ دیں۔ حریص تو وہ تھا ہی اس لیے جلدی سے گھر گیا اور ایک تحریر لکھ کر علاء کو دے دی۔ علاء عمرؒ کے پاس یہ تحریر لے آئے۔ جب امیرالمومنین نے یہ تحریر دیکھی تو آپ نے کوفہ کے گورنر کو لکھ دیا کہ "بلال نے اللہ کے نام پر ہمیں دھوکہ دیا ہے اور قریب تھا کہ ہم اس کے فریب میں آ جاتے، لیکن جب ہم نے اسے پگھلا کر دیکھا تو اس میں سراسر کھوٹ بھرا ہوا تھا۔ اس واقعہ سے اور اس قسم کے اور بھی کئی واقعات سے یہ پتہ چلتا ہے کہ عمرؒ پر فریبوں اور مکاروں کا اثر نہایت کم ہوتا تھا اور آپ کسی شخص کو کوئی عہدہ دینے سے قبل اس کی پوری طرح چھان پھٹک کر لیا کرتے تھے۔

اسی طرح کا ایک اور واقعہ کتابوں میں ملتا ہے کہ ایک مرتبہ خراسان کا ایک شخص آپ کے پاس آیا اور آپ سے کہا: امیرالمومنین! میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ ایک کہنے والا کہہ رہا ہے: جب بنی امیہ کا اشج برسر اقتدار آئے گا تو زمین کو عدل وانصاف سے بھر دے گا۔ جیسے وہ ظلم سے بھری ہوئی ہے۔ چنانچہ ولید بن عبدالملک برسراقتدار آیا تو میں نے اس کے بارہ میں تحقیق کی تو پتہ چلا کہ وہ اشج (زخمی) نہیں ہے۔ پھر سلیمان بن عبدالملک مسند خلافت پر بیٹھا تو اس کے بارہ میں بھی معلوم ہوا کہ وہ بھی اشج نہیں ہے۔ پھر زمام خلافت آپ کے ہاتھ میں آئی تو پتہ چلا کہ آپ اشج ہیں۔ عمرؒ نے اس شخص سے پوچھا: کیا تو قرآن پڑھا ہوا ہے؟ اس نے جواب دیا: ہاں۔ فرمایا: تجھے قسم ہے اس ذات کی جس نے تجھے قرآن کی یہ نعمت بخشی کیا واقعی تم نے یہ خواب دیکھا ہے؟ اس نے جواب دیا: ہاں۔ آپ نے اسے سرکاری مہمان خانے میں ٹھہرایا۔ یہ دو مہینے ٹھہرا رہا۔ ایک روز عمرؒ نے انہیں بلا کر فرمایا: جانتے ہو میں نے تمہیں کیوں روکا؟ بولا نہیں۔ فرمایا: ہم نے آدمی بھیج کر تمہارے بارہ میں پوری پوری تحقیقات کرائیں۔ پتہ چلا کہ دوست اور دشمن آدمی تمہارے بارے میں سب کی ایک ہی رائے ہے۔ وہ شخص عمرؒ کی بات سمجھ گیا اور اپنے شہر واپس چلا گیا۔ (العقد الفرید جلد اص ۴۳۳، ص ۴۳۷)

عمر بن عبدالعزیزؒ کے دل میں ایک تڑپ تھی کہ دنیا میں حقیقی عدل قائم کیا جائے، لیکن انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ ایسا عدل قائم کرنا ناممکن ہے جس میں غلطی کی گنجائش نہ ہو۔

Marfat.com

چنانچہ وہ ماہر اور تجربہ کار لوگوں سے عدل وانصاف کے بارہ میں پوچھتے رہتے تھے۔ انہیں نے عدل کو اپنے دل میں ایسا جما لیا کہ ایک لحہ بھی ان کی آنکھوں سے اوجھل نہ ہوتا تھا۔ ایک مرتبہ آپ نے ابن کعب سے عدل کی تعریف کے بارہ میں پوچھا: انہوں نے عدل کا چہرہ بیان فرمایا:

"آپ چھوٹے مسلمانوں کے حق میں باپ، بڑوں کے لیے بیٹا اور برابر والوں کے لیے بھائی بن جائیں اور لوگوں کو ان کے قصوروں اور جرموں کے مطابق ان کی جسمانی حالت کے لحاظ سے سزا دیں، اور اپنے ذاتی انتقام میں کسی شخص کو ایک کوڑا بھی نہ ماریں۔ اگر آپ نے ایسا کیا تو یہ آپ کی زیادتی ہوگی اور اللہ تعالیٰ زیادتی کرنے والوں کو کسی صورت پسند نہیں کرتا"۔ (سیرۃ ابن جوزی ص ۱۱)

پھر عدل کی بھی دو قسمیں ہیں۔ ایک حکمی اور دوسرا عدل اجتماعی۔ عدل حکمی کا نفاذ قاضی کرتا ہے اور اجتماعی عدل کا نفاذ خلیفہ کی ڈیوٹی ہے۔ عمر بن عبدالعزیزؒ کے نزدیک دونوں عدلوں میں کوئی فرق نہیں۔ آپ کے نزدیک عدل کا وقوع اس طرح ہوتا ہے کہ جو شخص احسان کا مستحق ہے اس کے ساتھ احسان کیا جائے اور جو شخص سزا کا مستحق ہے اس کو سزا دی جائے۔ سب مجرموں کو ایک ہی لاٹھی سے نہ ہانکا جائے بلکہ ہر قصور کی اس کی اہمیت کے مطابق سزا دی جائے۔ عدل کا تقاضا یہ بھی ہے کہ شبہ کی وجہ سے حد ختم کر دی جائے کیونکہ اس میں ایک لچک ہے کہ لوگ ظلم سے بچ جائیں اور مجرموں پر شفقت کا بھی اعتبار رہے، اسی لیے شبہ سے حد ختم کر دینا موجب خیر ہے حتی کہ اگر قاضی سے فیصلہ کرنے میں اجتہادی غلطی بھی جو جائے پھر بھی شبہ سے حد کا ختم ہو جانا محل عدل ہے۔ چنانچہ عمر بن عبدالعزیزؒ اپنے عمال اور قضاۃ کو لکھتے رہتے تھے کہ حدود کو شبہات سے ختم کر دیا کرو کیونکہ قاضی کا معافی میں خطا کرنا سزا میں خطا کرنے سے بہتر ہے۔ آپ نے اس مسئلہ میں اپنے نانا سیدنا فاروق اعظمؓ کا طریقہ اختیار کیا تھا۔

یہ بھی ضروری نہیں اور نہ ہی اس کو عدل کہا جا سکتا ہے کہ دعویداروں کے دعویٰ کے مطابق ہمیشہ فیصلے کیے جائیں کیونکہ اکثر بدقماش لوگ جھوٹے دعوے بھی کر دیتے ہیں۔ ایک قاضی کا یہ اولین فرض ہے کہ جب اس کے پاس کوئی مقدمہ لایا جائے تو وہ اس کے بارہ میں مکمل چھان پھٹک کرے اور غلط اور صحیح کو معلوم کرنے کی پوری پوری کوشش کرے

Marfat.com

تاکہ غلط فیصلہ کرنے سے محفوظ ومصئون رہے۔ ایک روایت میں ہے کہ سلیمان بن عبدالملک کی وفات کے بعد عمر بن عبدالعزیزؒ کے سامنے عنبر کا ایک بڑا ٹکڑا لایا گیا۔ ایک شخص اس بات کا منتظر تھا کہ کب عنبر کا یہ ٹکڑا عمرؒ کے سامنے پیش ہو اور میں اس سے رقم وصول کروں۔ ہوا یہ کہ سلیمان بن عبدالملک کی وفات کے بعد عمرؒ کے سامنے عنبر کا ایک بہت بڑا ٹکڑا پیش کیا گیا تو ایک شخص نے کھڑے ہو کر کہا: امیرالمومنین! یہ عنبر کا ٹکڑا میرا ہے۔ عمرؒ نے پوچھا: یہ قصہ کیا ہے؟ بولا: میں نے اس عنبر کو سلیمان کو سات ہزار میں فروخت کیا تھا۔ جب کہ اس کی اصل قیمت اٹھارہ ہزار سے بھی زیادہ ہے۔ عمرؒ نے کہا: اللہ تجھ پر رحم فرمائے، کیا انہوں نے تجھے ڈرایا تھا؟ اس نے کہا: بالکل نہیں، فرمایا: کیا انہوں نے تجھ پر جبر کیا تھا یا یہ عنبر تجھ سے زبردستی چھینا تھا؟ بولا: بالکل نہیں۔ پوچھا: پھر کیا بات ہے؟ بولا: امیرالمومنین! یہ میرا عنبر ہے عمرؒ نے حکم دیا کہ تحقیق حال کے لیے مقدمہ کی تاریخ ڈال دی جائے۔ کیونکہ اس عنبر میں اس شخص کا حصہ معلوم نہیں ہوتا۔

سیدنا عمر بن عبدالعزیزؒ کی نگاہ میں اس وقت تک عدالت کا کوئی فائدہ نہیں جب تک قاضی ایک ناقابل تسخیر قوت اور نہ ٹوٹنے والے غلبہ کا مالک نہ ہو، اور یہ بھی انتہائی ضروری ہے کہ قاضی کا فیصلہ ہر ایک پر نافذ ہو حتی کہ امام اور خلیفہ پر بھی۔ چنانچہ ایک مرتبہ حلوان کا ایک مصری عمرؒ کی پاس آیا اور عرض کیا کہ آپ کے والد عبدالعزیزؒ نے مصر کی گورنری کے زمانہ میں میری جائیداد غصب کر لی تھی۔ اس نے عمرؒ کو ڈانٹا بھی۔ عمرؒ اس کی باتوں سے نرم بھی ہو گئے اور شفیق بھی اور اس بارہ میں کوئی فیصلہ نہ کر سکے۔ آپ نے اس حلوانی کو سمجھایا کہ مجھ سے شریفانہ طور پر جھگڑو اور میری ذاتیات پر حملہ کرنے کی کوشش نہ کرو کیونکہ اس جائیداد میں میرے ساتھ میرے بہن بھائی بھی شریک ہیں۔ اگر میں صرف تیرے کہنے پر تجھے یہ جائیداد واپس لوٹا دوں تو میرے بہن بھائی معترض ہوں گے، لہذا بہتر یہ ہے کہ تو قاضی کے پاس اپنا مقدمہ لے جا۔ چنانچہ اس نے قاضی کے ہاں مقدمہ دائر کر دیا۔ قاضی نے دونوں کے بیانات سُن کر مصری کے حق میں فیصلہ کر دیا۔ عمرؒ نے قاضی سے کہا کہ ہم نے جائیداد پر دس لاکھ درہم خرچ کیے ہیں۔ قاضی نے غور وفکر کے بعد فیصلہ کیا کہ بقدر خرچ اس جائیداد سے آمدنی بھی ہو گئی ہے اور جائیداد واپس کر دی۔ عمرؒ نے قاضی کے فیصلہ کی تحسین فرمائی اور خود کھڑے ہو کر زمین مصری کو دے دی۔

Marfat.com

پھر عمر بن عبدالعزیز کے نزدیک وہ عدل بھی کوئی عدل نہیں ہے۔ جس کا حکم نافذ نہ کرایا جا سکے اور حقوق پر قبضہ نہ دلوایا جائے، مثال کے طور پر قاضی اگر کسی حق دار کے حق میں فیصلہ کر دے لیکن اسے دلوا نہ سکے تو یہ عدل نہیں ہے۔ چنانچہ ایک مرتبہ آپ کے ہاتھ میں ایک شخص کا خط آیا جس میں اس نے اپنے بیٹے کے ظلم کی شکایت کی۔ آپ نے لکھا کہ اگر میں تجھے انصاف کے ساتھ تیرا حق نہ دلواؤں تو میں ظالم ہوں۔

(العقد الفرید جلد۴ ص ۲۰۹)

سیدنا عمر بن عبدالعزیزؒ کے نزدیک قاضی کو فیصلہ میں تاخیر نہیں کرنی چاہیے بلکہ جلدی کرنی چاہیے، جب اس پر حق واضح ہو جائے۔ قاضی کے علم ویقین کے ہوتے ہوئے دلیل کے ضرورت نہیں رہتی۔ چنانچہ آپ نے ولید کے بیٹوں کے مقدمات کے سلسلہ میں جنہوں نے اہل حمص پر ظلم کیا تھا فوراً فیصلہ فرمایا(حیاۃ الحیوان للد میری جلد ا ص ۶۹) ابو الزناد فرماتے ہیں۔ کہ عمر بن عبدالعزیزؒ ظلم سے حاصل کی ہوئی اشیاء حق داروں کو ادنیٰ سے ثبوت کو کافی سمجھتے ہوئے لوٹا دیا کرتے تھے۔ جب آپ کسی شخص پر ظلم کیے جانے کی وجہ پہچان جاتے تھے تو اس کی چیز اس کو دلوا دیا کرتے تھے اور اسے تحقیق ثبوت پر مجبور نہیں کیا کرتے تھے۔ چنانچہ ایک روز آپ کو عدی بن ارطاط نے خط لکھا کہ آپ مجھے اجازت مرحمت فرمائیں کہ میں لوگوں کو قدرے سزا دے لیا کروں تا کہ وہ جرم کا اقرار کر لیں۔ اس کے خط کے جواب میں عمرؒ نے انہیں لکھا:

"مجھے انتہائی حیرت اور تعجب ہے کہ تم نے مجھ سے لوگوں کو سزا دینے کے بارہ میں اجازت مانگی ہے۔ گویا میں اللہ کے عذاب سے تمہاری ڈھال ہوں اور گویا میری رضا تمہیں اللہ تعالیٰ کی ناراضگی سے بچالے گی، لہذا غور کرو کہ جس پر ثبوت قائم ہو جائے، اسے ثبوت کی وجہ سے پکڑ لو اور جو اقرار کر لے اسے اقرار کی وجہ سے پکڑ لو اور جو انکار کرے اس سے عظمت والے اللہ کی قسم کھلواؤ، پھر اگر وہ قسم کھالے تو اسے چھوڑ دو۔ اللہ کی قسم! اگر لوگ اپنے جرائم کے ساتھ اللہ سے ملیں تو مجھے اس سے زیادہ محبوب ہے کہ میں ان کے خونوں کے ساتھ اللہ سے ملوں۔ والسلام (سیرۃ ابن عبدالحکم ص ۱۲۹، سیرۃ ابن جوزی ص ۷۹، ص ۸۲، لعقد الفرید جلد۴ ص ۴۳۴، کتاب الخراج لابی یوسف ص ۱۱۹)

پھر جیسے آپ کے نزدیک علم کے وقت حکم میں جلدی ضروری اور واجب تھی اسی طرح دلیل کے ظاہر ہو جانے کے بعد بھی جلدی واجب تھی۔ لیکن اگر قاضی کے پاس نہ تو علم ہو اور نہ ہی دلیل ہو تو پھر اس کا فرض ہے کہ وہ مقدمہ کی چھان پھٹک اور حالات سے آشنا ہونے کے لیے پوری پوری تحقیق و تفتیش کرے یہاں تک کہ اس پر اس کے دلائل ظاہر ہو جائیں، اور اگر تحقیق و تفتیش کے بعد بھی دلائل ظاہر نہ ہوں تو پھر وہ مقدمہ عمرؒ کے پاس بھیج دے تاکہ آپ خود کوئی رائے قائم کر سکیں۔ یہ جلدی آپ کے نزدیک ہر مقدمہ میں ضروری تھی، جس میں قتل وغیرہ کی حد نہ ہو اور اگر حد ہو تو اس کا عدم نفاذ ضروری تھا جب تک اسے خلیفہ کے پاس بھیج کر اس سے تبادلہ خیالات نہ کر لیا جائے۔ یہی بات ایک مرتبہ عمر بن عبدالعزیزؒ نے ولید بن عبدالملک کو سمجھائی لیکن اس نے نہ مانی۔ آپ نے مسند نشین خلافت ہوتے ہی اس پر عمل کیا (تاریخ الامم الاسلامیہ جلد ۲ ص ۱۸۴) لیکن غیر حد والے مقدمات میں آپ نے قاضیوں کو اجازت دے دی تھی کہ مجھ سے مشورہ کیے بغیر ہی لوگوں کے حقوق انہیں لوٹا دیے جائیں۔

مقدمات کے جلد فیصلہ کرنے اور لوگوں کے حقوق جلد لوٹانے کا فیصلہ آپ نے اس لیے کیا تھا کیونکہ آپ کے خلیفہ بننے سے قبل یہ سال ہا سال تک نہیں لوٹائے جاتے تھے یہاں تک کہ انہیں لوٹائے جانے کی خوشی اور مسرت ختم ہو جاتی تھی اور پھر وہ یاس و قنوط کے عالم میں مبتلا ہو جاتے۔ سابقہ خلفاء کے زمانوں میں کوئی شخص ایسا نہ تھا۔ کہ اسے اس کا حق مل جاتا جب تک کہ اس کے صبر کا پیمانہ لبریز نہ ہو جاتا اور وہ عالم شباب سے عالم پیری میں نہ چلا جاتا۔ جب انسان کی تمام قوتیں نحیف و مضمحل ہو جاتی ہیں اور عدالت سے حق وانصاف حاصل کرنے میں ایک طویل زمانہ گذر جاتا ہے جیسا کہ آج کل ہمارے ہاں ہوتا ہے کہ بعض لوگ قبر کی آغوش میں چلے گئے، لیکن ان کے مقدمات کا فیصلہ نہ ہوا اور نہ ان کا حق انہیں ملا اور اگر کسی عدالت نے اس کے حق میں فیصلہ کر بھی دیا تو اپیلوں میں اس کو اتنا الجھایا کہ وہ پریشان ہو کر یا تو مقدمہ سے دست بردار ہو گیا یا پھر موت کی آغوش میں چلا گیا۔ جس طرح یہاں معاملہ نیچے سے اوپر تک پہنچتا ہے اسی طرح آپ سے پہلے خلفاء کے زمانوں میں بھی مقدمہ کو نیچے سے اوپر جاتے جاتے کئی سال لگ جاتے۔ یہ دیر اور تاخیر آپ کو بہت گراں گذرتی۔ چنانچہ ایک مرتبہ آپ کے ایک گورنر عبدالحمید بن عبدالرحمٰن

Marfat.com

مقدمات میں آپ سے بار بار تبادلہ خیالات کرتے رہے۔ آخر کار آپ نے اسے لکھا:
"عبدالحمید! مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اگر میں تمہیں لکھتا کہ کسی شخص کو ایک بکری دے دو تو تم مجھے لکھتے: بکری دے دوں یا بکرا؟ اگر میں نر یا مادہ کی تعین کر دیتا تو پھر تم لکھتے کہ کتنی عمر کا جانور دوں؟ اگر میں عمر کا بھی تعین کر دیتا تو تم مجھے لکھتے: دنبہ دوں یا بکرا؟ یہ سب تاخیری حربے ہیں جو لوگوں کو پریشان کرتے ہیں، لہذا جب میں تمہیں لکھوں کہ فوراً اس کی تعمیل کرو اور مجھ سے زیادہ پوچھ گچھ نہ کیا کرو۔ مجھے یہ بالکل پسند نہیں ہے۔ والسلام
(العقد الفرید جلد۴ ص ۴۳۷)

عمر بن عبدالعزیزؒ کے زمانہ میں فیصلہ کرنے کے لیے کوئی خاص جگہ مقرر نہیں تھی۔ قاضی حضرات جہاں جاتے وہاں قاضی بن جاتے اور ان کے سایہ میں عدالت چلتی۔ خود امیرالمومنین کا بھی یہی حال تھا کہ جہاں آپ جاتے آپ لوگوں کے شکوے اور شکایات سُنتے، کبھی دارالامارۃ میں تو کبھی اپنے رہائشی گھر میں اور کبھی مسجد میں، خطبہ کے وقت بھی اور آرام کے وقت بھی (البیان والتبین جلد۳ ص ۱۷۸) پھر آپ کے زمانہ میں قاضی منفرد ہوا کرتا تھا جیسے کہ دوسرے خلفاء کے زمانوں میں ہوتا تھا۔ آپ نے قاضیوں کی کوئی ایسی جماعت مقرر نہیں کی ہوئی تھی کہ وہ سب مل کر فیصلہ کریں، لیکن آپ نے منفرد قاضی کو لغزش سے محفوظ رہنے کی تدبیر سمجھا دی تھی کہ وہ اہم مقدمات میں اہل علم سے مشورہ کر لیا کرے۔ اس وجہ سے وہ اپنے فیصلوں میں غلطی اور لغزش سے بچ جاتا۔ اگر کوئی قاضی یا عامل جان بوجھ کی غلطی کرتا تو اس کی پہلی سزا زجر وتوبیخ اور ملامت تھی، لیکن اگر وہ اس کے باوجود بھی متنبہ نہ ہوتا تو پھر عمرؒ کے پاس معزولی کے علاوہ اور کوئی چارۂ کار نہ تھا۔ عمرؒ نے عدی بن ارطاط کو کوفہ کا حاکم اور قاضی بنایا۔ ایک مرتبہ اس سے کوتاہی ہوگئی۔ عمر بن عبدالعزیزؒ نے انہیں لکھا:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم: امابعد! تو نے مجھے اپنی سیاہ پگڑی سے علماء کی مجلس میں اٹھنے بیٹھنے سے اور اپنے پیچھے پگڑی کا شملہ چھوڑنے سے دھوکہ دیا اور تو نے میرے سامنے بھلائی ظاہر کی اور میں نے تیرے ساتھ نیک گمان کر لیا، لیکن اللہ تعالیٰ نے وہ باتیں ظاہر کر دیں جن کو تو چھپایا کرتا تھا۔ والسلام

علاوہ ازیں آپ نے قاضیوں کو راہ راست پر رکھنے کے لیے ان پر جاسوس مقرر

Marfat.com

کیے ہوئے تھے جو قاضی کے کردار اور فیصلوں میں ان کے جانب دار اور غیر جانب دار ہونے یا ہدیہ وغیرہ قبول کرنے کے بارہ میں امیر المومنین کو پوری پوری اطلاع دیتے تھے اور اگر کوئی قاضی قصوروار ثابت ہوتا تو اس کے خلاف تادیبی کاروائی کی جاتی۔ (سیرۃ ابن جوزی ص ۸۸، الکامل للمبرد جلد ا ص ۳۰۶) اس کے ساتھ ساتھ عاملوں اور قاضیوں سے رائے عامہ کا محاسبہ بھی ساقط نہیں فرمایا تھا۔ حج کے موسم میں عمال اور قضاۃ کے اعمال ناموں کو ان پر پیش کیا جاتا تاکہ لوگوں سے مشورہ کے بعد جسے آپ چاہیں بحال رکھیں اور جسے چاہیں معزول فرمادیں۔ اس سے یہ فائدہ بھی ہوتا تھا کہ حجاج کرام اس بات سے بخوبی آشنا ہو جاتے کہ عدل وانصاف کے بارہ میں آپ کی نیت پر خلوص ہے اور وہ واپسی پر اپنے اپنے علاقوں میں امیر المومنین کی عدل وانصاف اور لوگوں کو حقوق دلوانے کے بارہ میں پُر خلوص نیت کا پرچار کرتے۔

قاضیوں کی رشوت سے حفاظت

اسلام میں قاضی کو بہت زیادہ اختیارات دیے گئے ہیں یہاں تک کہ امیر المومنین بھی اس کی عدالت میں اسی طرح حاضر ہوگا جس طرح ایک عام آدمی حاضر ہوتا ہے، لیکن خطرہ یہ ہوتا ہے کہ اتنے اختیارات کے ساتھ وہ رشوت کا مرتکب نہ ہو جائے، اور عدلیہ جب راشی ہو جاتی ہے تو پھر ملک میں انصاف بکتا ہے اور غریب جو انصاف خرید نہیں سکتا، ظلم وستم کی چکی میں پس جاتا ہے اور اس کے برعکس امیر کے ظلم وستم کرنے میں تیزی آ جاتی ہے، کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ میں جب چاہوں انصاف خرید سکتا ہوں اور جس ملک میں انصاف بکتا ہو وہ زیادہ دیر تک قائم نہیں رہ سکتا۔ اسلام نے قاضی کو نہ صرف رشوت لینے سے منع کیا بلکہ ہدیہ اور تحفہ قبول کرنے سے بھی روکا۔ ہدیہ کا اصل مادہ ''ھدی'' ہے۔ یہ لفظ جوڑنے اور ملانے پر بولا جاتا ہے۔ چنانچہ عربی زبان میں کہتے ہیں: ''اھدی الرجل امراته'' یعنی مرد نے اپنی دلہن کو اپنے پاس بلایا اور اس سے ملا۔ اس کی جمع ''ھدایا'' آتی ہے جب کہ اہل مدینہ کی لغت میں ''ھدادی'' ہے۔ صحاح جوہری میں ہے کہ ''مھدی'' (میم پر زیر کے ساتھ) سے مراد تھالی یا طباق اسی وقت ہوگا جب کہ ہدیہ دی ہوئی شے اس کے اندر موجود ہو۔ حدیث میں ہے: ''تھادو و اتحابوا'' ایک دوسرے کو ہدیے دیا کرو اس سے

Marfat.com

محبت میں اضافہ ہوتا ہے۔ (صحاح جوہری جلد۲ ص۲۴۔۲۵)

عام اصطلاح میں ہدیہ کی مختلف تعریفیں کی گئی ہیں۔کوئی کہتا ہے کہ کسی شرط کے بغیر ایک آدمی دوسرے آدمی کو جو مال دیتا ہے اس کو ہدیہ کہتے ہیں۔ اس کی تعریف میں "کسی شرط کے بغیر" کے الفاظ قید احترازی کی حیثیت رکھتے ہیں۔اس سے رشوت خارج ہو جاتی ہے۔ (فتاویٰ ہندیہ جلد۳ ص ۱۲۲۶) نیز ان الفاظ سے بدلہ کا ہدیہ بھی خارج ہو جاتا ہے۔ یہ وہ ہدیہ ہے جس میں اسی جیسا یا اس سے کم یا زیادہ تحفہ لوٹانے کی پیشگی شرط ہوتی ہے۔

ایک تعریف یہ بھی کی گئی ہے۔ کہ" ایک شخص پہل کر کے دوسرے کو اس کی طلب کے بغیر ہدیہ دے۔ (کشاف القفاع عن متن الاقناع جلد ۶ ص ۳۱۷)

ایک اور تعریف اس کی یہ کی گئی ہے۔ کہ" ہدیہ وہ مال ہے جو دلی محبت کے اظہار، الفت کے حصول اور ثواب کی غرض سے عزیزوں ، دوستوں ،علماء ومشائخ اور صالحین کو دیا جائے جن کے بارہ حسن ظن ہو۔ (السیاستہ الشرعیہ فی حقوق الراعی وسعادۃ الرعیۃ ص ۵۰)

علماء نے لکھا ہے کہ ہدیہ دینا اگرچہ مستحب ہے اور اس کا لین دین اس شخص کے لیے ہوگا جو مسلمان کے کسی کام کا نگران اور ذمہ دار نہ ہو۔ رہا وہ شخص جسے کسی قسم کی ذمہ داری سونپی گئی ہو جیسے قاضی (جج) سربراہ مملکت ، وزیر اعظم یا وزراء اور گورنر یا دوسرے ارکان سلطنت ،تو ایسے عہدیداران کے لے ہدیہ قبول کرنے سے گریز کرنا چاہیے۔ اگر کسی رُکن مملکت خواہ وہ کلرک ، چپڑاسی یا کوئی معمولی ملازم ہی کیوں نہ ہو، سے کام کرایا جاتا ہے جو اس ملازم پر ہدیہ لیے بغیر بھی فرض ہوتا ہے یا اگر اسی کے فرض کو یاد دلانے کے لیے اسے کوئی ہدیہ یا تحفہ دیا گیا تو وہ ایک قسم کی رشوت ہو گی۔ (المبسوط سرخسی جلد ۱۶ ص ۸۲) کیونکہ ہدیہ دینے والا جس کو ہدیہ پیش کرتا ہے اس کی قربت اور نزدیکی کا خواست گار ہوتا ہے،لیکن چونکہ خدا کی قربت اور نزدیکی مطلوب نہیں ہوتی اس لیے اس کے اندر کسی خیر کے پیدا ہونے کا سوال نہیں آتا۔ وہ صرف یہ چاہتا ہے کہ ہدیہ لینے والے کے دل میں اس کے لیے نرم گوشہ پیدا ہو سکے۔ اس طرح اس کا دینا دلانا ایک دلی مقصد کے تحت ہوتا ہے جس کے خارج میں پائے جانے کو وہ دل سے چاہتا ہے، کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ ہدیہ لینے والا صاحب اقتدار ، ذی جاہ اور بارسوخ آدمی ہے۔ اگر اس کی خوشنودی حاصل رہی تو اسے

Marfat.com

کامیابی ہو گی۔ اس کی توجہ اس کی طرف منعطف رہی تو اس کا کام ہو جائے گا۔ دوسروں کے خلاف انہیں مدد مل جایا کرے گی یا کوئی منصب یا ملازمت حاصل ہو گی یا قاضی کوئی فیصلہ میرے حق میں کر دے گا یا ایسی ہی کوئی صورت میسر آئے گا جس سے شخصی اور ذاتی مفاد کا حصول ممکن ہوتا ہے۔ (السیاسۃ الشرعیہ فی حقوق الرائی وسعادۃ الرعیہ ص ۵۰)

اسی وجہ سے ابن التین فرماتے ہیں۔ کہ گورنروں اور قاضیوں کو تحفہ دینا رشوت ہے۔ اس کو تحفہ اور ہدیہ کہا بھی نہیں جا سکتا، اس لیے کہ اگر وہ شخص گورنر یا قاضی نہ ہوتا تو کون اسے تحفہ دیتا؟ یونہی قاضی کو ہدیہ دینا سخت قبیح اور حرام ہے۔ وہ اس کا مالک بھی نہ ہو گا۔

(عمدۃ القاری شرح صحیح البخاری جلد ۱۱ ص ۴۰۷)

اور ربیعہ کہتے ہیں۔ کہ ہدیہ سے بچو، اس لیے کہ ہدیہ رشوت کا زینہ ہے۔

(معین الحکام ص ۱۷)

سیدنا فاروق اعظمؓ گورنروں کے تحفے اول تو قبول نہیں کرتے تھے اور اگر قبول بھی فرماتے تو اسے بیت المال میں داخل فرما دیتے تھے۔ اگر ان سے کوئی کہتا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہدیہ قبول فرماتے تھے تو آپ جواب دیتے کہ آپ کے وقت میں وہ ہدیہ ہوتا تھا، لیکن آج وہ رشوت ہے۔ (حاشیہ الرہوتی جلد ۷ ص ۳۱۲)

اور سیدنا عمر بن عبدالعزیزؒ سے جب یہ سوال ہوتا تو آپ فرماتے کہ آپ کے لیے وہ ہدیہ ہوتا تھا۔ لیکن ہمارے لیے رشوت ہے۔ کیونکہ آپ کو ہدیہ مقام نبوت پر فائز ہونے کی وجہ سے ملتا تھا اور ہمیں والی ہونے کی بنا پر۔

(معین الحکام ص ۱۷، الحلال والحرام فی الاسلام یوسف القرضاوی ص ۳۴۲)

کسی شاعرہ کیا اچھا کہا ہے۔

فساد الدین و الدنیا　　قبول الحاکم المالا

"حاکم کا مال قبول کرنا دین و دنیا کی خرابی کا باعث ہے۔"

ایک اور شاعر نے کہا ہے۔

اذا اتت الهدية دار قوم　　تطایرت الامانة من کو اھا

"جب ہدیہ کسی قوم کے گھر آتا ہے تو امانت اس کے روشن دانوں سے نکل کر اڑ جاتی ہے۔" (المبسوط جلد ۷ ص ۳۱۲، السیاسۃ الشرعیہ ص ۵۳)

Marfat.com

ہدیہ دینے والا جب پہلے سے ہدیہ نہیں دیتا تھا بلکہ ابھی ابھی دینا شروع کیا تو لامحالہ اس کی اس میں کوئی غرض پنہاں ہوگی، اور وہ غرض اس کے سوا کیا ہوسکتی ہے۔ کہ وہ باطل مقاصد کے لیے اس کی آڑ لینا چاہتا ہے۔ یا اس لین دین کے ذریعے وہ کسی شے پر اپنا حق جتلانا چاہتا ہے، اور یہ تمام چیزیں کھلم کھلا حرام ہیں۔ (عون المعبود جلد ۹ ص ۴۹۸)

قاضی اس شخص سے ہدیہ قبول کرسکتا ہے جس کا کوئی تنازعہ اس کی عدالت میں دائر نہ ہو اور منصب قضا پر فائز ہونے سے قبل بھی قرابت داری کی وجہ سے ان کے درمیان تحفہ تحائف کا تبادلہ ہوا کرتا تھا جیسے ذی رحم محرم نے تحفہ دیا ہو، اس سے تحفہ لینا اس کے لیے درست ہے کہ اس قرابت داری کے ہوتے ہوئے قاضی اس کے حق میں فیصلہ نہیں کرسکتا۔ اسی طرح دوستانہ تحفہ بھی درست ہے لیکن اس شرط کے ساتھ کہ منصب قضا پر فائز ہونے سے پہلے اس کو جتنا ہدیہ دیتا تھا اس سے زائد نہ دینے لگا ہو۔

(فتاویٰ ہندیہ جلد ۳ ص ۲۲۶، ردالمختار شامی جلد ۴ ص ۳۱۱، شرح الجوہرۃ جلد ۲ ص ۲۴۲، جواہر العقود جلد ۲ ص ۳۵۷، المبسوط جلد ۱۶ ص ۸۲، سبل السلام جلد ۴ ص ۱۶۷، المہذب جلد ۲ ص ۲۹۲)

اسی طرح قاضی صدر مملکت سے تحفہ لے سکتا ہے جس نے اس کو قاضی بنایا اور خود اس کا کوئی مقدمہ اس کی عدالت میں دائر نہیں ہے یا مقدمہ دائر تھا لیکن پیشتر ہی اس نے اس کا فیصلہ سنا دیا تھا۔ (فتاویٰ ہندیہ جلد ۳ ص ۲۲۶، ردالمختار شامی جلد ۴ ص ۳۱۱۰)

ان صورتوں میں تحفہ تحائف کا لین دین اس لیے درست ہے کہ ہدیہ دینے میں سردست کسی تہمت کا ڈر نہیں کیونکہ ڈر اس کے میلان طبع یا دائر تنازعہ کی وجہ سے ہوتا ہے اور یہ دونوں چیزیں اس وقت مفقود ہیں۔ (کشاف القناع عن متن الاقناع جلد ۶ ص ۳۱۷) نیز اس لیے کہ پیشتر بھی ان میں ہدیہ کا لین دین جاری تھا۔

(المغنی والشرح الکبیر جلد ۱۱ ص ۴۳۷)

یہ ایک رائے ہے لیکن ان سب چیزوں کے باوجود علامہ علاء الدین طرابلسیؒ کی رائے یہ ہے کہ قاضی کو مطلق تحفہ تحائف لینے سے گریز کرنا چاہیے کیونکہ تحفہ قبول کرنے پر لینے والا دینے والے سے لازماً نرم روی اور سیر چشمی کا برتاؤ کرتا ہے جس کا خمیازہ قاضی کو بھگتنا پڑتا ہے اور بگاڑ سے بچنا اس کے لیے مشکل ہوتا ہے۔ (معین الحکام ص ۱۷)

مذکورہ بالا افراد کے علاوہ دیگر افراد سے قاضی کو تحفہ قبول کرنا جائز نہیں ہے، اس

Marfat.com

لیے کہ وہاں تہمت لگنے کا اندیشہ ہے۔

قاضی اگر رشوت لے کر کوئی فیصلہ کرتا ہے تو اس کے فیصلہ پر جرم رشوت کے کیا اثرات مرتب ہوں گے؟ اس کی تفصیل یوں ہے کہ منصب قضا پر کسی ایسے شخص کو فائز کیا جاتا ہے جس کے اندر عدل و انصاف کی صفت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہو اور اس کی امتیازی شان یہ ہو کہ وہ جذبات و احساسات سے بالاتر ہو کر محض اللہ کی رضا کے لیے فیصلے کرے تاکہ مجلس قضاء میں فریقین کے درمیان حق و صداقت اور عدل و انصاف جاری و ساری ہو۔ اب اگر رشوت درمیان میں گھس آئے تو ظاہر ہے کہ اس کے نتیجہ میں یہ عظیم صفت زائل ہو جائے گی اور اس کی جگہ فسق و فجور کا دور دورہ ہوگا اور قاضی ذاتی اور شخصی مصلحت اور خواہشات کے تحت فیصلہ کرے گا۔ خود رشوت لے گا یا اس کا بیٹا، اس کی بیوی یا اس سے متعلق اس کا کوئی خویش و عزیز رشوت ستانی کا جرم کرے گا اور قاضی بھی اس سے فائدہ اٹھائے گا اور اسے رشوت لینے کا علم ہوگا۔ رشوت ستانی کے اس وقوعہ کے بعد یا کسی اور جرم کے ارتکاب کے بعد کیا قاضی صحیح فیصلہ دے گا؟ یا اس کا فیصلہ نافذ ہونے کے لائق ہوگا؟ یا رشوت ستانی کا اس پر نمایاں اثر ہوگا؟ اس کے بارہ میں تین مسلک ہیں جس کی تفصیل ہم نے اپنی کتاب ''سیرۃ حضرت عمر فاروقؓ'' میں دی ہے۔

یہ قاضی کی رشوت ستانی کی تفصیل جملہ معترضہ کے طور پر درمیان آ گئی۔ بات یہ ہو رہی تھی کہ عمر بن عبدالعزیزؒ کے نزدیک اس بات کا شدید خطرہ تھا کہ قاضیوں میں کہیں رشوت کا چلن نہ ہو جائے۔ اس کو روکنے کے لیے آپ نے قاضیوں پر مختلف قسم کی بندشیں لگائیں اور قضاۃ کی بڑی بڑی تنخواہیں مقرر کیں تاکہ انہیں بالائی آمدنی کی ضرورت محسوس نہ ہو کیونکہ جب آمدنی کم ہو اور گھر کے اخراجات زیادہ ہوں تو آدمی بالائی آمدنی کے لیے جدوجہد کرتا ہے۔ دوسری بات اس سلسلہ میں آپ نے یہ کی کہ قاضی صرف ان لوگوں کو مقرر کیا جو دولت مند اور معاشرہ میں معزز تھے کیونکہ دولت مند ہونے کی وجہ سے وہ رشوت نہیں لے گا اور معزز ہونے کی وجہ سے وہ کسی کے دباؤ میں آ کر فیصلہ نہیں کرے گا۔ اور تیسرا اقدام رشوت وغیرہ کو روکنے کا آپ نے یہ اختیار فرمایا کہ قاضی کے لیے تجارت اور خرید و فروخت کو ممنوع قرار دے دیا۔ یہ تینوں باتیں آپ نے اپنے نانا جان سیدنا فاروق اعظمؓ سے لیں کیونکہ انہوں نے بھی قاضیوں کے لیے یہی اصول رکھے تھے۔

Marfat.com

مختصر یہ کہ عمر بن عبدالعزیزؒ اپنی رعایا کے ہر معاملہ میں عدل چاہتے تھے۔ خواہ وہ عدل قاضیوں سے متعلق ہو یا حاکموں اور گورنروں سے۔ کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ رعایا وہی عدل چاہتی ہے جس سے اسے سعادت نصیب ہو اور فقہی معنوں میں عدل مظلوم ہی چاہتا ہے۔ لوگ عدل سے خوش ہوتے ہیں کیونکہ ان کا خیال ہے کہ عدل سے انہیں تونگری کی سعادت اور برکتیں ملتی ہیں۔ اگر عدل انہیں فراخی، آسانی اور تونگری کی سعادت عطا نہ کرے تو پھر انہیں عدل کی کیا ضرورت ہے؟ عمر بن عبدالعزیزؒ کے ذہن میں یہ تمام باتیں تھیں۔ اس لیے آپ نے حج میں یہ اعلان فرما دیا کہ میں ہر مظلوم کی پناہ گاہ ہوں۔ مجھے چھوڑ کر کسی مظلوم کو کہیں جانے کی ضرورت نہیں ہے اور جو حاکم حق سے اعراض برتے اور قرآن وحدیث پر عمل پیرا نہ ہو اس کی اطاعت فرض نہیں ہے۔ پھر عمرؒ نے ظالم حکام کے بارہ میں ایک نہایت اہم اعلان یہ فرمایا کہ میں ظالم حکام کا معاملہ رعایا کو سونپنے والا ہوں تا کہ وہ نادم اور ذلیل ہو کر حق کی طرف لوٹیں۔ اس اعلان نے حکام کے دل لرزا دیے کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ رعایا ان سے اپنے حقوق زبردستی واپس لے لے گی۔ عمرؒ کے اس اعلان نے رعایا کو خوش کر دیا۔

بہر حال عمر بن عبدالعزیزؒ نے اپنے عہد خلافت میں پوری اسلامی مملکت میں عدل اجتماعی اور عدل وانصاف کو ایسا رائج کیا کہ لوگوں کو خلفائے راشدین کا زمانہ یاد آنے لگا اور جب ملک میں عدل وانصاف کا دور دورہ ہو تو پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے آسمانوں سے بھی برکات الٰہی کا نزول ہوتا ہے۔ چنانچہ عمرؒ کے زمانے میں ہر طرف عدل وانصاف کا دور دورہ تھا۔ پورے ملک میں امن وامان تھا۔ ظالم ظلم سے مایوس اور نا امید ہو چکا تھا۔ لیکن قضاء کا بار قاضیوں پر بھاری ہو گیا تھا، اس لیے وہ اپنے عہدوں سے سبکدوش ہونے کے خواہاں تھے، کیونکہ ان میں اپنے فرائض کا احساس ہو چکا تھا اور اس بات کا بھی احساس ہو گیا تھا کہ اگر انہوں نے عدل میں ذرا سی بھی کوتاہی کی تو ان سے باز پرس ہو گی۔ اس لیے یہ عہدہ ان پر بھاری ہو گیا تھا۔ چنانچہ میمون بن مہران جو جزیرہ کے عہدہ خراج کے رئیس تھے اور وہاں کے قاضی بھی تھے، انہوں نے گھبرا کر اس عہدہ سے استعفیٰ دے دیا اور عمرؒ نے ان کو لکھا:

"میں آپ کو ایسی کوئی تکلیف نہیں دینا چاہتا جو آپ کو مصیبت میں ڈال دے۔

Marfat.com

جو حق آپ پر منکشف ہوا اس کی روشنی میں معاملات کا فیصلہ کیجئے۔ اگر آپ کو کسی کام میں کسی قسم کی کوئی اُلجھن ہو تو اسے میرے پاس لائیں کیونکہ اگر کسی کام کے بھاری ہونے کی وجہ سے لوگ اس کام کو ترک کر دیں تو نہ دین قائم رہ سکتا ہے اور نہ ہی دنیا"۔ (سیرۃ ابن الجوزی ص ۹۷، کتاب الخراج لابی یوسف ص ۱۱۵)

جب کوئی قاضی آپ کو اپنے بارے میں کوئی شکایت کرتا تو آپ اس کو نہایت احسن طریق سے سمجھاتے۔ چنانچہ ایک مرتبہ ایک حاکم نے اپنی بیداری اور تکلیف و مشقت کی آپ سے شکایت کی۔ آپ نے اس کو جواب میں لکھا کہ تم اہل جہنم کی بیداری یاد کر لیا کرو۔ خبردار! اس راہ سے تمہارے قدم نہ پھسلیں، اور اسی بات پر تمہاری آخری سانس ختم ہو۔ والسلام اس نے حاکم جب آپ کا خط پڑھا تو تھرا گیا۔ پھر ایک طویل سفر کر کے حاضر خدمت ہوا۔ عمرؒ نے آنے کی وجہ پوچھی، بولا: آپ نے اپنے خط میں میرا دل توڑ دیا ہے۔ میں مرنے تک کبھی بھی آپ کا عامل نہ بنوں گا"۔ (حیاۃ الحیوان جلد ا ص ۱۳۵)

قضاۃ کی آپ کے زمانہ میں حالت یہ ہو چکی تھی کہ وہ عہدہ قضا کو قبول نہ کرتے تھے اور ملک میں قاضیوں کی کمی ہو گئی۔ چنانچہ ایک مرتبہ آپ نے عدی بن ارطاط گورنر بصرہ کو لکھا کہ ایاس بن معاویہ اور قاسم بن ربیعہ جو شخص میں جو زیادہ اہلیت رکھتا ہو اس کو قاضی مقرر کر دو۔ عدی بن ارطاط نے دونوں کو بلایا۔ ہر ایک نے کہا میں میں عہدہ قضا کے اہل نہیں ہوں۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ ہر ایک کو عہدہ قضا سے بچنے کے لیے جھوٹی قسم کھانا پڑی۔ ایاس نے گورنر بصرہ سے کہا کہ آپ میرے بارہ میں بصرہ کے دو مشہور علماء حسن بصری اور محمد بن سیرین سے پوچھ لیں کہ میں اس عہدہ کے قابل ہوں کہ نہیں۔ قاسم ان دونوں بزرگوں کے پاس آتے جاتے تھے اور ایاس آتے جاتے نہ تھے۔ قاسم کو پتہ تھا کہ عدی بن ارطاط اگر میرے بارہ میں ان دونوں بزرگوں سے استفسار کریں گے تو یقیناً دونوں مجھے بتا دیں گے، اس لیے انہوں نے عدی سے کہا کہ آپ ان دونوں سے میرے بارے میں نہ پوچھیں۔ اس کی قسم جس کے سوا کوئی ذات عبادت کے لائق نہیں ایاس مجھ سے زیادہ فقیہ اور قضا کے جاننے والے ہیں۔ اگر میں اس بات میں جھوٹا ہوں تو جھوٹا قاضی نہیں ہو سکتا اور اگر میں سچا ہوں تو آپ کو میری بات ماننا ہو گئی۔ اس طریقے سے قاسم نے عدی بن ارطاط پر انتخاب کے تمام دروازے بند کر دیے۔ آخر کار مجبور ہو کر ایاس ہی کو قاضی بنانا پڑا

Marfat.com

لیکن ایاس نے بھی قسم کھالی کہ وہ ولایت قضا کو کسی صورت قبول نہ کرے گا۔ قاسم نے عدی سے کہا: "عدی! آپ نے ایک شخص کو جہنم کے کنارے پر لا کر کھڑا کر دیا۔ پھر اس نے جھوٹی قسم کھا کر اپنے آپ کو بچالیا۔ اللہ تعالیٰ جھوٹ پر معاف فرمائے۔

(قصص العرب جلد ا ص ۳۶۸)

عمر بن عبدالعزیزؒ سے قبل قاضی حضرات حکام کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بنے ہوئے تھے اور ان کے مظالم سے حکام فائدہ اٹھاتے تھے اور علماء نے لکھا ہے کہ جب قاضی یا سپریم کورٹ حکمرانوں کے لیے برائی اور ظلم کا راستہ کھول دیتا ہے۔ تو اب اس کے لیے دوسرے دروازوں کا کھولنا نہایت آسان ہو جاتا ہے۔ عمر بن عبدالعزیزؒ نے مختلف علاقوں میں ایسے قاضی متعین فرمائے جنہوں نے حکام پر ہر فتنہ کا دروازہ بند کر دیا اور حاکموں کی ظالمانہ طبیعت کو رحم کی طبیعت میں تبدیل کر دیا۔ ہر علاقہ میں متقی اور پرہیز گار قاضی مقرر فرمائے جنہوں نے اپنے کتاب وسُنت کے مطابق فیصلوں سے لوگوں کا زندگی گذرانا آسان بنا دیا۔ چنانچہ افریقہ کے شہر قیروان کے حاکم اسماعیل بن عبیداللہ انصاری لوگوں میں جا کر انہیں یہ خوش خبری سُناتے تھے کہ تمہارے لیے بارگاہ خلافت سے عبداللہ بن مغیرہ قاضی بن کر آ رہے ہیں۔ جو اپنے علم وفضل اور تقویٰ وپرہیز گاری میں اپنی مثال آپ ہیں۔ اندازہ فرمایئے کہ ایک حاکم شہر ایک اچھے قاضی کے تقرر پر فخر ومباہات کر رہا ہے۔

(ریاض النفوس جلد ا ص ۸۱)

عمر بن عبدالعزیزؒ نے اپنے عہد خلافت میں عدل وانصاف کا اتنا پرچار کیا کہ اپنے سکوں پر بھی یہ الفاظ لکھائے "امر اللّٰہ بالعرفاء والعدل" یعنی اللہ تعالیٰ نے وفاداری اور عدل وانصاف کا حکم فرمایا ہے۔ (سیرۃ الجوزی ص ۸۰)

روایات سے یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچتی ہے۔ کہ جب ملک میں عدل وانصاف کا دور دورہ ہو۔ قاضی حضرات عدل وانصاف سے فیصلہ کرتے ہوں۔ حکام لوگوں کو عدل کا درس دیتے ہوں اور خود بھی عدل سے کام لیتے ہوں تو اس کے اثرات ملک کی ہر شے پر مرتب ہوتے ہیں۔ چنانچہ روایات میں آتا ہے سنہ ۹۹ ھ میں دریائے نیل کا پانی ۱۹ ہاتھ چڑھ گیا تھا۔ وہ اعتدال پر آ گیا۔ (النجوم الزاہرہ جلد ا ص ۵۴) مالک بن دینار فرماتے ہیں کہ جب عمر بن عبدالعزیزؒ مسند نشین خلافت ہوئے تو پہاڑوں کی چوٹیوں پر بکریاں چرانے

Marfat.com

والے چرواہوں نے پوچھا: ''کون صالح خلیفہ سریر آرائے خلافت ہوا ہے؟'' لوگوں نے ان سے پوچھا: کہ تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ کوئی نیا خلیفہ مسند خلافت پر بیٹھا ہے۔ بولے: جب صالح، نیک، پرہیز گار اور عدل وانصاف کرنے والا خلیفہ خلافت کی مسند پر بیٹھا ہے تو بھیڑیئے اور شیر ہماری بکریوں کو نہیں چھیڑتے اور ہماری بکریاں ان کے حملوں سے محفوظ رہتی ہیں۔ (صفۃ الصفوۃ جلد۲ص ۶۷)

Marfat.com

فتوحات

صاحبان اقتدار کے دماغ حکمرانہ، سینے میں دل استبدادانہ اور ہاتھ میں تلوار چمکدارانہ ہوتی ہے، اور ان کی ایک ہی خواہش ہوتی ہے۔ کہ ان کی حکمرانی کی حدود وثغور میں توسیع اور اضافہ ہوتا رہے۔ شیخ سعدیؒ نے حکمرانوں کی اسی کمزوری کی طرف اس طرح اشارہ فرمایا ہے۔

ہفت اقلیم اربگیرد بادشاہ
ہم چناں دربند اقلیمے دگر

یعنی حکمران اگر ہفت اقلیم کو بھی اپنے قبضہ میں لے لے پھر بھی اس کی سیری نہیں ہوئی اور وہ ایک اور اقلیم کی فتح کے درپے ہوتا ہے۔ یہ حکمرانوں کی ایک عام نفسیات ہے جس کی طرف اس شعر میں اشارہ کیا گیا ہے، لیکن اس شے کو پسند نہیں کرتا کہ سلطنت میں وسعت ہوتی رہے اور مفتوحہ علاقوں کا انتظام نہ کیا جائے۔ سیدنا عمرؒ نے دس سال چھ ماہ چار دن حکومت کی اور اس عرصہ میں تقریباً ۳۱ ہزار چھوٹے بڑے شہر فتح کیے اور اس طرح سے ایک وسیع وعریض سلطنت قائم کی لیکن جب تک مفتوح شہر کا پورا انتظام نہ کرلیا دوسرا شہر فتح نہیں کیا۔ مستشرقین سیدنا عمرؒ کی فتوحات کا اسکندر و چنگیز خان کو فتوحات سے موازنہ کرتے ہیں حالانکہ ان دونوں کی فتوحات کا سیدنا عمرؓ کی فتوحات سے کوئی مقابلہ اور جواز ہی نہیں کیونکہ ان دونوں کی فتوحات میں مفتوح ممالک کے باشندوں پر جو ظلم وستم کیے گئے وہ سفاکیت آپ کو سیدنا عمرؓ کے زمانہ کی فتوحات میں بالکل نظر نہیں آئے گی، بلکہ سیدنا عمرؓ کی

حکومت میں قانون کی حکمرانی تھی۔

پھر اسکندر اور چنگیز خان نے صرف فتوحات کیں۔ وہ آندھی کی طرح آئے اور بگولے کی طرح چلے گئے۔ انہوں نے اپنے مفتوحہ علاقوں کو کوئی نظام حکومت نہیں دیا۔ یہی وجہ تھی کہ ان فاتحین کے چلے جانے کے بعد ان کی وہ حکومتیں ختم ہو گئیں۔ لیکن سیدنا عمرؓ کے زمانہ میں جو شہر فتح ہوئے ان میں سے اکثر و بیشتر چودہ سو سال گذر جانے کے بعد بھی مسلمانوں کے قبضہ میں ہیں اور کئی سو سال تک ان میں وہی نظام حکومت جاری و ساری رہا جو سیدنا عمرؓ نے وہاں جاری کیا تھا۔ اس سے یہ پتہ چلا کہ مفتوحہ شہر کی اصلاح اور اس کو نظام حکومت دینا اس کو فتح کرنے سے کئی درجے بہتر ہے۔

سیدنا عمر بن عبدالعزیزؒ کا خلافت کے باب میں نقطۂ نظر دوسرے تمام اموی خلفاء سے الگ تھا۔ وہ یہ کہ آپ سلطنت کی توسیع کے قائل نہ تھے، بلکہ اس کی اصلاح کے قائل تھے، کیونکہ مختلف مفاسد اور خرابیوں نے ان کی سلطنت کو گھیر رکھا تھا۔ اس وجہ سے آپ کے عہد خلافت میں جو شے سب سے آخری درجہ میں نظر آتی ہے وہ فوجی اور عسکری سرگرمی ہے۔ آپ نے فتوحات کی طرف کوئی توجہ نہیں دی بلکہ جو علاقے ان کے زیر تسلط تھے ان کی بقا اور تحفظ اور ان میں قیام امن کی ضرورت ان کا مقصد خلافت تھا۔ چنانچہ انہوں نے اپنے زمانہ میں جارحانہ اقدام بہت کم کیا ہے صرف اندلس کے بعض علاقوں اور سندھ کے بعض علاقوں کی فتوحات کے علاوہ اور کوئی قابل ذکر فتوحات ان کے عہد خلافت میں نہیں ہوئیں۔

روایات سے پتہ چلتا ہے کہ مسلمانوں کے شہروں اور امراء میں حرص و خواہش کا شرر سلگنے لگا تھا اور سرحدوں پر اور اطراف ممالک میں اسلامی فوج نہایت منتشر اور پراگندہ حالت میں تھی۔ عمرؒ نے اس کا یہ علاج کیا کہ سرحدوں سے فوج واپس بلا لی اور اندرون ملک حکومت کی طاقت کو مضبوط کیا۔ بعض حضرات کا یہ خیال ہے کہ عمرؒ چونکہ فنون حرب و سیاست میں ماہر نہ تھے اور آپ خود کسی جنگ میں شریک نہ ہوئے تھے، لہذا فتوحات کو معطل کرنا ان کی ایک سیاسی غلطی تھی۔ حالانکہ اگر وہ فوجوں کو سرحدوں سے واپس نہ بلاتے تو آپ کی فتوحات تمام یورپ میں مشرق سے مغرب تک پھیل جاتیں۔ لیکن ہمارے خیال میں عمرؒ نے جو کچھ کیا نہایت درست کیا کیونکہ ان کے زمانہ میں اسلامی فوج پہلے جیسی نہ تھی اور نہ ہی

وہ جرأت تھی کہ کفن سر پر باندھ کر نکلتے۔ یہ لوگ حرص وآز کے بندے تھے، کیونکہ وہ مال غنیمت غلاموں کے بجائے آقاؤں، فوجیوں کے بجائے سپہ سالاروں میں تقسیم کرتے تھے۔ عمرؒ کی نظر میں بگاڑ گمان سے بھی کہیں زیادہ تھا، کیونکہ جو شہر فتح کیے جانے والے تھے، ان کا فتح کرنا آسان اور سہل نہ تھا اور اگر ان کو فتح کر بھی لیا جاتا تو وہ مسلمانوں میں فساد اور پریشانی کا باعث بنتے۔

عمرؒ کے نزدیک فتوحات سے مقصد مال و دولت اکٹھا کرنا نہیں تھا، بلکہ فتوحات سے اولین مقصد یہ تھا کہ اسلام کی دعوت دی جائے اور لوگوں کو مشرف باسلام کیا جائے، لیکن اب فتوحات امراء وخلفاء کی مالداری کا ذریعہ بن گئی تھیں۔ اپنی عیش وعشرت کے لیے سرکاری خزانے کو بھرا جائے اور اس کے لیے مسلمانوں سے بھی جزیہ لیا جائے۔

عمرؒ نے خلیفہ ہوتے ہیں فی الفور اطراف ممالک سے اسلامی فوج واپس بلا لی سوائے اس فوج کے جو میدان کارزار میں برسر پیکار تھی یا پھر اس سرحد پر متعین تھی جس پر دشمن کے حملہ کا خطرہ تھا۔ (آداب السلطانیہ للفخری ص ۱۷۶)

مسلمہ بن عبدالملک نے قسطنطنیہ پر حملہ کیا ہوا تھا۔ لیکن ان کا یہ حملہ فتح سے ہم کنار نہیں ہو رہا تھا بلکہ رومیوں اور بلغاریوں کے حملوں اور کچھ موسم کی خرابی کی وجہ سے مسلمان فوج جس نے شہر کا محاصرہ کیا ہوا تھا، برابر گھٹ رہی تھی۔ چنانچہ آپ نے تمام فوج کی تباہی کے خوف سے حکم بھیجا کہ مسلمہ اپنی تمام فوج سمیت واپس لوٹ آئیں۔ مسلمہ نے اس حکم کی فوری تعمیل کی۔ پھر عمرؒ نے طرندہ کی فوج کو ملیطہ واپس آنے کا حکم دیا۔

(تاریخ العرب المطول ص ۲۶۷)

خوارج کے فتنہ نے اول روز ہی سے مسلمانوں کی تاریخ کو رنگین کر دیا تھا۔ سیدنا معاویہؓ اور سیدنا علیؓ کے زمانوں میں انہوں نے کئی لڑائیاں لڑیں جن میں دونوں طرف سے کافی نقصان ہوا۔ سیدنا عمر بن عبدالعزیزؒ نے ان کے اور دوسرے فتنہ پرداز فرقوں کے خلاف بھی تلوار نہ اٹھائی، حالانکہ یہ فرقے اور خصوصی طور پر خوارج امویوں کے سخت خلاف تھے۔ آپ نے ان کو زبانی سمجھایا بجھایا بلکہ گورنر کوفہ عبدالحمید کو جو خوارج سے برسر پیکار تھے، ایک خط میں لکھا کہ "جب تک یہ لوگ خون ریزی اور ملک میں فساد برپا نہ کریں، ان سے کسی قسم کا تعرض نہ کیا جائے۔ ایک دوراندیش اور مستقل مزاج شخص کو میرا یہ حکم سنا

Marfat.com

کر تھوڑی سی فوج کے ساتھ بھیج دو۔ چنانچہ گورنر کوفہ نے محمد بن جریز بجلی کو دو ہزار فوجیوں کے ساتھ روانہ کر دیا۔

اس بارہ میں آپ نے اس سے بھی زیادہ احتیاط یہ فرمائی کہ خوارج کے سردار بسطام کو خط لکھ کر اصلاح ومناظرہ کی دعوت دی اور انہیں لکھا کہ" آؤ باہم مناظرہ کر لیں، اگر ہم حق پر ہوں تو تم دوسرے لوگوں کی طرح ہمارے حلقہ اطاعت میں داخل ہو جاؤ اور اگر تمہارا حق پر ہونا ثابت ہو گیا تو ہم تمہارے معاملہ پر غور کریں گے۔ بسطام نے اصلاح ومناظرہ کی دعوت کو قبول کر لیا۔ فریقین میں کئی مناظرے ہوئے جن کی تفصیلات طبری اور ابن اثیر وغیرہ میں موجود ہیں۔ لیکن سیدنا عمر بن عبدالعزیزؒ کی اس افہام وتفہیم کی دعوت کا کوئی اثر نہ ہوا اور خوارج اپنی مفسدانہ روش سے باز نہ آئے۔ آخر مجبور ہو کر آپ نے گورنر کوفہ کو ان شرائط کے ساتھ ان سے جنگ کرنے کی اجازت مرحمت فرمائی کہ:

۱۔ عورتوں، بچوں اور قیدیوں کو قتل نہ کیا جائے۔ بھاگنے والوں اور زخمیوں کا تعاقب نہ کیا جائے۔

۲۔ فتح کے بعد جو مال غنیمت ہاتھ آئے وہ ان کے اہل وعیال کو لوٹا دیا جائے۔

۳۔ قیدیوں کو اس وقت تک قید میں رکھا جائے جب تک وہ راہ راست پر نہ آجائیں۔

ان پابندیوں کے ساتھ گورنر کوفہ نے ان پر حملہ کیا لیکن شکست کھائی۔ آپ کو جب اس کی اطلاع ہوئی تو آپ نے مسلمہ بن عبدالملک کو روانہ کیا جس نے جلد ہی ان پر قابو پالیا۔ (البدایہ والنہایہ جلد ۹ ص)

Marfat.com

فاروقی خلافت کا احیاء

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے انتقال کے بعد خلافت کا جو سلسلہ چلا وہ ''خلافت علی منہاج النبوۃ'' تھی۔ ویسے تو ہر خلیفہ راشد اپنی جگہ پر نبوت کی نیابت کر رہا تھا، لیکن تمام خلفائے راشدین کا تنہا وجود ساری نظری اور عملی قوتوں اور نبوت کے تمام منصبوں کا جامع تھا۔ تلاوت آیات، تزکیہ نفس اور تعلیم کتاب وحکمت ان تینوں منصبوں میں نبوت کے نائب تھے۔ وہ منصب اجتہاد وقضا اور شرع کے ساتھ قوت ارشاد وتزکیہ وتربیت بھی رکھتے تھے۔ وہ ایک صاحب وحی کی طرح اللہ تعالیٰ کے قانون کی منادی کرتے۔ ایک نبی کی طرح دلوں اور روحوں کو پاکیزگی بخشتے اور ایک رسول کی طرح تعلیم کتاب وحکمت اور سنت سے امت کی تربیت وپرورش کرنے والے تھے۔ وہ ایک ہی وجود کے اندر صاحب امامت وخلافت بھی تھے اور صاحب اجتہاد وقضا بھی تھے اور صاحب سیاست ونظم احکام بلاد بھی۔ اصلا امامت کبریٰ کا مقام اجتہاد دینی اور سیاست ملکی دونوں سے مرکب ہے۔ اس لیے ان کی خلافت میں یہ دونوں قسمیں اپنی تمام شاخوں کے ساتھ اکھٹی تھیں۔

سیدنا عمر بن عبدالعزیزؒ خلافت میں وہی خصوصیات پیدا کرنا چاہتے تھے جو خلفاء راشدین کے زمانہ میں تھیں، لیکن اب زمانہ بدل چکا تھا اور عہد نبوت سے کافی دوری ہو چکی تھی۔ صحابہ کرامؓ کا دور ختم ہو چکا تھا اور بنوامیہ کے بعض خلفاء نے نظام خلافت کے نظریہ کو بدل دیا تھا۔ اب خلافت شورائی ہونے کے بجائے ملوکیت کا روپ دھار چکی تھی اور اس

Marfat.com

میں اتنی خرابیاں پیدا ہو چکی تھیں کہ اب آپ کے بس میں یہ نہیں رہا تھا کہ وہ اس نظریہ کو بدل سکیں۔ وقتی طور پر آپ نے اس بارہ میں بہت کچھ کیا لیکن وہ وقتی تھا اور آپ کے انتقال کے بعد آنے والے خلفاء نے وہ سب کچھ بدل دیا جو آپ نے کیا تھا۔

جیسا کہ گذشتہ صفحات میں ذکر کیا گیا ہے کہ آپ نے خلافت فاروقی کو اپنا نمونہ عمل بنایا اور اس بارہ میں سیدنا عمر فاروقؓ کے پوتے سیدنا سالم بن عبداللہؒ کو لکھا بھی کہ مجھے وہ تمام لائحہ عمل اور پروگرام لکھ کر بھیجیں جس کے تحت سیدنا عمرؓ نظام خلافت چلاتے تھے تاکہ میں بھی اس روش کے مطابق حکومت چلاؤں۔ سیدنا سالم بن عبداللہؒ نے وہ لائحہ عمل لکھ کر بھیج بھی دیا کہ لیکن ساتھ یہ لکھ کر بھیجا کہ اگر تم نے ان لوگوں کے ذریعہ اس لائحہ عمل کو چلا لیا تو تم سیدنا عمرؓ سے افضل ہو گے کیونکہ تمہارے ساتھیوں اور ان کے ساتھیوں میں بہت فرق ہے اور تمہاری رعایا اور ان کی رعایا میں فرق ہے۔

(تاریخ الخلفاء ص ۲۳۶، طبقات ابن سعد جلد ۵ ص ۲۹۲، البدایہ والنہایہ جلد ۹ ص ۱۹۹۔۲۰۰)

شروع دن ہی سے آپ کی یہ خواہش تھی کہ میں سیدنا عمرؓ کے نقش قدم پر چلوں اور آپ نے اس کے لیے بڑی کوشش کی اور اپنے زمانہ میں وہ اپنی ان کوششوں میں کامیاب بھی رہے کیونکہ آپ نے اپنی خلافت کی بنیاد کتاب اللہ، سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور سنت خلفائے راشدینؓ پر رکھی۔ چنانچہ آپ نے اپنی پہلی تقریر میں یہ فرمایا تھا:

"لوگو تمہارے نبی کے بعد کوئی نبی آنے والا نہیں اور اس پر جو کتاب (قرآن حکیم) نازل ہوئی ہے اس کے بعد کوئی دوسری کتاب نازل ہونے والی نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جو شے حلال کر دی وہ اب قیامت تک حلال رہے گی اور جو شے حرام کر دی وہ قیامت تک حرام رہے گی۔ میں اپنی جانب سے کوئی فیصلہ کرنے والا نہیں ہوں بلکہ میری حیثیت احکام الٰہی کو نافذ کرنے والے کی ہے۔ میں اپنی طرف سے خود کوئی بات شروع کرنے والا نہیں ہوں بلکہ میں محض اتباع اور پیروی کرنے والا ہوں۔ کسی شخص کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ خدا کی نافرمانی میں اس کی اطاعت کی جائے۔ میں تم سب میں سے بہتر بھی نہیں ہوں البتہ اللہ تعالیٰ نے مجھے تمہارے مقابلہ میں زیادہ گراں بار بنایا ہے، میں اس گراں باری

Marfat.com

سے سبکدوش ہونا چاہتا ہوں"۔

(طبقات ابن سعد جلد ۵ ص ۲۵۰۔۲۵۱، البدایہ النہایہ جلد ۹ ص)

حقیقت یہ ہے کہ سیدنا عمر بن عبدالعزیزؒ نے خلافت کی گراں باری سے سبکدوش ہونے کے لیے بہت سی اصلاحات کیں لیکن وہ پھر بھی ویسی حکومت نہ چلا سکے جیسی سیدنا عمرؓ نے چلائی تھی اس کی ایک وجہ تو ماحول کی ناہمواری تھی۔ ان کو وہ ماحول نہ ملا جو سیدنا عمرؓ کو ملا۔ ان کی رعایا صحابہ کرامؓ تھے جن کی زندگی کے نشیب و فراز سنت کی اتباع میں گذرتے تھے۔ جنہوں نے زمانے کے سرد و گرم تجربے کیے تھے۔ پھر ان کے مشیر سیدنا علیؓ، سیدنا عثمانؓ، سیدنا عبدالرحمٰنؓ جیسے جلیل القدر صحابہ تھے۔ سیدنا عمر بن عبدالعزیزؒ کو ایسے مشیر میسر نہیں آئے تھے۔ علاوہ ازیں سیدنا عمرؓ نے نظام حکومت چلانے کے لیے جو اصلاحات کیں وہ آج تک کوئی نہیں کر سکا۔ سیدنا عمرؓ پہلے شخص ہیں جنہوں نے ملک کے نظم و نسق کو صحیح طریقہ سے چلانے کے لیے اس کو مختلف صوبوں اور ڈویژنوں میں تقسیم کیا اور پھر ان کی حدود مقرر کیں۔ جو ممالک فتح ہوئے ان میں جو تقسیم پہلے سے تھی اور جو صوبے اور ضلعے پہلے حکمرانوں نے مقرر کر رکھے تھے ان کو اسی طرح رہنے دیا۔ پھر ہر ڈویژن اور صوبے میں کئی کئی اضلاع تھے۔ بعض روایات میں یہ بھی ہے کہ آپ نے گذشتہ ملکی تقسیم میں کچھ رد و بدل کیا۔ صوبوں اور ڈویژنوں اور اضلاع کی تقسیم کے بعد سب سے مقدم شے ملکی عہدیداران کا انتخاب تھا۔ کوئی سربراہ مملکت اور ملک کا وزیراعظم خواہ کیسا ہی بیدار مغز اور کوئی قانون کتنا ہی مکمل کیوں نہ ہو جب تک حکومت کے افسران قابل، لائق، راست باز، دیانت دار اور خدا سے ڈرنے والے نہ ہوں اور ان سے نہایت بیدار مغزی اور ہوشیاری سے کام نہ لیا جائے، صحیح نتیجہ برآمد نہیں ہو سکتا اور نہ ہی ملک ترقی کر سکتا ہے۔ اس معاملہ میں بھی سیدنا عمرؓ نے نہایت بیدار مغزی سے کام لیا اور حکومت کے ارکان اور ان کے افسران کے انتخاب میں بڑی احتیاط سے کام لیا۔ اس زمانہ میں چار اشخاص "دہاۃ العرب" کہلاتے تھے۔ سیدنا عمرو بن عاصؓ، سیدنا معاویہؓ، سیدنا مغیرہ بن شعبہؓ اور زیادؒ بن ابی سفیانؓ۔ سیدنا عمرؓ نے زیاد کے سوا تینوں کو بڑے بڑے ملکی عہدے دیے اور انہوں نے ان عہدوں کو نہایت خوش اسلوبی سے چلایا۔ پھر ان تینوں کو اپنی حکمت علمی سے خودسر بھی نہ ہونے دیا اور اپنے قابو میں رکھا۔ زیاد بن ابی سفیان اس زمانہ میں سولہ سالہ نوجوان تھے، اس لیے انہیں

Marfat.com

کوئی بڑا عہدہ تو نہ دیا لیکن ان کی قابلیت اور استعداد عملی کی وجہ سے سیدنا ابوموسیٰ اشعریؓ کو لکھا کہ ان کو ملکی معاملات اور حکومت میں اپنا مشیر کار بنائیں۔

جن حضرات نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں کوئی خاص یا اہم کام سرانجام دیا، سیدنا عمرؓ نے انہیں بھی ان کے مناسب حال عہدہ دیا، چنانچہ سیدنا عبداللہ بن ارقمؓ ایک جلیل القدر صحابی تھے۔ ایک مرتبہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے خط کا جواب خود اپنی طبیعت سے لکھا اور آپؐ نے سن کر اس کو بہت پسند فرمایا۔ اس موقع پر سیدنا عمرؓ بھی موجود تھے۔ آپ نے ان کی اس قابلیت اور جواب کو ذہن میں رکھا۔ چنانچہ آپ جب خلیفہ ہوئے تو ان کو اس وجہ سے میر منشی مقرر فرمایا۔ (ابن ایثر جلد۲ ص۲۲۰)

مختلف عہدیداران کے تقرر کے لیے کبھی مجلس شوریٰ کا اہم اجلاس بلایا جاتا اور اس میں ان عہدیداران حکومت کا انتخاب ہوتا تھا۔ چنانچہ جو شخص اس مجلس شوریٰ کے ارکان کی طرف سے منتخب کیا جاتا تھا، اس کا تقرر کر دیا جاتا۔

بعض دفعہ آپ کسی عہدے دار کا آزمائشی تقرر فرماتے اور اگر وہ اس عہدہ پر کامیاب نہ ہوتا تو اسے اس عہدہ سے معزول فرما دیتے۔ سیدنا ابوبکرؓ کا بھی یہی طریقہ تھا۔ چنانچہ انہوں نے اپنے عہد خلافت میں یزید بن ابی سفیانؓ کو شام کی مہم پر فوج کے ایک دستہ پر امیر بنا کر روانہ کیا تو ان کو بہت سی ہدایات دیں۔ ان ہدایات کا آغاز اس طرح کیا:

''میں نے تم کو اس لیے والی بنایا ہے کہ میں تم کو آزماؤں، تمہارا تجربہ کروں اور تم کو ٹریننگ دوں۔ اگر تم نے اچھا کام کیا تو میں عہدہ پر تم کو برقرار رکھوں گا اور ترقی دوں گا۔ اور اگر میرے معیار پر پورے نہ اُترے تو میں تمہیں اس عہدہ سے الگ کر دوں گا''۔ (ابن ایثر جلد۲ ص۲۸۶)

پھر آپ نے گورنروں کے فرائض بھی مقرر فرمائے اور جب ان کا تقرر کیا جاتا تو اس تقرری کے فرمان پر ان کے اختیارات اور فرائض کا ذکر ہوتا۔ ان کے گورنر مقرر ہوتے وقت ان کے اثاثوں کے ایک فہرست تیار کی جاتی کیونکہ کل کو ان کا احتساب بھی کرنا ہوتا تھا۔ چنانچہ ہر گورنر کی منقولہ اور غیر منقولہ جائیداد کی ایک مکمل فہرست تیار کر کے اپنے پاس محفوظ رکھ لیتے تھے اور جب دیکھتے کہ کسی عامل کی مالی حالت غیر معمولی زیادہ ہو گئی ہے تو

Marfat.com

اس کا احتساب کر کے مواخذہ کیا جاتا تھا۔ (فتوح البلدان ص ۲۱۹) گورنر کے مال میں اضافہ سے سیدنا عمرؓ کے نزدیک اس کی امانت ودیانت مشکوک سمجھی جاتی تھی۔ آپ ان سے پورا پورا حساب لیتے اور زائد سامان بحق سرکار ضبط کر لیتے۔ پھر اس سے فرماتے: ''ہم تمہیں گورنر بنا کر بھیجتے ہیں تاجر بنا کر نہیں بھیجتے''۔ گورنر کی اس مالی زیادتی کی ٹوہ کے لیے الگ کار خاص کے لوگ موجود ہوتے تھے اور گورنر خواہ مصر میں ہو یا شام میں اس کی ہر بات کی اطلاع امیر المومنین کو مدینہ میں ہوتی تھی۔

گورنروں کے لیے یہ ضروری قرار دیا گیا تھا کہ وہ ہر سال حج کے موقع پر مکہ مکرمہ میں اکھٹے ہوں۔ آپ وہاں عوام الناس سے گورنروں کے رویہ کے بارہ میں پوچھتے۔ گورنروں سے یہ پوچھ گچھ کسی خاص مجلس میں نہ ہوتی بلکہ حج میں سیدنا عمرؓ خود کھڑے ہو کر اعلان فرماتے تھے کہ ''اگر کسی شخص کو کسی عامل کے خلاف کوئی شکایت ہو تو پیش کرے''۔ چنانچہ اگر کوئی شکایت ہوتی تو وہ مجمع عام میں بیان کرتا اور سیدنا عمرؓ تحقیقات کر کے مناسب کاروائی کرتے۔

گورنروں اور حکومت کے دوسرے کارندوں کی تحقیقات کا ایک محکمہ بھی تھا جس کے انچارج سیدنا محمد بن مسلمہ انصاریؓ تھے۔ جس صوبے سے کسی گورنر کے خلاف کوئی شکایت موصول ہوتی تو وہ موقع پر جا کر تحقیق احوال کرتے۔ (اسدالغابہ تذکرہ محمد بن مسلمہؓ)

سیدنا عمرؓ کے عہد خلافت میں سب سے نمایاں شے عہدیداران حکومت کا احتساب تھا۔ حکومت کے نظم ونسق کو درست رکھنے کے لیے عہدیداران کا احتساب ایک نہایت ضروری چیز ہوتی ہے۔ سیدنا عمرؓ اس معاملہ میں کبھی نہیں چوکے۔ آپ کا احتساب اس قدر سخت ہوتا تھا کہ بڑے بڑے افسروں کو احتساب کا نام سُن کر پسینہ آ جاتا تھا۔

سیدنا عمر بن عبدالعزیزؒ نے یہ سب کچھ کیا لیکن وہ نتائج برآمد نہ ہوئے جو سیدنا فاروق اعظمؓ کے زمانہ میں برآمد ہوئے اور جو ہوئے بھی، وہ بھی وقتی تھے، دائمی نہ تھے۔

علالت و وفات

خلیفہ ہونے سے لے کر اڑھائی سال تک آپ نے نظام خلافت کو چلانے کے لیے شبانہ روز محنت کی۔ اس کے تمام مفاسدا اور خرابیوں کو دور کرنے کی پوری پوری کوشش کی یہاں تک کہ خلافت کی گراں باری نے آپ کی کمر کو دوہرا کر دیا اور دن رات کی فکر نے آپ کے گوشت کو کھا لیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آپ ہڈیوں کا ایک ڈھانچہ ہو کر رہ گئے لیکن دل مضبوط اور طاقتور تھا۔ لوگ برابر آپ کی خیروبرکت سے مستفید ہو رہے تھے۔ آخر رجب ۱۰۱ھ میں داعی اجل کو لبیک کہہ کر آپ اس عدم ہستی نما سے ہستی عدم نما کو انتقال فرما گئے۔
(اناللہ وانا الیہ راجعون)

آپ کی وفات کی وجوہات میں تاریخ میں دو روایات ہیں۔ ایک یہ کہ آپ کی وفات طبعی تھی اور دوسری یہ کہ شاہی خاندان کے افراد نے جب یہ محسوس کیا کہ آپ کی خلافت کا زمانہ جوں جوں لمبا ہوتا جا رہا ہے، آپ کی حکومتی پالیسیاں سخت سے سخت تر ہوتی جا رہی ہیں اور اگر آپ کا یہی طور طریقہ رہا تو جلد ہی اموی خاندان کی شاہانہ قوت ہمیشہ کے لیے دم توڑ دے گی، لہذا انہوں نے آپ کو راستے سے ہٹانے کی ٹھان لی اور اس کا طریقہ یہ اختیار کیا کہ آپ کے ایک غلام کو ایک ہزار دینار دے کر آپ کو زہر دلوا دیا۔ آپ کو اس بات کا علم ہو گیا، لیکن آپ نے غلام پر کوئی سختی نہ کی۔ صرف اس سے ایک ہزار دینار واپس لے کر ان کو بیت المال میں داخل کر لیا اور غلام کو آزاد کر دیا۔

(تاریخ الخلفاء ص ۲۴۷، البدایہ والنہایہ جلد ۹ ص ۲۰۹۔۲۲۰)

طبیب کو بلایا گیا اُس نے بھی زہر تشخیص کیا لیکن آپ نے علاج کروانے سے انکار کر دیا۔ شاید اس کی یہ وجہ ہو کہ غلام کا راز فاش نہ ہو اور کوئی اس پر سختی نہ کرے اور فرمایا: اگر مجھے یہ بھی یقین ہو جاتا کہ میرے کان کی لو کے پاس میری شفا ہے تو بھی میں اس کے لیے ہاتھ نہ بڑھاتا۔ (سیرت عمر بن عبدالعزیز ص ۲۷۶، البدایہ والنہایہ جلد ۹ ص ۲۱۰)

کتابوں میں ایک روایات یہ بھی ملتی ہے کہ آپ کی وفات ایک ولی اللہ کی دعا سے ہوئی۔ عبداللہ بن زکریاؒ اس زمانہ کے اولیاء کبار میں سے تھے۔ سیدنا عمر بن عبدالعزیزؒ نے آدمی بھیج کر ان کو بلوایا اور ان سے کہا: جانتے ہو کہ میں نے آپ کو کیوں بلوایا ہے؟ انہوں نے کہا: نہیں۔ فرمایا! ایک نہایت ضروری کام کے لیے بلوایا ہے، لیکن وہ بتاؤں گا اس وقت جب آپ قسم کھائیں گے کہ وہ کام ضرور کریں گے۔ عبداللہ بن زکریاؒ نے کہا: آپ کام بتائیں میں ضرور تعمیل کروں گا۔ فرمایا: پہلے قسم کھاؤ۔ انہوں نے قسم کھائی۔ فرمایا: اللہ سے دعا کرو کہ وہ مجھے اپنے پاس بلا لے۔ عبداللہ نے کہا: تب تو میں مسلمانوں میں سے بدترین شخص آپ کے پاس آیا ہوں اور امت محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کا بدترین دشمن ہوں۔ عمرؒ نے کہا: آپ نے قسم کھا لی ہے۔ آخر کار عبداللہ نے اپنی قسم پوری کرتے ہوئے آپ کی موت کی دعا مانگی لیکن دعا مانگتے ہوئے بہت ہچکچائے اور بادل نخواستہ ان الفاظ میں دعا مانگی: ''اے اللہ! آپ کے بعد مجھے بھی زندہ نہ رکھ''۔ جب عبداللہ یہ دعا مانگ رہے تھے اتنے میں عمرؒ کا ایک چھوٹا بچہ آ گیا۔ آپ نے عبداللہ سے کہا کہ اس کے لیے بھی دعا مانگیں کیونکہ مجھے اس سے بہت محبت ہے۔ عبداللہ نے اس بچہ کے لیے بھی دعا مانگی۔ پھر یوں ہوا کہ عبداللہ بھی عمرؒ کے بعد جلد ہی انتقال فرما گئے۔ پھر وہ بچہ بھی فوت ہو گیا۔

(سیرۃ ابن عبدالحکم ص ۱۱۵)

بہر حال سبب طبعی ہو یا زہر خورانی، آپ کو جب زندگی سے مایوسی ہو گئی تو اپنے بعد نامزد شدہ خلیفہ یزید بن عبدالملک کے لیے مندرجہ ذیل وصیت نامہ لکھوایا:

''میں تمہارے لیے یہ وصیت نامہ اس حالت میں لکھوا رہا ہوں کہ میں مرض سے نہایت لاغر ہو گیا ہوں، میرے قویٰ مضمحل ہو گئے ہیں۔ تم کو معلوم ہے کہ قیامت کے روز امور خلافت کے بارہ میں مجھ سے سوال کیا جائے گا اور اللہ تعالیٰ مجھ سے اس کا حساب لے گا اور میں اس سے اپنا کوئی اور فعل چھپا نہ سکوں گا۔

Marfat.com

کیونکہ حق تعالیٰ شانہ خود ہی فرمایا ہے۔

فلنقص علیهم بعلم و ما کنا غائبین

ہم ان کو علم سے قصہ سُناتے ہیں اور ہم غائب نہ تھے۔

اگر اللہ تعالیٰ مجھ سے راضی ہو گیا تو میں کامیاب وکامران ہوا، اور ایک طویل عذاب سے نجات پائی اور اگر وہ مجھ سے ناراض ہوا تو میرے انجام پر جتنا افسوس کیا جائے کم ہے میں اس اللہ سے جس کے سوا اور کوئی معبود نہیں، نہایت عجز و نیاز سے دعا کرتا ہوں کہ وہ اپنی رحمت سے عذاب جہنم سے نجات فرمائے اور اپنی رضا سے جنت الفردوس عطا فرمائے۔ میں تم کو وصیت کرتا ہوں کہ تقویٰ اختیار کرنا اور رعایا کا خیال رکھنا کیونکہ میرے بعد تم صرف تھوڑے روز زندہ رہو گے۔ تم کو اس بات سے بھی سخت احتراز کرنا چاہیے کہ تم سے غفلت اور جہالت میں ایسی لغزش سرزد ہو جس کی تم تلافی نہ کر سکو۔ سلیمان بن عبدالملک اللہ کا ایک بندہ تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اسے وفات دی اور اس کے بعد اللہ سبحانہ تعالیٰ نے مجھ کو خلیفہ بنایا اور میرے بعد تم کو ولی عہد مقرر کیا۔ میں جس حالت میں تھا اگر وہ اس لیے ہوتی کہ میں بہت سی بیویوں کا انتخاب کروں اور مال دولت اکٹھا کروں تو اللہ تعالیٰ نے مجھ کو اس سے بہتر سامان مہیا کیے تھے جو وہ کسی بندہ کو مہیا کر سکتا ہے لیکن میں سخت اور نازک سوال سے ڈرتا ہوں سوائے اس کے اللہ تعالیٰ میری دستگیری فرمائے"۔

(سیرۃ عمر بن عبدالعزیز لابن جوزی ص ۲۸۰)

مسلمہ بھی آپ کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے آپ کے اہل وعیال کے بارہ میں آپ سے کہا: امیر المومنین! آپ نے اپنی اولاد کا اس مال ودولت سے ہمیشہ منہ خشک رکھا ہے اور آپ ان کو ایسی حالت میں چھوڑے جاتے ہیں کہ ان کے پاس دنیا کے مال ومتاع کا کچھ نہیں۔ آپ ان کے بارہ میں مجھے یا اپنے خاندان کے کسی اور شخص کو کچھ وصیت کر جائیں۔ یہ سن کر فرمایا: کہ" مجھے ٹیک لگا کر بٹھا دو"۔ چنانچہ انہوں نے بٹھا دیا۔ پھر فرمایا: "تمہارا یہ کہنا کہ اس مال سے میں نے ہمیشہ اپنی اولاد کا منہ خشک رکھا ہے، خدا کی قسم! میں نے ان کا کوئی حق تلف نہیں کیا، البتہ جو ان کا حق نہیں تھا وہ ان کو نہیں دیا۔" اور

Marfat.com

تمہارا یہ کہنا کہ میں تمہیں یا خاندان کے کسی اور فرد کو وصیت کرتا جاؤں، تو سنو! "اس معاملہ میں میرا وصی اور ولی اللہ تعالیٰ ہے جو صلحاء کا ولی ہوتا ہے۔ میرے لڑکے اگر تقویٰ اختیار کریں گے تو اللہ تعالیٰ ان کے لیے کوئی سبیل نکال دے گا اور اگر وہ گناہ میں مبتلا ہوں گے تو میں ان کو گناہ کے لیے قوی اور طاقتور نہ بناؤں گا"۔ اس کے بعد صاحبزادگان کو بلا کر نم ناک آنکھوں سے فرمایا:

"میری جان! میں تم پر قربان جن کو میں نے خالی ہاتھ چھوڑا ہے لیکن اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ میں نے تم کو اچھی حالت میں چھوڑا ہے۔ میرے بچو! تم کسی ایسے عرب اور ذمی سے نہ ملو گے جس پر تمہارا حق نہ ہو۔ عزیز بچو! دو باتوں میں سے ایک بات تمہارے باپ کے اختیار میں تھی۔ ایک یہ کہ تم متمول اور دولت مند ہو جاؤ اور تمہارا باپ جہنم میں جائے۔ دوسرے یہ کہ تم محتاج رہو اور تمہارا باپ جنت میں داخل ہو۔ ان دونوں باتوں میں اس کو یہ زیادہ پسند تھا کہ تم محتاج رہو اور وہ جنت میں جائے۔ اچھا، اب جاؤ اللہ تعالیٰ تمہیں اپنے حفظ وامان میں رکھے"۔

(سیرت عمر بن عبدالعزیز ص ۲۸۰، البدایہ والنہایہ جلد ۹ ص)

اس کے بعد کچھ اور لوگوں کو وصیتیں کیں۔ بعض حضرات نے عرض کیا کہ کاش کہ آپ مدینہ طیبہ منتقل ہو جاتے اور روضہ نبوی میں جو چوتھی جگہ خالی ہے وہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور سیدنا ابوبکر صدیقؓ اور سیدنا عمر فاروقؓ کے پہلو میں دفن ہوتے۔ یہ سن کر فرمایا:

"بخدا! نار جہنم کے سوا اگر اللہ تعالیٰ مجھے ہر قسم کے عذاب دے تو میں اسے بخوشی قبول کر لوں گا لیکن یہ گوارا نہیں کہ اللہ تعالیٰ کو یہ معلوم ہو کہ میں اپنے آپ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پہلو میں دفن ہونے کے قابل سمجھتا ہوں۔ (طبقات ابن سعد جلد ۵ ص ۲۹۸، سیر اعلام النبلاء جلد ۵ ص ۱۴۱)

موت کے لیے بالکل تیار ہونے کے بعد ایک ذمی سے قبر کے لیے زمین خریدی۔ اس نے قیمت لینے سے انکار کر دیا اور یہ کہا کہ میرے لیے یہ بڑی سعادت اور خیر وبرکت کا باعث ہے کہ آپ میری زمین میں دفن ہوں، لیکن آپ نے اس کے اس عذر کو قبول نہ کیا اور نہایت اصرار کے ساتھ اسے زمین کی قیمت ادا کی۔ (طبقات ابن سعد جلد ۵ ص ۲۹۹، البدایہ والنہایہ جلد ۹ ص ۲۱۰، سیر اعلام النبلاء جلد ۵ ص ۱۴۵)

Marfat.com

پھر تجہیز و تکفین اور دفن کے بارہ میں کچھ ضروری وصیتیں کیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ناخن اور موئے مبارک جو ایک مسلمان کا نہایت قیمتی سرمایہ ہے، انہیں اپنے کفن میں رکھنے کی ہدایت اور وصیت فرمائی۔

(طبقات ابن سعد جلد ۵ ص ۳۰۰، سیر اعلام النبلاء جلد ۵ ص ۱۴۳)

جب روح کے قفس عنصری سے نکلنے کا وقت آیا تو اس وقت زبان پر یہ آیت تھی:

تلک الدار الآخرۃ نجعلها للذین لا یریدون علوا فی الارض ولا فساداً والعاقبۃ للمتقین،

"یہ آخرت کا گھر ہم ان لوگوں کے لیے بناتے ہیں جو زمین میں نہ تو برتری چاہتے ہیں اور نہ فساد، اور انجام کار متقین کے لیے ہے۔"

اسی آیت کی تلاوت کرتے کرتے روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔ آپ کی وفات جمعہ کے روز صحیح قول کی رو سے پوری چالیس سال کی عمر میں ۲۰ یا ۲۴ رجب سنہ ۱۰۱ھ میں واقع ہوئی۔ آپ کی نماز جنازہ آپ کے بعد آنے والے خلیفہ یزید بن عبدالملک نے پڑھائی۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ آپ کو زہر دیا گیا تھا۔ واللہ اعلم بالصواب (العقد الفرید جلد ۴ ص ۴۴۲) لیکن اکثر لوگوں کا خیال ہے اور ہمارے نزدیک یہی درست ہے کہ ان کی موت کا سبب کثرت خوف تھا اور کثرت خوف موت کے لیے زہر سے زیادہ قوی سبب ہے۔ (طبقات الشعرانی جلد ۱ ص ۳۳) علماء نے لکھا ہے کہ جب خوف خداوندی انسان کی عادت بن جائے تو یہ تصور روحانی انقلاب اور حقیقی بیماری کا سبب بن سکتا ہے اور اگر اس کے ساتھ حساب و کتاب اور اللہ تعالیٰ کے حضور میں کھڑے ہونے کا تصور بھی مل جائے تو یہ لا محالہ تیزی سے موت کو اپنی طرف کھینچ لاتا ہے اور آدمی جلد ہی قبر کی آغوش میں چلا جاتا ہے۔

آپ کی مدت خلافت دو سال اور چند ماہ ہے۔ اس مختصر زمانے کو لوگ بڑا طویل زمانہ شمار کرتے ہیں، کیونکہ اس زمانہ میں خلافت کی برکات ہر طرف پھیلی ہوئی تھیں اور عدل وانصاف کی ہمہ گیری پوری مخلوق کو اپنی لپیٹ میں لیے ہوئے تھی۔ سیدنا فاروق اعظمؓ کی اولاد میں سے ایک شخص کا بیان ہے کہ ایک شخص ہمارے پاس بہت سا مال لے کر آتا اور کہتا کہ مال مستحق فقراء میں تقسیم کر دیں۔ مگر اس مال کو لینے والا کوئی نہ ہوتا۔ (یعنی کوئی مستحق صدقہ وخیرات نہ تھا) گویا کہ عمرؒ نے لوگوں کو مالدار بنا دیا تھا۔ صرف صدقہ فطر ہی مسلمانوں

Marfat.com

کے تمام فقراء اور مساکین کو کافی ہوتا تھا۔ (سیرۃ ابن عبدالحکم ص ۶۹ ، ص ۱۲۸، سیرۃ ابن الجوزی ص ۸۵، ص ۸۷، العقد الفرید جلد ۴ ص ۴۳۶)

یحییٰ بن سعید فرماتے ہیں کہ مجھے عمر بن عبدالعزیزؒ نے صدقہ وصول کرنے کے لیے افریقہ بھیجا۔ میں نے صدقہ وصول کر کے وہاں فقراء اور مساکین تلاش کیے لیکن مجھے وہاں کوئی فقیر اور مسکین نہ ملا کہ اسے صدقہ دوں کیونکہ عمرؒ نے لوگوں کو مالدار بنا دیا تھا۔ آخر کار میں نے اس مال سے غلام خرید کر انہیں آزاد کر دیا اور ان کی ولاء مسلمانوں کو ملی۔

روایات میں ہے کہ جب آپ کی بیماری زور پکڑ گئی اور بچنے کی کوئی امید نہ رہی تو گرجا کا پادری آپ کے پاس ہدیہ کے طور پر گرجا کے درختوں کے نئے پھل لایا۔ عمرؒ نے یہ پھل نہایت خوشی اور مسرت سے قبول کر لیے اور حکم فرمایا کہ پادری کو اس کی قیمت ادا کر دی جائے، لیکن پادری نے ان پھلوں کی قیمت لینے سے انکار کر دیا۔ آپ نے اس کو سمجھا بجھا کر قیمت لینے پر راضی کر لیا، چنانچہ اس نے قیمت لے لی۔ پھر سیدنا عمرؒ نے اس پادری سے کہا معلوم ہوتا ہے کہ میں اس بیماری سے صحت یاب ہونے والا نہیں۔ آپ کے منہ سے یہ الفاظ سُن کر پادری کو سخت صدمہ ہوا اور اس کے دل میں رقت پیدا ہو گئی اور وہ رونے لگا۔ پھر سیدنا عمرؒ نے اس سے فرمایا: مجھے پتہ چلا ہے کہ اس گرجا کے ساتھ جو ملحقہ زمین ہے وہ تمہاری ملکیت ہے۔ اس زمین میں سے تم مجھے ایک سال کے لیے میری قبر کے لیے جگہ دے دو۔ جب ایک سال گذر جائے تو تمہیں اس زمین پر ہل چلانے کا اختیار ہے۔ مختصر یہ کہ اس پادری سے ایک قبر کی جگہ کا سودا ہو گیا اور اس کی قیمت ادا کر دی گئی۔ قبر کی قیمت میں اختلاف ہے کتابوں میں دو دینار سے لے کر پچاس دینار تک آیا ہے۔

(مسالک الابصار جلد ۱ ص ۳۵۳، معجم البلدان جلد ۴ ص ۱۴۸، العقد الفرید جلد ۴ ص ۴۲۷)

عمرؒ گرجے میں اس جگہ دفن ہوئے جو انہوں نے خریدی تھی۔ آپ کی قبر پر مسلمہ بن عبدالملک نے کھڑے ہو کر فرمایا: "بخدا! آپ کی طبیعت میں ہمیشہ نرمی اور ہمدردی ہی رہی حتی کہ آپ نے یہ قبر دیکھ لی۔ آپ کے دفن پر ایک سال گذر گیا اور امیرالمومنین کے قول کے مطابق پادری کو یہ حق حاصل ہو گیا کہ وہ آپ کی قبر کو برابر کر کے اس زمین پر کاشت شروع کر دے لیکن اس نے آپ کی قبر کو زمین کے ساتھ برابر نہ کیا بلکہ اس کی حفاظت کی اور اس کے راستے کو شاندار بنا دیا تا کہ لوگ آپ کی قبر کی زیارت کے

Marfat.com

لیے آتے رہیں اور آپ کے لیے دعائے مغفرت کرتے رہیں اور آپ کی خاک قبر کو اپنے آنسوؤں سے بھگوتے رہیں۔ چنانچہ لوگ اکثر ان کی قبر کی زیارت کے لے جاتے بلکہ لوگ ان کی قبر کی زیارت پر فریفتہ تھے۔ ہشام بن الغاز بیان کرتے ہیں کہ ہم دابق سے واپس آتے ہوئے ایک منزل پر ٹھیرے۔ جب ہم وہاں سے روانہ ہوئے تو مکحول ہمیں بتائے بغیر ہم سے غائب ہو گئے۔ جب ہم بہت دور نکل گئے تو ہم نے انہیں آتے دیکھا۔ ہم نے پوچھا: کہاں گئے تھے۔ جواب دیا عمر بن عبدالعزیزؒ کی قبر پر گیا تھا۔ وہ یہاں سے پانچ میل دور ہے اور آپ کے لیے دعا کر کے آیا ہوں۔ پھر فرمایا: اگر میں قسم کھاؤں تو اپنی قسم میں حانث نہیں ہوں گا کہ آپ اپنے معاصرین میں سب سے زیادہ اللہ سے ڈرنے والے تھے اور اس زمانہ میں ان سے زیادہ اور کوئی پارسا نہ تھا۔

(سیرۃ ابن الجوزی ص ۲۹، فتوح واخبار مصر ص ۲۵۳)

یہ قبر ایک طویل مدت تک باقی رہی اور لوگ اس پر آ کر دعائیں مانگتے رہتے تھے۔ اور دوسری تمام قبروں سے زیادہ اس کا احترام کیا جاتا حتی کہ عباسیہ کے دور میں بھی ان کی قبر باقی رہی جب کہ انہوں نے تمام بنوامیہ کی قبریں اکھاڑ کر ان کی لاشیں نکالیں اور پھر ان کو کوڑے مارے اور نذر آتش کر دیا۔ چنانچہ تمام مشہور قبروں کے آثار فنا ہو گئے لیکن عمر بن عبدالعزیزؒ کی قبر ان حالات میں بھی سر افتخار بلند کر کے کھڑی رہی اور سال ہا سال تک باقی رہی۔ پھر مشرق پر جو تباہی آئی تو یہ گرجا بھی مٹ گیا اور قبر کے نشانات بھی نذر فنا ہو گئے اور اس پہ لوگوں کا آنا جانا بند ہوا وگرنہ اس سے پہلے ہر مقیم ومسافر ان کی قبر کی زیارت کے لیے آتا تھا۔ (تفصیل کے لیے ملا خطہ ہو طبقات ابن سعد جلد ۵ ص ۲۷۱، البدایہ والنہایہ جلد ۹ ص ۲۱۰، سیر اعلام النبلاء جلد ۵ ص ۱۴۲، تہذیب الکمال جلد ۲۱ ص ۴۴۱، تاریخ العرب المطول ص ۲۸۹، ص ۳۵۷، تاریخ مدینہ ودمشق جلد ۲ ص ۱۵ لابن عساکر وغیرہ)

امام حسن بصریؒ کو جب ان کی وفات کی خبر پہنچی تو فرمایا!

مات خیر الناس (تہذیب الکمال جلد ۲۱ ص ۴۳۳)

"یعنی موجودہ زمانے کا بہترین انسان فوت ہو گیا۔"

سیدنا ابوبکر صدیقؓ کی طرح ۲۹ ماہ حکومت کی (ایضاً)

ازواج واولاد

سیدنا عمر بن عبدالعزیزؒ نے چار شادیاں کیں جن کے نام حسب ذیل ہیں۔

۱۔ فاطمہ بنت عبدالملک بن مروان ، ان سے تین لڑکے اسحاق ، یعقوب اور موسیٰ پیدا ہوئے۔

۲۔ لمیس بنت علی ، ان سے دولڑکے عبداللہ ، بکر اور ایک لڑکی ام عمار پیدا ہوئیں۔

۳۔ ام ولید سے نو اولادیں ہوئیں ، عبدالملک ، ولید ، عاصم ، یزید ، عبداللہ ، عبدالعزیز ، زبانا امتہ اور ام عبداللہ پیدا ہوئے۔

۴۔ ام عثمان بنت شعیب ، ان سے ایک لڑکا ابراہم پیدا ہوا۔

ان اولادوں میں سے آپ کا صاحبزادہ عبدالملک تو پہلے ہی وفات پا گیا اور عبداللہ اور عبدالعزیز عراق اور حرمین کے گورنر رہے۔ یہ سب آپس میں علاتی بھائی تھے۔

حافظ ابن کثیرؒ نے لکھا ہے کہ عبدالملک آپ کا سب سے اجل بیٹا تھا جو آپ کے عہد خلافت ہی میں انتقال کر گیا اور یہ اپنے باپ سے بھی زیادہ نیک اور زاہدو پارسا تھا۔ جب وہ انتقال کر گیا تو آپ نے اس کی وفات پر کوئی حزن وغم نہیں کیا بلکہ فرمایا: ”جب اللہ تعالیٰ کو یہی منظور تھا تو میں اس بات کو کیوں ناپسند کروں“۔ (البدایہ والنہایہ جلد ۹ ص ۲۰۸)

عمر بن عبدالعزیزؒ کے بارہ بیٹے تھے ، لیکن ان میں عبدالملک سب سے زیادہ پاکباز اور نیک تھا۔ سیدنا عمرؒ بھی اس کی بڑی قدر کرتے تھے۔ عبدالملک اپنے والد کے دوش بدوش سرگرم عمل رہتے تھے حتیٰ کہ منصوبہ معاملات میں ان کی رائے کو بڑی ترجیح دی جاتی تھی۔ میمون بن مہران بیان کرتے ہیں کہ عمر بن عبدالعزیزؒ نے مجھے ، مکحول اور قلابہ کو بلا بھیجا اور کہا: ”تم لوگ ان مالوں کے بارہ میں جو لوگوں سے ظلماً چھینے گئے ہیں ، کیا کہتے ہو؟“ مکحول نے جو رائے پیش کی اسے عمرؒ نے پسند نہ کیا۔ ”انہوں نے کہا کہ میری رائے یہ ہے کہ آئندہ احتیاط برتی جائے اور سابقہ مالوں کو بحال رکھیں“۔ میں نے عرض کی : ”امیر المومنین ! آپ اپنے صاحبزادے عبدالملک کو بلا لیں کیونکہ وہ بھی نہایت اہل ہیں اور ہم سے کم نہیں ہیں۔ عبدالملک حدیث وفقہ پڑھ چکے ہیں اور اب ان کا شمار فقہائے مدینہ کے صف اول کے لوگوں میں ہوتا ہے۔ جب آپ آ گئے تو آپ نے اس سے بھی یہی سوال

Marfat.com

کیا۔ عبدالملک نے جواب دیا کہ میرے خیال میں تو آپ انہیں حق داروں کو واپس کر دیں۔ اگر آپ ایسا نہ کریں گے تو غاصبوں کے اس غصب میں آپ بھی شریک سمجھے جائیں گے۔

عبدالملک نے بچپن ہی میں اپنے والد سے زیادہ اپنے نفس پر قابو پا لیا تھا حالانکہ عمرؒ خلیفہ تھے اور کہولت کی منزلیں طے کر رہے تھے۔ بعض حضرات کا بیان ہے کہ ایک روز عمرؒ کو سخت غصہ آیا۔ پھر جب آپ کا غصہ بجھ گیا تو آپ سے عبدالملک نے کہا: ''امیرالمومنین! کیا اللہ کی رحمتوں کی اور اس کی کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو بلند مقام عطا فرمایا ہے اور آپ کو اپنے بندوں کا امیر بنایا ہے، یہی قدر و منزلت ہے کہ آپ کو اتنا شدید غصہ آئے جو اس وقت میرے مشاہدے میں آیا ہے۔ سیدنا عمرؒ نے فرمایا: بیٹا! تم نے کیا کہا؟ ذرا پھر دہراؤ۔ عبدالملک نے اپنی بات دہرائی۔ عمرؒ نے کہا: ''عبدالملک! کیا تم کو غصہ نہیں آتا؟'' جواب دیا کہ میرا پیٹ میرے کس کام آئے گا اگر میں اس میں غصہ نہ لوٹاؤں، حتیٰ کہ ذرا سا غصہ بھی ظاہر نہ ہونے دوں''؟

حقیقت یہ ہے کہ عمرؒ کی پاکیزہ فطرت کی وجہ سے عدل وانصاف کی محبت نے ان کے دل میں جڑیں پھیلا دی تھیں اور یہ بات آپ کو اپنے نانا سیدنا فاروق اعظمؓ سے ورثہ میں ملی تھی۔ اس بارہ میں کچھ اور بھی محرکات تھے۔ ان سب نے آپ کو گھیر لیا تھا اور آپ کو اس راہ پر مجبور کر دیا تھا کہ آپ عدل وانصاف کے لیے وہ کارنامے انجام دیں جو آپ سے پہلے انجام نہیں دیے گئے تھے۔ ان محرکات میں جو آپ کے ماحول میں پیدا ہو کر پروان چڑھ رہے تھے، سب سے قوی محرک آپ کا فرزند اور صاحبزادہ عبدالملک تھا۔ عبدالملک اس وقت پیدا ہوا جب فتنوں کی آندھی تیز چل رہی تھی۔ اس لیے اسے قدرتی طور پر آندھیوں میں جم کر کھڑا ہونا پڑا۔ عبدالملک تاریخ اسلامی کا ایک عجوبہ ہے۔ اس کی عمر ابھی بیس سال بھی نہ ہوئی تھی کہ اسے فتنوں کی تیز اور تند آندھیوں سے دو چار ہونا پڑا، لیکن چونکہ بچپن ہی سے آپ کے ایمان میں پختگی اور استحکام تھا جیسے کہ ایک نبی کے حواری میں ہوتا ہے۔ یہ پارسا اور نیک دل نوجوان اپنے والد کی مجلس میں رات کو اور دوپہر کو ان کے سونے کے کمرے میں اٹھتا بیٹھتا تھا اور ہر وقت عدل وانصاف اور دوسرے دینی کاموں کے لیے جھنجوڑتا رہتا تھا۔ لوگوں کے مظالم رفع کرنے اور ان کے حقوق دلانے میں ہر وقت

Marfat.com

اپنے باپ کو ابھارتا رہتا اور ان کو موت کی یاد اور جہنم کی یاد دلاتا رہتا۔ اور سیدنا عمرؒ جب کبھی نرم پڑ جاتے تو عبدالملک گرم ہو جاتے اور اگر کبھی سیدنا عمرؒ ان کاموں میں سرگرم ہو جاتے تو عبدالملک اس سرگرمی میں باپ کا پورا پورا ساتھ دیتے۔ مختصر یہ کہ آپ کا یہ بیٹا آپ کو ہر وقت برائیوں سے روکتا رہتا اور نیکی کے کاموں کی ترغیب دیتا رہتا۔ (سیرۃ ابن جوزی ص ۲۵۸) بعض شامی جنہوں نے عمر بن عبدالعزیزؒ کی دونوں حالتوں کو دیکھا تھا یعنی قبل از خلافت حالت کو بھی اور بعد از خلافت حالت کو بھی، کہتے ہیں کہ ہمارے خیال میں عمرؒ کو عبادت اور نیکی کے ان کاموں میں ان حالات ہی نے داخل کیا جو حالات انہوں نے اپنے صاحبزادے عبدالملک سے دیکھے تھے۔

(صفۃ الصفوۃ جلد۲ ص ۷۲، النجوم الزاہرہ جلد۱ ص ۲۴۳)

ایک روز عبدالملک نے اپنے والد کو کچھ پریشان حالت میں دیکھ کر کہا: آپ کو عدل و انصاف کے نافذ کرنے سے کیا شے مانع ہے؟ بخدا! اگر مجھے اور آپ کو ابلتی ہوئی دیگوں میں ڈال دیا جائے تو مجھے اس کی بھی پروا نہیں۔ ہم حق کی خاطر ہر قربانی دینے کے لیے تیار رہیں۔ بیٹے کی یہ بات سن کر عمر بن عبدالعزیزؒ نے فرمایا: جان پدر! میں سرکش اونٹ کی طرح دنیا کو قابو میں کر رہا ہوں۔ میں عدل و انصاف اور رواداری کے تمام طریقے زندہ کرنا چاہتا ہوں، لیکن یہ کام آہستہ آہستہ کر رہا ہوں تاکہ میں بھی دنیا کے طمع اور حرص سے نکل جاؤں اور مجھے دیکھ کر لوگوں کو دنیا سے نفرت ہو جائے اور انہیں اطمینان نصیب ہو۔

بعض روایات میں ہے کہ جب عمرؒ سلیمان کو دفن کر کے فارغ ہوئے اور تمام منصوبہ جائیدادیں بیت المال میں جمع کر دیں اور تمام خانگی سامان وغیرہ فروخت کر چکے، لونڈیوں کو آزاد کر چکے اور تمام رات نہ سو سکے۔ پھر صبح کو ظہر تک یہی کام انجام دیتے رہے اور ظہر کی نماز پڑھ کر آرام کرنا چاہا تو آپ کے صاحبزادے عبدالملک آپ کے پاس آئے اور پوچھا: "امیر المومنین! اب آپ کیا کرنا چاہتے ہیں؟" آپ نے جواب دیا "جان پدر! اب میں ذرا سا سو کر آرام کرنا چاہتا ہوں۔" پوچھا "اباجان! کیا آپ منصوبہ جائیدادوں اور زمینوں کو واپس دلائے بغیر سونا چاہتے ہیں؟" فرمایا "میرے پیارے بچے! کل رات میں تمہارے چچا جان کی تجہیز و تدفین کے سلسلہ میں تمام رات جاگتا رہا، اب میں تھوڑی دیر سونے کے بعد باقی کام انجام دوں گا کیونکہ اب مجھ پر نیند کا غلبہ ہے۔ عبدالملک نے کہا

"امیر المومنین! کیا آپ کو یقین ہے کہ آپ سو کر اٹھیں گے؟ مستقبل میں ایک سیکنڈ کے لیے بھی زندگی کا بھروسہ نہیں"۔ عمرؒ نے کہا "جان پدر! ذرا میرے قریب آؤ" عبدالملک باپ کے قریب گئے تو باپ نے انہیں گلے لگا لیا، پیشانی اور سر منہ کو چوما اور حق تعالیٰ شانہ کا شکر ادا کیا کہ اس نے اتنا نیک اور صالح بیٹا جوان کی دین پر اعانت کرتا ہے، عطا فرمایا۔ بیٹے کی یہ بات سن کر ہی آپ باہر گئے اور بالکل آرام نہیں فرمایا اور منادی کرا دی کہ جس کسی پر کسی قسم کا کوئی ظلم ہوا ہو وہ امیر المومنین کے سامنے آ کر بیان کرے۔

اسی عبدالملک کا ایک اور واقعہ کتابوں میں منقول ہے کہ ایک روز عبدالملک اپنے والد کے پاس آئے۔ دیکھا کہ عمرؒ اپنے چچا زاد بھائی مسلمہ کے ساتھ باتیں کر رہے ہیں۔ آپ نے اپنے والد عمرؒ کو تنہائی میں بلایا تا کہ کچھ کہا جا سکے۔ عمرؒ نے پوچھا کیا کوئی راز کی بات ہے جو تو نے مجھے تنہائی میں بلایا۔ عبدالملک نے کہا "ہاں، مسلمہ کھڑے ہو گئے اور آپ اپنے والد کے ساتھ تنہائی میں بیٹھ گئے اور کہا "امیر المومنین! کل قیامت کے روز آپ اپنے رب کو کیا جواب دیں گے جب وہ آپ سے پوچھے گا عمر! تو نے بدعت دیکھی تھی لیکن اسے مٹانے کی کوشش نہیں کی تھی یا تو نے مردہ سنت کو زندہ کرنے کی کوئی جدوجہد نہ کی تھی"؟ "جان پدر! کیا اس نصیحت پر تم کو کسی شے نے آمادہ کیا ہے یا تم یہ بات اپنے دل سے کہہ رہے ہو؟" عبدالملک نے کہا "نہیں نہیں بخدا! یہ بات میں اپنے دل سے کہہ رہا ہوں کیونکہ مجھے معلوم ہے کہ آپ کو روز قیامت اس کے بارہ میں پوچھا جائے گا، لیکن آپ کے پاس اس کا کیا جواب ہے؟ سیدنا عمرؒ نے فرمایا "لخت جگر! اللہ تعالیٰ تمہیں بہترین جزائے خیر عطا فرمائے اور تم پر اپنی رحمتیں نچھاور کرے، تم نیکی اور صلاح کے لیے میرے بہترین معاون ثابت ہو گے۔ بیٹا! یاد رکھو، تمہاری قوم نے خلافت میں بے شمار گانٹھیں لگا دی ہیں اور بڑی مشکلات پیدا کر دی ہیں اور ظلم کی بنیادیں مضبوط اور مستحکم بنا دی ہیں اور جب میں ان کے منصوبہ اموال اور مقبوضات واپس لینے کے لیے جھگڑتا ہوں تو مجھے ایسی پھوٹ اور تفرقہ جانے کا ڈر رہتا ہے جس سے خون خرابہ کی نوبت آ جائے، بخدا! میرے نزدیک دنیا کا فنا جانا آسان ہے لیکن میں یہ نہیں چاہتا کہ میری وجہ سے کسی کا ایک قطرہ خون بھی نکلے۔ کیا اس پر راضی نہیں کہ کبھی تیرے باپ کو وہ مبارک دن نصیب ہو گا جس روز وہ بدعت کو بن سے اکھاڑ پھینکے گا اور تمام دنیا کو سنت کے انوار سے جگمگا دے گا یہاں تک کہ حق تعا

Marfat.com

شانہ فیصلہ فرمائیں اور اللہ تعالیٰ بہترین فیصلہ کرنے والا ہے۔ (صفۃ الصفوۃ جلد۲ ص۷۲)

سیدنا عمرؒ کا یہ سعادت مند اور نیک و پارسا بچہ جب اپنے اردگرد غیر شرعی ماحول دیکھتا اور صاحب اقتدار لوگوں کے مظالم کو مشاہدہ کرتا تو اندر ہی اندر کڑھتا۔ اس کی یہ کڑھن اس کو دبلا کرتی رہی حتی کہ وہ انتہائی لاغر اور کمزور ہو کر مرض الموت میں مبتلا ہو گیا۔ اس وقت اس کی عمر صرف ۱۹ سال تھی جب کہ عام بچے اس عمر میں لہو و لعب کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ وہ اپنی اس بیماری میں بھی خوش تھا۔ عمر بن عبدالعزیزؒ کو اپنے اس بچے سے بے حد محبت تھی۔ وہ ان کی عیادت کے لیے جاتے اور پوچھتے: بیٹا! تمہارا کیا حال ہے؟ عبدالملک اس خیال سے کہ میرے باپ کو صدمہ نہ ہو اپنا حال چھپاتے اور کہتے الحمدللہ! میں اچھا ہوں۔ لیکن عمرؒ مرض کو بھی دیکھ رہے تھے کہ جان لیوا ہے اور مریض کو بھی دیکھ رہے تھے کہ موت کے کنارے پر پہنچا ہوا ہے اور آپ کو یہ بھی پتہ تھا کہ بیٹا اپنی موت سے خوش ہے، اس لیے ایک روز انہوں نے کہا: بیٹا! مجھ سے اپنی طبیعت کے بارہ میں صحیح صحیح بات کرو کیونکہ تمہارے بارہ میں مجھے تمہاری موت ہی زیادہ پیاری ہے۔ اب عبدالملک نے کہا: "ابا! میں اپنے کو موت کی آغوش میں پاتا ہوں، لہذا آپ آخرت کے اجر کی وجہ سے صبر سے کام لیں کیونکہ آپ کے لیے اللہ کا اجر مجھ سے بہتر ہے۔ بیٹے کے منہ سے یہ الفاظ سُن کر باپ کا دل بیٹھ گیا۔ پھر عمرؒ یہ کہتے ہوئے وہاں سے چلے گئے کہ بیٹا: بخدا! میری میزان میں تمہارا ہونا مجھے اس سے زیادہ محبوب ہے کہ تمہاری میزان میں میں ہوں، اور نماز پڑھنے میں مشغول ہو گئے۔ ابھی وہ نماز پڑھ رہے تھے کہ آپ کے غلام مزاحم نے عبدالملک کی موت کی خبر دی۔ خبر سُن کر عمرؒ بے ہوش ہو کر گر پڑے۔

عبدالملک کے فوت ہونے کے بعد عمرؒ جب اس کی تجہیز و تکفین اور دفن سے فارغ ہوئے اور قبر کو ہموار کر چکے تو آپ اس کی قبر پر قبلہ رو کھڑے ہوئے اور آپ کے چاروں طرف لوگ کھڑے تھے، اس وقت آپ نے فرمایا: "بیٹا! تم پر اللہ تعالیٰ اپنی رحمتیں نچھاور کرے تمہاری پیدائش موجب مسرت تھی اور تمہاری اٹھان نیکیوں سے بھر پور تھی، مجھے یہ بھی گوارا نہ تھا کہ میں تجھے آواز دوں اور تو میری آواز پر لبیک کہے یعنی مجھے تمہاری تھوڑی سی تکلیف بھی گوارا نہ تھی۔ آج مجھے تم کو اس جگہ رکھ کر جس جگہ تم کو اللہ تعالیٰ نے لوٹا دیا ہے، بے انتہا مسرت ہے اور تمہارے اجر و ثواب سے جو مجھے صلہ ملنے والا ہے۔ اس کی

Marfat.com

مجھے بہت توقع ہے۔ اللہ تعالیٰ تمہارے گناہوں کو درگذر فرمائے اور تمہاری نیکیوں کا تمہیں بہترین بدلہ عطا فرمائے اور اللہ تعالیٰ تمہارے لیے دعا کرنے والے پر اپنا رحم فرمائے خواہ وہ دعا کرنے والا آزاد ہو یا غلام، مرد ہو یا عورت، حاضر ہو یا غائب یعنی جو بھی خلوص سے تمہارے لیے دعا کرے۔ ہم اللہ تعالیٰ کے ہر فیصلے پر راضی ہیں اور اس کے حکم کے آگے سرنگوں ہیں۔" پھر جب عمرؒ اس کی قبر سے واپس آئے تو لوگوں کو اس کی وفات کا بڑا صدمہ تھا، لوگ ہمیشہ تک اس پر افسوس کرتے رہیں گے اور اس کے لیے دعائے مغفرت کرتے رہیں گے۔ پھر جب آپ اپنے گھر آئے تو لوگ تعزیت کرنے کے لیے آئے۔ آپ نے ان کے سامنے صبر کی تلقین کی اور فرمایا! جو چیز عبدالملک پر اتری اسے ہم بخوبی جانتے تھے اور جب وہ واقع ہوگئی تو ہمارے لیے تو یہ شے اجنبی اور انوکھی نہ تھی۔ (البیان والتبین جلد۲ ص ۱۸۱، العقد الفرید جلد۴ ص ۴۳۸، سیرۃ ابن عبدالحکم ص ۱۱۶، صفۃ الصفوۃ جلد۲ ص ۷۳)

عبدالملک کی وفات نے عمر بن عبدالعزیزؒ کو مظالم کے خلاف مشتعل کر دیا۔ آپ کے غصہ کی بھٹی بھڑک اٹھی۔ اب انہوں نے مصمم ارادہ کر لیا کہ بنی امیہ کے غصب شدہ اموال اور مقبوضات وہ واپس دلا کر رہیں گے۔ مظالم کے خلاف سب سے پہلے غصہ کی آگ سلگانے والے آپ کے غلام مزاحم تھے اور اس آگ کو بھڑکانے والے آپ کے صاحبزادے عبدالملک تھے۔ آپ نے اپنی اصلاحات جاری کرنے کا عزم کر لیا یہاں تک کہ پہرے داروں کو حکم دے دیا کہ اگر میں حق سے ادھر اُدھر ہٹوں تو فوراً مجھے روک دیا جائے اور اگر میں غلط کروں تو میری راہ نمائی کرو۔ آپ نے اپنے حفاظتی دستہ کے افسر عمر بن مہاجر کو یہ کہہ رکھا تھا کہ جب تم مجھے حق سے ہٹا ہوا دیکھو تو میرے سینے پر ہاتھ رکھ کر مجھے ہلا کر کہو!" عمر کیا کر رہے ہو؟" (صفۃ الصفوۃ جلد۲ ص ۹۲) چنانچہ عمر بن مہاجر جہاں بھی عمر بن عبدالعزیزؒ کو حق سے ہٹا ہوا پاتے بغیر کسی رورعایت کے وہ آپ کا گریبان پکڑ کر جھنجوڑتے اور اس وقت تک نہ چھوڑتے جب تک وہ حق پر نہ آجاتے۔

Marfat.com

صورت وسیرت

عمر بن عبدالعزیزؒ نہایت شکیل اور باوجاہت تھے۔ رنگ گورا چٹا، چہرہ نازک اور کتابی، چہرے کے نقش باریک، جسم بھرا ہوا اور گداز وشاداب تھا اور آپ کو دیکھنے والا ٹھٹک کر رہ جاتا اور اس کا دل نہیں چاہتا تھا کہ آپ کے حسین چہرے سے نگاہ ہٹائے۔ (سیرۃ ابن عبدالحکم، شذرات الذہب جلد ا ص ۱۱۹، سیرۃ ابن الجوزی ص ۱۹۶) جب آپ خوشبودار تیل لگا کر کسی راستہ سے گذرتے تو راستہ میں خوشبو کی لپٹیں بکھر جاتیں اور پتہ چل جاتا کہ اس راستہ سے عمرؒ گذرے ہیں۔ خوشبو میں اکثر عنبر کا استعمال کرتے اور وہ آپ کے ہاتھوں کو لگ جایا کرتا تھا۔ (سیرۃ ابن الحکم) لوگ دھوبی کے دروازے پر آپ کے کپڑوں کا انتظار کیا کرتے تھے۔ پھر جب دھوبی کے پاس آپ اپنے کپڑے بھیجتے تھے تو لوگ دھوبی کے پاس جاتے اور انہیں اس بات پر زیادہ پیسے دیتے کہ وہ آپ کے کپڑوں کے بعد ان کے کپڑے دھوئے تاکہ اس عنبر ومشک سے ان کے کپڑے بھی معطر ہو جائیں جو ان کے کپڑوں سے اس پانی میں آجاتی۔ (کتاب الاغانی جلد ۸ ص ۱۵۰) آپ کی چال بڑی ناز و ادا والی تھی۔ ان کی رفتار مدینہ کی دوشیزاؤں اور جوان لڑکیوں کو بہت پسند تھی۔ وہ اپنی چال کو ان کی چال میں ڈھالا کرتی تھیں۔ (سیرۃ ابن عبدالحکم ص ۲۱)

عمرؒ پٹے رکھا کرتے تھے اور تیل اور کنگھی سے سنوارتے تھے۔ انگلی میں ایک انگوٹھی ہوتی تھی جس کا نگینہ نہایت قیمتی ہوتا تھا۔ قیمتی چادریں اور بیش قیمت تہ بند استعمال کرتے حتیٰ کہ ایک تہ بند سو سو دینار کا ہوتا تھا۔ آپ کے نزدیک لباس طویل عرصہ گذرنے

Marfat.com

پر پرانا نہیں ہوتا تھا بلکہ پہننے کے بعد جب لوگ اس کو ایک مرتبہ دیکھ لیتے تو پرانا سمجھا جاتا تھا۔ (سیرۃ ابن جوزی ص ۱۴۶)

عمرؒ سے بنوامیہ کا کبر و غرور اور عیش و عشرت نمایاں طور پر ٹپکتی تھی۔ آپ اپنے غلاموں اور نوکروں کے جھرمٹ میں نکلا کرتے تھے۔ اگر آپ کے قیمتی تہ بند کا کوئی حصہ جوتے میں اٹک جاتا تو اسے کھینچ کر پھاڑ دیتے تھے اور اسے جوتے سے جھک کر نکالنا اپنی کسر شان سمجھتے تھے اور اگر قیمتی چادر کا کوئی پلو کندھے سے سرک جاتا تھا تو اسے چھوڑ دیتے تھے اور اگر کوئی خادم اسے اٹھا کر آپ کے پاس لے جاتا تو اسے ڈانٹ دیا کرتے تھے اور جوتا پھینک دیتے تھے۔ مختصر یہ کہ لباس کے معاملہ میں نہایت غلو سے کام لیتے تھے۔ (سیرۃ ابن جوزی ص ۱۵۰، سیرۃ ابن اعبدالحکم ص ۲۱) ان سب چیزوں کے باوجود آپ فطرتاً صالح اور سعید تھے۔ اس وجہ سے قبل از خلافت بھی آپ کا دامن اخلاق بالکل شفاف تھا۔ کبھی کسی پر کوئی زیادتی نہیں کی اور نہ کسی اخلاقی بیماری میں مبتلا ہوئے۔ (سیر اعلام النبلاء جلد ۵ ص ۱۱۵) ابتداء ہی سے نہایت رقیق القلب اور گوشہ گیر لیکن مرد میدان تھے۔ مسند خلافت پر بیٹھنے سے قبل خود فرماتے ہیں کہ مجھے عیش پرستی، لباس، میں غلو اور عطریات کو جو شوق تھا دوسرے خاندانوں میں کسی اور کو یہ نصیب نہیں ہوا۔ (سیرۃ ابن جوزی ص ۶۶) جو چادریں وہ اوڑھتے تھے وہ آٹھ آٹھ سو درہم سے کم قیمت نہ ہوتی تھیں۔

غرور و فخر کا انداز روز بروز بڑھتا رہا حتی کہ بہت سے لوگوں نے آپ پر مغرور ہونے کا الزام تک لگا دیا اور ایک مرتبہ اس غلو پر آپ کو سزا بھی ملی۔ ولید بن عبدالملک کے عہد خلافت میں ان کو چار سو درہم کی قیمت کا کپڑا سخت کھردرا اور کرخت معلوم ہوتا تھا۔ لیکن پھر چشم فلک نے وہ وقت بھی دیکھا کہ چودہ درہم کا کپڑا بھی نہایت نرم اور ملیح معلوم ہونے لگا تھا۔ (تہذیب الاسماء جلد ۱ ص ۲۰)

خلیفہ منصور نے عبدالرحمٰن بن قاسم بن محمد بن ابی بکرؓ سے ایک مرتبہ کہا کہ مجھے کچھ نصیحت فرمایئے۔ وہ بولے: اپنے مشاہدات میں یا سنی سنائی باتوں میں سے۔ کہا: اپنے مشاہدات میں سے۔ بولے: عمر بن عبدالعزیزؒ نے گیارہ بیٹے چھوڑ کر انتقال فرمایا اور سترہ دینار چھوڑے۔ پانچ دینار تو تجہیز و تکفین پر خرچ ہو گئے اور دو دینار کی قبر خریدی گئی۔ باقی صرف دس دینار بچے اور ہر بچہ کو ایک پورا دینار بھی ورثہ میں نہ ملا اور ہشام بن عبدالملک

Marfat.com

فوت ہوئے تو ان کا ترکہ ان کی اولاد میں تقسیم ہوا تو ہر ایک کو دس دس لاکھ ملے۔ میں نے عمرؒ کی اولاد میں ایک شخص کو دیکھا کہ اس نے اللہ کی راہ میں ایک دن میں سو گھوڑے دیے اور اولاد ہشام میں ایک شخص کو دیکھا کہ لوگ اسے صدقہ دیا کرتے تھے۔

(سیرۃ ابن جوزی ص ۲۹۶)

بعض روایات میں ہے کہ نمک کی طرح عنبر ڈاڑھی پر چھڑکتے تھے۔ (سیرت عمر بن عبدالعزیز ص ۱۵۱) اس سے ان کی خوشبو کے استعمال کا اندازہ فرمالیں۔ رجاء بن حیوۃ کا بیان ہے کہ آپ سب لوگوں سے زیادہ خوش لباس، خوش مزاج اور خوش کلام تھے۔ سب سے زیادہ معطر اور سب سے زیادہ تبختر کی چال چلنے والے تھے۔

(سیرت عمر بن عبدالعزیز ص ۱۵۱)

لیکن جونہی مسند خلافت پر قدم رکھا، دل کی دنیا تبدیل ہوگئی، دفعتاً زندگی میں ایک انقلاب آ گیا۔ دنیا سے یک قلم دامن جھاڑ لیا۔ ساری املاک بیت المال کو واپس کر دیں۔ لونڈی غلام، فرش فروش، لباس وعطریات اور عیش وعشرت اور جمال وتجمل کے تمام سامانوں کو فروخت کر کے ان کی قیمت بیت المال میں داخل کر دی۔ (تہذیب الاسماء جلد ۱ ص ۲۱) بعض روایات میں ہے کہ بیت المال سے کوئی مشاہرہ نہ لیتے تھے اور بعض روایات میں ہے کہ چار سو دینار سالانہ ان کا وظیفہ تھا جن پر ان کی اور ان کے اہل وعیال کی گذران تھی۔ لباس بقدر ستر پوشی اور غذا بقدر لایموت سے زیادہ نہ تھی۔ گویا عیش ونعم کی گود میں پرورش پانے والا عمر بن عبدالعزیز اب ابوذر غفاریؓ اور حسن بصریؒ کا قالب اختیار کر چکا تھا۔

کچھ ایسے بھی اس بزم سے اٹھ جائیں گے جن کو
تم ڈھونڈنے نکلو گے مگر پا نہ سکو گے

آپ کی اس نیکی اور صالحیت کا یہ نتیجہ تھا کہ پورے ملک میں امن وامان اور خوش حالی تھی۔ موسیٰ ابن ایمن الراعی کہتے ہیں۔ کہ وہ محمد بن عینیہ کی بکریاں چرایا کرتے تھے اور حالت یہ تھی کہ شیر اور بکری اور دوسرے تمام جنگلی جانور ایک ہی جگہ ہوتے اور کوئی کسی پر حملہ آور نہ ہوتا۔ ایک روز ایسا ہوا کہ بھیڑیا ایک بکری کو اٹھا کر لے گیا۔ یہ حالت دیکھ کر میں نے کہا کہ معلوم ہوتا ہے کہ عمر بن عبدالعزیزؒ کا انتقال ہو گیا ہے۔ چنانچہ جب پتہ چلا تو واقعی اسی رات آپ کا انتقال ہوا تھا۔ (البدایہ والنہایہ جلد ۹ ص ۲۰۳) کرمان اور دوسرے

Marfat.com

کئی ایک مقامات پر بھی بکریوں کے شیروں کے ساتھ چرنے کے کئی ایک واقعات کتابوں میں مرقوم ہیں۔

آپ یہ دعا اکثر فرمایا کرتے تھے:

اللھم ان عمر لیس باھل ان تناله رحمتک ، ولکن رحمتک اھل ان تنال عمر

(البدایہ والنہایہ جلد ۹ ص ۲۰۳)

ترجمہ: "اے اللہ! عمر اس قابل نہیں کہ تیری رحمت اس پر نچھاور ہو، البتہ تیری رحمت اس کی اہل ہے کہ عمر (جیسے گناہ گار) کو اپنے دامن میں چھپالے۔"

Marfat.com

فضل وکمال

اس زمانہ کے جس قدر علوم تھے جیسے قرآن وحدیث اورفقہ وغیرہ سیدنا عمر بن عبدالعزیزؒ کو ان میں یدطولیٰ حاصل تھا اور اگر انہیں سیاسی حالات مسند خلافت پر نہ بٹھا دیتے تو یقین جانئے وہ اپنے وقت کے سب سے بڑے عالم اور سب سے بڑی مسند درس کی زینت ہوتے۔ علمی اعتبار سے ان کا شمار بڑے بڑے ائمہ میں سے ہوتا ہے۔ تمام علمائے حدیث نے ان کی جلالت اور ثقاہت علمی پر اتفاق کیا ہے۔ حافظ ذہبیؒ نے اپنی کتاب سیر اعلام لنبلاء میں ان کا تعارف ان الفاظ میں کرایا ہے:

الامام الحافظ العلاّ مة المتجهد العابد السيد

(سیر اعلام النبلاء جلد ۵ ص ۱۱۴)

امام، حافظ، علامہ مجتہد، عبادت گذار اور سردار۔

اور تذکرۃ الحفاظ میں لکھا:

كان فقيها عارفاًبالسنن، ثبتاً حجة، حافظاً قانتاً لله، اواهاً منيباً (تذکرۃ الحفاظ جلد ا ص ۱۰۵)

"یعنی آپ فقیہ، مجتہد، عالم سنت، کبیر الشان، ثبت، حجت، حافظ الحدیث، اللہ تعالیٰ کے فرمان بردار، نرم دل اور حق تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے والے تھے۔"

اور علامہ مزی نے لکھا ہے کہ:

" الامام العادل والخليفة الصالح " "وكان من ائمة

Marfat.com

العدل واهل الدین والفضل "۔ (تہذیب الکمال جلد ۲۱ ص ۴۳۳)

اور امام نوویؒ نے لکھا ہے کہ "ان کی جلالت علمی، وفور علم، فضیلت، صلاح، زہد و ورع، عدل، شفقت علی المسلمین، حسن سیرت، اللہ تعالیٰ کی راہ میں ان تھک جدوجہد کرنے والا، سنت نبوی اور آثار کا تتبع اور خلفائے راشدین کی اقتداء میں سب کا اتفاق ہے۔

(تہذیب الاسماء جلد ۱ ص ۱۷)

اسماء الرجال کی کوئی کتاب کھول کر دیکھ لیں آپ کے فضل و کمال کو انہی لفظوں میں بیان کیا گیا ہے۔ اسی وجہ سے کتابوں میں یہ بھی ہے کہ بڑے بڑے باکمال لوگ جن کو لوگ اکابر امت کہتے ہیں، آپ کے علمی کمالات کے سامنے طفل دبستان معلوم ہوتے تھے۔ چنانچہ میمون بن مہرانؒ فرماتے ہیں کہ آپ کے معاصر علماء آپ کے سامنے شاگرد معلوم ہوتے تھے۔ (تذکرۃ الحفاظ جلد ۱ ص ۱۰۶، تہذیب الکمال جلد ۲۱ ص ۴۴۰، البدایہ والنہایہ جلد ۹ ص ۱۹۴) اور ایک اور روایت ہے کہ سیدنا عمر بن عبدالعزیزؒ علماء کے معلّم تھے۔

(طبقات ابن سعد جلد ۵ ص ۲۷۱، البدایہ والنہایہ جلد ۹ ص ۱۹۴)

آپ کے وفور علم کی یہ حالت تھی کہ جو علماء آپ کو تعلیم دینے کے لیے تشریف لاتے وہ خود ان سے تعلیم حاصل کرتے تھے۔ چنانچہ مجاہد تابعی فرماتے ہیں کہ ہم لوگ ان کو تعلیم دینے کے لیے گئے تھے لیکن کچھ روز کے بعد ہم خود اس سے علم حاصل کرنے لگے۔ (تذکرۃ الحفاظ جلد ۱ ص ۱۰۶) ایک ایسا شخص جس نے سیدنا عبداللہ بن عمرؓ اور سیدنا عبداللہ بن عباسؓ کے صحبت اٹھائی تھی وہ بیان کرتا ہے کہ ہم نے جب بھی علم کو تلاش کرنا چاہا تو پتہ چلا کہ عمر بن عبدالعزیزؒ علم کے اصول و فروع کے تمام لوگوں سے زیادہ عالم ہیں۔

(البدایہ والنہایہ جلد ۹ ص ۱۹۴)

تفسیر و حدیث

اس زمانہ میں سب سے بڑا عالم اس کو سمجھا جاتا تھا جس کی حدیث و تفسیر اور فقہ میں نظر وسیع ہو۔ مشکلات قرآنی پر اس کو پورا عبور ہو اور حدیث کی ایک معتدبہ مقدار اس کے حافظہ میں محفوظ ہو۔ سیدنا عمر بن عبدالعزیزؒ ان سب باتوں میں مکمل مہارت رکھتے تھے۔ جہاں تک مشکلات قرآنی کا تعلق ہے۔ بڑے بڑے علمائے تفسیر اس بارہ میں آپ کی طرف ہر مشکل سوال کے جواب میں رجوع فرماتے تھے۔ چنانچہ ایک دفعہ حجاز و شام کے

Marfat.com

بعض علماء نے آپ کے صاحبزادے عبدالملک سے کہا کہ آپ کے والد ماجد سے قرآن حکیم کی اس آیت

انّی لھم التناوش من مکان بعید

وہ دور سے کیونکر پا سکتے تھے۔

کے بارہ میں پوچھو کہ اس سے کیا مراد ہے؟ انہوں نے پوچھا۔ سیدنا عمر بن عبدالعزیزؒ نے جواب دیا کہ اس سے مراد وہ توبہ ہے جس کی خواہش اس وقت کی جائے جس وقت انسان اس پر قادر نہ ہو۔ (سیرۃ عمر بن عبدالعزیز ص ۲۸)

اور حدیث کے بارہ میں تو حافظ ذہبیؒ کا قول نقل کیا جا چکا ہے کہ حدیث اور سُنت کے حافظ اور عارف تھے۔ (تذکرۃ الحفاظ جلد ۱ ص ۱۰۵، سیر اعلام النبلاء جلد ۵ ص ۱۱۴) اور امام مالکؒ اور ابن عینیہؒ نے آپ کو حدیث کے بارہ میں امام وقت کہا ہے۔

(تہذیب التہذیب جلد ۷ ص ۴۸۹)

نوویؒ اور دوسرے کئی ایک علماء نے لکھا ہے کہ جتنی مرفوع احادیث آپ کے کوزہ ذہن میں محفوظ تھیں اتنی کسی اور تابعی اور آپ کے معاصر کے حافظہ میں نہ تھیں۔ چنانچہ ایوب سختیانیؒ فرماتے ہیں کہ میں جن جن حضرات سے ملا ہوں ان میں سے کسی شخص کو میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث روایت کرنے والا نہیں پایا جتنا عمر بن عبدالعزیزؒ کو پایا۔

(تہذیب الاسماء جلد ۱ ص ۱۸)

تدوین حدیث

حدیث کے باب میں آپ کا سب سے بڑا کارنامہ تدوین حدیث ہے اور حقیقت یہ ہے کہ اگر آپ حدیث کی تدوین کا مناسب بندوبست نہ کرواتے تو حدیث نبوی کا ایک بہت بڑا حصہ ضائع ہو جاتا اور آج امت دین کی کئی باتوں کی تفصیل وتشریح سے محروم ہو جاتی۔

حدیث دین میں حجت ہے اور اس کی حجیت کا تقاضا یہ تھا کہ اس کو محفوظ کیا جائے، اس کے مطالب کھلے رکھے جائیں تاکہ اس سے استنباط کے چشمے پھوٹیں اور اجتہاد کی راہیں کھلیں۔ علم کی حفاظت اگرچہ یادداشت سے بھی ہوتی ہے لیکن اس کی پوری حفاظت

لکھے جانے ہی سے ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن حکیم کو لکھنے کی ہدایت فرمائی۔ چنانچہ قرآن حکیم کی تحریر نے حدیث کی تحریر کی فکر بھی پیدا کر دی۔ اگرچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا ہر مرحلہ، آپ کا ہر ارشاد اور آپ کی ہر ادا حدیث تھی تاہم نزول قرآن کے زمانہ میں اس بات کا اندیشہ تھا کہ تحریر حدیث کے اہتمام سے کہیں تحریر قرآن دب کر نہ رہ جائے اور نئے نئے اسلام میں داخل ہونے والے عرب کہیں قرآن اور حدیث کی تحریرات کو آپس میں خلط ملط نہ کر دیں۔ لہذا مصلحت وقت کا تقاضا تھا کہ نزول قرآن کے زمانہ تک حدیث کی تحریر پر عام حلقوں میں پابندی رہے۔ صرف انہی حضرات کو اجازت ہو جو ان حدود و فروق میں محتاط رہیں۔ چنانچہ بعض صحابہ کرامؓ نے حدیث کے قانونی طور پر محبت ہونے کے پیش نظر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کی تحریر کی اجازت طلب اور آپؐ نے ان کو اس کی اجازت دی بھی۔ چنانچہ ایک انصاری صحابی نے جب بارگاہ نبوت میں عرض کیا کہ میں حدیث سنتا ہوں مگر بھول جاتا ہوں تو آپؐ نے فرمایا: "استعن بیمینک" اپنے ہاتھ سے مدد لو یعنی لکھ لیا کرو۔ (ترمذی جلد۲ ص ۱۰۷) اسی طرح فتح مکہ کے موقع پر ایک شخص ابوشاہ آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ جب اس نے آپؐ کا بیان سنا تو عرض کی کہ مجھے لکھ دیجئے۔ آپؐ نے صحابہ کرامؓ سے فرمایا: "اکتبوہ لابی شاہ" ابوشاہ کے لیے یہ باتیں لکھ دو۔ (بخاری جلد ا ص ۲۲، ترمذی جلد۲ ص ۱۰۷) بعض روایات میں ہے کہ سیدنا انس بن مالکؓ نہ صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث لکھتے رہے بلکہ لکھ کر بعض اوقات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سناتے بھی تھے۔ چنانچہ آپ کے ایک شاگرد سعید بن ہلال فرماتے ہیں کہ "ہم جب سیدنا انس بن مالکؓ سے زیادہ روایات پوچھتے تو وہ بیاضیں نکال لیتے اور فرماتے کہ یہ روایات ہیں جو میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنیں۔ میں نے انہیں نہ صرف لکھا بلکہ آپؐ کو پڑھ کر بھی سناتا رہا۔ (مستدرک حاکم جلد۳ ص، معرفۃ الصحابہ جلد۳ ص ۵۷۴)

حجۃ الوداع کے خطبہ میں آپؐ نے تمام امت کو تبلیغ شریعت کے لیے ایک اصولی ہدایت فرمائی "فلیبلغ الشاھد الغائب" کہ ہر شاہد ان باتوں کو غائب تک پہنچائے۔ (بخاری جلد ا ص ۲۲، مسلم جلد۲ ص ۶۰) اور ایک روایت میں ہے کہ میری ایک بات بھی یاد ہو تو اسے آگے پہنچانا۔ یہ پہنچانا زبانی، پیغامی، تحریری اور تعملی جس طرح بھی ہو

Marfat.com

سکے صحابہ کرامؓ کی ذمہ داری ٹھیرا۔ ایک اور روایت میں فرمایا: "حدثو اعنّی" یعنی مجھ سے حدیث آگے پہنچاؤ۔ اس حکم کا تقاضا تھا کہ علم نبوی ہر طرح سے محفوظ رہے اور آگے پہنچتا رہے (مسلم جلد۲ ص۴۱۴) آپ نے اس حکم پر علم کرنے والوں کو دعا بھی دی کہ" اللہ تعالیٰ اس شخص کو خوش وخرم رکھے جو ہم سے کوئی شے سنے تو اسے آگے پہنچائے اور اس طرح پہنچائے جیسا اس نے سُنا ہے۔ (مشکواۃ ص ۳۵ رواہ الترمذی)

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت عربوں میں زبانی یادداشتوں کا بہت رواج تھا۔ ان کے حافظے بہت مضبوط تھے لیکن یادداشت کا یہ طریق آخر کب تک چل سکتا تھا۔ ایک ایسے دین میں جس کو قیامت تک قائم رہنا تھا، زبانی حفظ و روایت کی کڑیاں کب تک ساتھ دے سکتی تھیں۔ چنانچہ حفظ وفکر کے اس دور کے جلدی بعد ضروری تھا کہ حدیث باقاعدہ مرتب اور مدون ہو۔ چنانچہ تابعین کے بعد علم حدیث باقاعدہ ترتیب وتدوین کی منزل میں داخل ہو گیا۔ یہ وہ وقت تھا جب اسلامی تہذیب عجمی ممالک میں پھیل چکی تھی اور یہی وہ تین دور تھے جن کے بارہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خیر اور بھلا ہونے کی شہادت دی تھی، گویا صحابہ کرامؓ، تابعین اور تبع تابعین بہترین امت تھے۔ ان میں خیر غالب تھی۔ اس کے بعد افشا کذب کا دور شروع ہوا۔ چنانچہ حدیث میں ہے "ثم یفشو الکذب" پھر جھوٹ پھیل جائے گا۔

تدوین حدیث کی ابتدائی صورت

تدوین حدیث کی ابتدائی صورت بطور فن نہیں تھی بلکہ بطور یادداشت تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیث لکھنے کی اجازت بھی دے رکھی تھی۔ خود بھی بعض احکام لکھوائے تھے اور صحابہ کرامؓ نے بھی احادیث کی کچھ یادداشتوں کو محفوظ کر رکھا تھا جیسے سیدنا عبداللہ بن عمرو بن عاصؓ کا صحیفہ صادقہ، صحیفہ علی مرتضیٰؓ، صحیفہ عمرو بن حزمؓ، صحیفہ جابرؓ، صحیفہ سمرہ بن جندبؓ، کتاب معاذ بن جبلؓ، کتاب ابن عباسؓ، کتاب سعد بن عبادہؓ وغیرہ یہ سب صحیفے زمانہ صحابہ کے ہیں۔

سیدنا عمر بن عبدالعزیزؒ نے اپنے عہد خلافت میں بعض ائمہ علم کو جو حدیث کی نقل وروایت میں زیادہ معروف تھے، تدوین حدیث کی طرف توجہ دلائی کہ وہ احادیث کو تحریری

Marfat.com

طور پر جمع کریں۔ چنانچہ بخاری میں ہے:

"سیدنا عمر بن عبدالعزیزؒ نے ابوبکر بن حزمؒ کو لکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث پر نظر رکھیں اور انہیں لکھ لیں کیونکہ مجھے علم کے مٹ جانے اور علماء (حدیث) کے اٹھ جانے کا اندیشہ ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کے سوا اور کسی روایت کو قبول نہ کرنا، اور چاہیے کہ تم علم پھیلاؤ اور بیٹھو یہاں تک کہ نہ جاننے والا جان لے، اس لیے کہ علم برباد نہیں ہوتا جب تک اسے مخفی نہ رکھا جائے"۔ (بخاری جلد ا ص ۲۸)

علامہ ابن عبدالبرؒ نے لکھا ہے کہ ابوبکر بن حزمؒ نے آپ کے اس حکم کی تعمیل میں مجموعہ حدیث تدوین و ترتیب دے لیا تھا لیکن ابھی وہ عمر بن عبدالعزیزؒ کے پاس پہنچا نہ تھا کہ آپ کا انتقال ہوگیا۔ سیدنا عمر بن عبدالعزیزؒ نے امام زہریؒ کو بھی اس طرح کا ایک حکم دیا تھا اور ان سے احادیث لکھوائی تھیں۔ آپ کے احکام پورے عالم اسلام میں پہنچے کہ جہاں جہاں احادیث ہوں انہیں جمع کر لیا جائے جو مجموعہ ہائے حدیث دمشق میں جمع ہوئے آپ نے ان کی نقول عالم اسلام کے تمام علاقوں میں بھجوا دیں۔

حافظ ابن شہاب زہریؒ نے آپ کے حکم سے جو احادیث لکھنی شروع کی تھیں، صالح بن کیسانؒ بھی ان احادیث کے لکھنے میں ان کے ساتھ شریک تھے۔ فرماتے ہیں:

"میں اور زہری اکٹھے تھے۔ ہم احادیث کی تلاش کرتے رہتے اور ہمارا اتفاق ہوا کہ ہم سنن لکھیں۔ سو ہم نے ہر چیز جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالے سے سنی لکھ ڈالی۔ پھر ہم نے صحابہ کرامؓ کی روایات لکھنے کا ارادہ کیا۔ میں نے کہا: "میں نہیں لکھتا، یہ سنت نہیں ہیں۔ زہریؒ نے کہا یہ بھی سنت ہیں سو انہوں نے لکھیں میں نے نہ لکھیں۔ وہ کامیاب ہوئے اور میں ضائع ہوگیا۔

(مصنف عبدالرزاق جلد ۱۱ ص ۲۵۸، شرح السنہ جلد ا ص ۱۴۵)

حافظ ابن حجرؒ کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام صوبوں کے گورنروں کے نام آپ نے ایک فرمان لکھ کر بھیجا کہ احادیث کو مدون و مرتب کیا جائے۔ (فتح الباری جلد ا ص ۱۷۴) اس فرمان کی تعمیل میں کئی علماء نے کام کیا اور احادیث مرتب کیں۔ سعد بن ابراہیم کا بیان ہے کہ ہم کو عمر بن عبدالعزیزؒ نے احادیث جمع کرنے کا حکم دیا۔ ہم نے

Marfat.com

دفتروں کے دفتر احادیث لکھیں اور انہوں نے ان کی ایک ایک نقل پورے عالم اسلام میں بھیجی۔ (جامع بیان العلم ص ۳۸)

عمرؒ غرائب قرآن کے بھی مفسر تھے اور فقیہ بھی، لہٰذا آپ کے زمانہ میں قرآن و حدیث اور علوم فقہ اسلامی حکومت کے اقصائے مشرق اور مغرب تک پہنچ گئے۔ افریقہ کے مغربی علاقوں میں بربری مسلمانوں میں علم کی یہ ابتدائی ترقی تھی۔ عمرؒ کی طرح کسی اور خلیفہ نے علم الشرائع کا اس طرح اہتمام نہیں کیا۔ آپ سے پہلے حدیث و فقہ مستقل درسوں کے حلقوں میں ترقی کر رہا تھا جو خلفاء کی طرف سے قائم تھے۔ (فجر الاسلام ص ۲۲۱، ص ۲۴۸)

عمرؒ کے نزدیک صحیح علم وہ ہوتا تھا جو انسان کو قناعت کا درس دے۔ آپ اکثر فرماتے تھے: علم سیکھو کیونکہ علم مالدار کے لیے زینت ہے اور نادار کے لیے غیبی امداد۔ اگر آپ کسی شخص میں بقدر ضرورت علم نہ پاتے تو اس سے فرماتے: "اگر ہو سکے تو عالم بنو ورنہ معلم تو ضرور بنو، اگر یہ بھی ممکن نہ ہو تو علماء اور طلباء سے محبت ہی رکھو اور اگر یہ بھی نہ ہو سکے تو کم از کم ان سے بغض تو نہ رکھو"۔ (سیرۃ ابن عبدالحکم ص ۱۳۷، ص ۱۷۹) آپ نے علماء کو لکھ دیا تھا کہ اپنے اپنے حلقہ میں علم کی نشر و اشاعت کرتے رہیں کیونکہ سنتیں مٹا دی گئی ہیں۔ چنانچہ ایک روز آپ نے خطبہ میں فرمایا: "لوگو! طبیب سخت امراض کے لیے ہی بلایا جاتا ہے اور جہالت سے زیادہ سخت کوئی مرض نہیں اور گناہوں سے زیادہ گندا کوئی مرض نہیں اور موت سے زیادہ سنگین کوئی خوف نہیں"۔ (سیرۃ ابن جوزی ص ۹۳، ص ۳۰۷، ص ۴۳۹)

دینی علوم کے ساتھ ساتھ آپ نے دنیوی علوم کی نشر و اشاعت کا اہتمام فرمایا خصوصاً علم طب کا جس کی ہر شخص کو ضرورت پڑتی ہے۔ عبدالملک بن ابجر کنانی ایک ماہر طبیب تھا اور اسکندریہ میں طب کا درس دیتا تھا۔ عمرؒ کو اس کے ساتھ رہنے اور علاج کرانے کا اتفاق ہوا تھا۔ یہ عمرؒ کے ہاتھ پر مسلمان ہو گیا تھا۔ مسند خلافت پر بیٹھنے کے بعد عمرؒ نے انطاکیہ اور حران وغیرہ میں علم طب کی نشر و اشاعت میں اس سے مدد حاصل کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ علم طب اسلامی شہروں میں منتقل ہوا۔ عمرؒ کے حکم سے طب میں ماہر جو یا طبیب بصری اسرائیلی نے ایک کتاب تصنیف کی اور اسے لوگوں میں پڑھایا جانے لگا۔ (فجر الاسلام ص ۱۶۳، التراث الیونانی فی الحضارۃ الاسلامیہ ص ۴، لعبدالرحمٰن بدوی، تاریخ العرب المطول ص ۲۳۵)

Marfat.com

فقہ

حدیث کے بعد فقہ کا درجہ ہے۔ سیدنا عمر بن عبدالعزیزؒ نے اس کی بہت زیادہ اشاعت کی۔ وجہ یہ ہے کہ فقہی مسائل سے ہر شخص کو ہر روز واسطہ پڑتا ہے اور آپ کے عہد خلافت میں اسلامی ریاست کی پہنائیوں میں بے شمار اضافہ ہو چکا تھا اور مختلف علاقوں میں نئے نئے مسائل پیدا ہو چکے تھے۔ اس وجہ سے ان مسائل کے حل کے لیے آپ نے قرآن وحدیث سے مسائل کے استنباط کی مختلف تدابیر کیں۔ آپ سے قبل سیدنا عمرؓ نے اس بارہ میں کافی تگ وتاز کی۔ وہ خود بھی بہت بڑے فقیہ تھے اور سیدنا ابوبکر صدیقؓ کے زمانہ میں مفتی اعظم رہ چکے تھے، لہذا قرآن وحدیث سے مسائل کے استنباط کو بخوبی سمجھتے تھے۔ آپ نے خود اور صحابہ کرامؓ کے مشورے سے ان مسائل کو حل کیا۔ شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے لکھا ہے کہ سیدنا عمر علی الاطلاق امت کے سب سے بڑے فقیہ تھے۔ (ازالۃ الخفاء جلد ۳ ص ۳۹۶)

علامہ مزیؒ نے لکھا ہے کہ سیدنا عمر بن عبدالعزیزؒ نہایت ثقہ اور فقیہ کامل اور علم وتقویٰ میں یگانہ روزگار تھے اور بے شمار احادیث روایت کیں۔ (تہذیب الکمال جلد ۲۱ ص ۴۳۶) اسی فقہی ذہن کی وجہ سے سیدنا انس بن مالکؓ کے قول کے مطابق آپ کی نماز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کامل مشابہت رکھتی تھی۔ (تہذیب الکمال جلد ۲۱ ص ۴۳۴)

سیدنا عمر بن عبدالعزیزؒ بھی بقول حافظ ذہبی فقیہ اور مجتہد تھے۔ (تذکرۃ الحفاظ جلد ۱ ص ۱۰۵) انہوں نے سیدنا عمرؓ کے ان تمام فیصلوں کو جو انہوں نے اپنے عہد خلافت میں کیے تھے اور ان مسائل کو جو قرآن وسنت سے انہوں نے استنباط کیے یا کروائے جمع کرایا اور ملک کے مختلف حصوں میں ان کی نقول بھیجیں۔

شاعری

قرآن، حدیث اور فقہ کے بعد عربوں کو شاعری کے ساتھ ایک خاص لگن ہوتی تھی۔ اس وجہ سے ایک عرب ہونے کے ناطے آپ کا مذاق بھی شعر وشاعری کے بارہ میں نہایت ستھرا اور پاکیزہ تھا۔ زمانہ جاہلیت میں شاعری میں بہت عیوب پائے جاتے تھے خصوصی طور پر شعراء تشبیب میں اور شعروں میں شریف عورتوں کا نام اعلانیہ لا کر ان سے اپنی محبت کا اظہار کرتے سیدنا عمر فاروقؓ اس بات کو سخت ناپسند فرماتے تھے۔ اس وجہ سے آپ

Marfat.com

نے اسے حکماً بند کر دیا تھا کیونکہ اس سے ایک شریف عورت خواہ مخواہ بدنام ہو جاتی ہے۔ اسی طرح آپ نے ہجو گوئی کو بھی جرم قرار دیا۔ جو چیزیں نفس میں کمزوری کے فتنوں کو جگاتی اور شیطانی وسوسوں کے تار ہلاتی ہیں، سیدنا عمرؓ نے انہیں بھی ممنوع قرار دے دیا تھا کہ وہ انفرادی اور جماعتی زندگی پر بُرے اثرات ڈالتی ہیں۔ سیدنا عمرؓ ثانی کے زمانہ میں اشعار میں ان تمام ممنوعات کے باوجود یہ سب چیزیں دوبارہ شعر وشاعری میں پیدا ہو چکی تھی۔ لیکن سیدنا عمر بن عبدالعزیزؒ اپنی سعید فطرت کی وجہ سے اس مروجہ اور غیر پاکیزہ شاعری کو پسند نہیں فرماتے تھے البتہ اخلاق کو بلند کرنے والے اشعار آپ کو پسند تھے۔ آپ خود بہت کم اشعار کہتے تھے لیکن کبھی کبھی کہہ لیتے۔ علامہ ابن جوزیؒ نے آپ کی سیرت میں آپ کے بہت سے اشعار نقل کیے ہیں۔ جن کو یہاں نقل کرنا میرے خیال میں غیر ضروری ہے۔ اہل علم حضرات سیرت عمر بن عبدالعزیز ص ۲۲۵ پر ملاحظہ فرمائیں۔ ایک راگ بھی جو مدینہ طیبہ میں بہت مقبول تھا، آپ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ معلوم نہیں یہ کہاں تک درست ہے۔ (سیرت عمر بن عبدالعزیز ص ۲۳۸) ہوسکتا ہے کہ جس زمانہ میں آپ مدینہ منورہ کے گورنر تھے اور آپ کی طبیعت بھی عیش وتنعم کی طرف راغب ومائل تھی، آپ نے یہ راگ ایجاد کیا ہو۔ واللہ اعلم بالصواب

خطابت

خطابت نہ صرف اس زمانہ میں بلکہ ہر زمانہ میں انسان کی ایک بہت بڑی فضیلت تصور کی جاتی ہے کیونکہ ایک خطیب اپنی خطابت سے نہ صرف انسانوں کی زندگی میں بلکہ ملکوں میں ایک بہت بڑا انقلاب پیدا کر سکتا ہے۔ اگرچہ کتابوں میں آپ کے کئی موثر اور دل پذیر خطبات موجود ہیں اور ابن جوزی اور جاحظ نے اپنی کتاب البیان والتبین میں آپ کے ایک دو خطبات نقل بھی کیے ہیں جو نہایت بلیغ ہیں، لیکن اس کے باوجود آپ نے ایک خطیب کی حیثیت سے کوئی شہرت نہیں پائی ہے۔

عمرؒ غلط گفتگو کو ناپسند فرماتے تھے اور نہ ہی سخت کلامی آپ کو پسند تھی۔ فہم کلام کے لیے ان کا ذوق حساس اور لطیف تھا کیونکہ سیاسی اور اجتماعی مسائل سے آپ کو اکثر واسطہ رہتا تھا۔ آپ نہایت خوبصورت کلام فرماتے۔ کبھی کبھی شعر بھی کہتے لیکن مسند خلافت

Marfat.com

پر بیٹھنے کے بعد آپ نے شعر کہنے چھوڑ دیے تھے۔ (العمدۃ جلد ا ص ۲۷ لابن رشیق) آپ ایسے قول کو کچھ نہ سمجھتے تھے جس کی تصدیق عمل سے نہ ہو۔ بلا عمل کے کلام کرنے والے کو وہ ایسا گناہ گار سمجھتے تھے جو کثرت سے گناہوں میں ملوث رہتا ہو۔ (طبری جلد ۵ ص ۲۲۴) عمرؒ خود جب کلام فرماتے تھے تو آپ کی نیت میں خلوص اور دل میں صداقت ہوتی تھی، اس لیے لوگوں نے آپ سے سچی باتیں سُنیں جو اس سے قبل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ سے سنی تھیں۔ آپ جب قرآن پڑھتے تو لوگوں پر گریہ طاری ہو جاتا اور پھر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ لوگوں کے ساتھ مسجد کے در و دیوار بھی مصروف گریہ ہیں۔ ایک روز آپ نے عید کا خطبہ دیا جس میں بکمال سوز و گداز تھا۔ آپ کے دائیں بائیں بیٹھے ہوئے تمام لوگ مصروف گریہ ہو گئے۔ ابھی یہ خطبہ مکمل نہ ہوا تھا کہ آپ منبر سے نیچے اُتر آئے۔ رجاء نے کہا: "امیر المومنین! آج آپ نے ایسا خطبہ ارشاد فرمایا جس نے لوگوں کو رلا دیا۔ پھر سخت ضرورت کے وقت آپ خاموش ہو کر منبر سے نیچے اُتر آئے"۔ فرمایا: "رجاء! مجھے فخر و مباہات پسند نہیں۔" (سیرۃ ابن جوزی ص ۱۸۵، ص ۱۹۳ العقد رلفرید جلد ا ص ۶۲)

عمرؒ کا کوئی خطبہ، کوئی خط اور کوئی کلام خواہ وہ طویل ہو یا قصیر ایسا نہ تھا۔ جو بلاغت سے مرصع نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کے جملے حکمتوں کی جگہ استعمال ہوتے تھے۔ جیسے کہ

۱۔ اس شخص کی امید کا دامن وسیع نہیں ہونا چاہیے جسے یہ معلوم نہیں کہ وہ صبح کے بعد شام تک اور شام کے بعد صبح تک زندہ بھی رہے گا یا نہیں اور شاید صبح و شام کے درمیان موت اس کو اُچک لے۔

۲۔ اپنے دشمنوں سے جہاد کرنے کی طرح اپنی خواہشات سے بھی جہاد کرو۔

۳۔ نعمتوں کو شکر سے اور علم کو لکھ کر مقید کر لو۔

۴۔ لوگوں سے میل جول عقلوں کے لیے پیوند ہے۔

۵۔ جس میں تین خوبیاں ہوں وہ ایک کامل انسان ہے۔ جو غصہ میں حق سے باہر نہ ہو، رضا میں باطل پر نہ ہو اور قدرت پانے پر معاف کر دے اور بدلہ لینے سے باز رہے۔

عمرؒ کو حسن ادا میں بڑا کمال حاصل تھا اور جو شخص آپ کی باتیں سنتا وہ ٹھہر جاتا

تھا۔ چنانچہ ایک مرتبہ آپ کا ایک خطبہ عدی بن فضیل نے سُنا۔ یہ شخص فصاحت وبلاغت کلام کا بڑا مشتاق تھا۔ عدی مسافر تھا لیکن اس نے آپ کا جمعہ کا خطبہ سننے کے لئے ٹھہر جانا پسند کیا اور برابر ایک ماہ تک ٹھہرا رہا۔ وہ صرف آپ کے جمعہ کا خطبہ سننے کے انتظار میں رہتا تھا اور ٹھہرا بھی اسی غرض سے تھا۔ (الکامل للمبرد جلد ا ص ۹۱)

آپ کے خطبات کے لیے ملاحظہ ہو (کتاب البیان والتبیین جلد ا ص ۱۹۴، سیرۃ عمر بن عبدالعزیز ص ۲۴۰)

علماء کی قدر افزائی

سیدنا عمر بن عبدالعزیز جونہی مسند خلافت پر تشریف فرما ہوئے تو حجاز وعراق اور عرب کے دوسرے علاقوں کے شعراء جن میں نصیب، جریر، فرزدق، احوص، کثیر اور اخطل وغیرہ خاص مقام کے حامل تھے، دربار کے دستور کے مطابق اپنے اپنے قصیدے لے کر بارگاہ خلافت میں پہنچے، کیونکہ آپ کے قبل کے خلفاء کی بزم طرب انہی شعراء وخطباء اور ادباء سے سجتی تھی۔ چنانچہ ان حضرات نے جب اذن باریابی طلب کیا تو انہیں اجازت باریابی نہ ملی، وہ دارالخلافہ میں کچھ عرصہ ٹھہرے بھی تاکہ کسی طریقہ سے دربار خلافت میں رسائی حاصل ہو جائے لیکن عمر بن عبدالعزیزؒ اب وہ عمر نہیں تھے جو محفل طرب وغنا سجاتے۔ یہاں تو دل کی دنیا تبدیل ہو چکی تھی۔ دین زندگی کا مقصد اصلی بن چکا تھا لہذا کسی صورت اور کسی قیمت پر شعراء اور ادباء کو دربار خلافت میں آنے کی اجازت نہ دی گئی، چنانچہ وہ مایوس ہو کر واپس اپنے اپنے علاقوں میں چلے گئے۔ ان شعراء کے بجائے اب علماء وفقہا اور محدثین کو بلایا جانے لگا کیونکہ دین کے یہی نمائندے تھے۔ آپ نے ان کی بہت قدردانی اور عزت افزائی کی۔ چنانچہ تاریخ کے اوراق سے پتہ چلتا ہے کہ بڑے بڑے علماء اور فقہاء کی آپ کے پاس بکثرت آمد ورفت تھی اور آپ ان کا بڑا احترام کرتے تھے حالانکہ دینی علوم میں آپ ان سے کم نہ تھے کیونکہ امام، فقیہ اور مجتہد وغیرہ کے القابات تو ان کے بارہ میں کتابوں میں مرقوم ہیں۔

علامہ ابن جوزیؒ نے لکھا ہے کہ شعراء اور خطباء کی بارگاہ خلافت میں یہ کسمپرسی اور تباہ حالی کی حالت دیکھ کر ایک روز اس وقت کے مشہور شاعر جریر نے ایک ممتاز فقیہ کی

وساطت سے سیدنا عمر بن عبدالعزیزؒ کو یہ اشعار لکھ کر بھیجے۔

یاایھاالقاری المرخی عمامتہ ھذا زمانک انی قد مضی زمنی

"اے وہ قاری جس کے عمامہ کا شملہ لٹک رہا ہے، اب یہ تیرا زمانہ ہے، میرا زمانہ تو گذر گیا۔"

ابلغ خلیفتنا ان کنت لاقیہ انی لدی الباب کالمصفورفی قرن

"میرا یہ پیغام ہمارے خلیفہ کو پہنچا دے اگر تیری اس سے ملاقات ہو کہ میں دروازہ پر بیڑیوں میں جکڑا ہوا ہوں۔"

عون بن محمد نے سیدنا عمر بن عبدالعزیزؒ سے مل کر کہا کہ جریر سے میری عزت وآبرو بچایئے۔ آپ نے جریر کو بارگاہ خلافت میں اذن باریابی دیا۔ اس نے ایک قصیدہ پڑھا جس میں اہل مدینہ کے مصائب وآلام اور مشکلات ومعضلات کا ذکر تھا۔ سیدنا عمر ثانی نے ان کے لیے غلہ اور نقد روپیہ بھیجا اور جریر سے پوچھا: تم کس جماعت کے ہو مہاجرین سے یا انصار سے، یا ان کے اعزاء واقرباء سے یا مجاہدین سے؟ اس نے کہا: میں ان میں سے کسی سے نہیں ہوں۔ فرمایا: پھر مسلمانوں کے مال میں سے تمہارا کیا حق ہے؟ اس نے کہا: "اگر آپ میرے حق کو نہ روکیں تو اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں میرا حق مقرر فرمایا ہے۔ میں ابن سبیل (مسافر) ہوں۔ دور دراز سے سفر کر کے آپ کے دروازہ پر آ کر ٹھہرا ہوں۔ آپ نے فرمایا: اچھا، اب جب کہ تم میرے پاس آ ہی گئے ہو تو میں اپنی جیب خاص سے تمہیں بیس درہم دیتا ہوں، یہ لے لو۔ اس حقیر رقم پر تم خواہ میری تعریف کرو یا مذمت، میری مدح کرو یا ہجو۔ جریر نے اس حقیر رقم کو بھی غنیمت سمجھ کر لے لیا اور باہر آ گیا۔ دوسرے شعراء نے جو اس کو بارگاہ خلافت سے باہر نکلتے دیکھا تو دوڑ کر پوچھا: "کہو، ابوحرزہ! کیا رہا؟" جریر نے جواب دیا: "اپنا راستہ ناپو، یہ مخص شعراء کو نہیں بلکہ گداگروں کو دیتا ہے"۔ (سیرۃ عمر بن عبدالعزیز ص ۱۶۷۔۱۶۸)

اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ قومی خزانہ کو قوم کی امانت تصور کرتے تھے اور اپنی مدح سرائی میں صرف کرنا ایک خیانت سمجھتے تھے۔ شعراء کو داد و دہش دینے کے مقابلہ میں آپ علماء، فقہاء، قراء اور محدثین کی نہایت قدر افزائی فرماتے تھے اور انہیں دور دراز سے بلا کر اپنے خواص میں داخل فرماتے۔ (سیرۃ عمر بن عبدالعزیز ص ۱۶۶) یہی

وجہ ہے کہ مسند نشین خلافت ہونے کے بعد، سالم بن عبداللہ بن عمرؒ، محمد بن کعب قرظی رجاء بن حیوہ، رباح بن عبیدہ وغیرہ آپ کے مشیر خاص اور دوسرے متعدد علماء آپ کے ہم جلیس تھے اور آپ ہر معاملہ میں ان سے مفید مشورے لیتے تھے۔ (سیرۃ عمر بن عبدالعزیز ص ۱۵۱ تہذیب الاسماء نووی جلد ۱ ص ۲۰) مدینہ والوں میں آپ کے بہترین مصاحب عبیداللہ بن عبداللہ بن عتبہ تھے۔ یہ عمرؒ کی زندگی ہی میں فوت ہو گئے تھے لیکن پھر بھی ان کی عظیم محبت آپ کے دل میں جوش مارتی رہتی تھی۔ اکثر فرمایا کرتے تھے: "بخدا! میں عبیداللہ کی ایک رات سرکاری خزانہ سے ایک ہزار دینار میں خرید لوں گا"۔ پوچھا گیا: "امیر المومنین! آپ یہ کیا فرما رہے ہیں جب کہ آپ سرکاری خزانہ کے بارہ میں نہایت محتاط ہیں؟"۔ فرمایا: تمہاری عقلیں کہاں گئیں: "بخدا! میں ان کی رائے، خیر خواہی اور ہدایت سے بیت المال میں کروڑوں جمع کر دوں گا"۔ ایک مرتبہ فرمایا: "اگر مجھے عبیداللہ کی ایک مجلس نصیب ہو جائے تو وہ مجھے دنیا ومافیہا سے زیادہ محبوب ہے"۔ (عیون الاخبار للدینوری جلد ۳ ص ۷، وفیات الاعیان جلد ۲ ص ۳۰۰) دوسرے مصاحب آپ کے محمد بن کعب قرظی، مدنی و کوفی تھے جو نہایت متقی اور پارسا تھے۔ جلیل القدر اور ثقہ تھے اور علم وصلاح سے آراستہ تھے۔ (شذرات الذہب جلد ۱ ص ۱۳۶) آپ کے ایک اور دوست اور مصاحب حسن بصریؒ تھے۔ حسن بصریؒ نے آپ کو پُر خلوص اور موثر نصیحتوں سے گرما رکھا تھا۔ (البیان والتبیین جلد ۳ ص ۶۶)

مختصر یہ کہ عمر بن عبدالعزیزؒ نے علماء کو اپنے قریب رکھا اور دوسرے لوگوں کو اپنے پاس نہیں آنے دیا۔ پہلے خلفاء کے پاس ہر قسم کے لوگ اکٹھے ہو جاتے تھے لیکن جب عمرؒ مسند نشین خلافت ہوئے تو یہ فالتو قسم کے لوگ منتشر ہو گئے اور عمرؒ نے ان کو اپنے سے دور کر دیا۔ یہاں تک کہ لوگوں نے ایک ایسے شخص کے بارہ میں آپ سے پوچھا جو عمرؒ کا مصاحب تھا اور پھر عمرؒ نے اسے اپنے سے الگ کر دیا تھا۔ عمرؒ نے اس کے بارہ میں فرمایا: "ہم نے اسے اس طرح چھوڑ دیا ہے جیسے مہین ودبیز اور منقش ریشم کو چھوڑ دیا ہے"۔ (سیرۃ ابن جوزی ص ۷۴) عمرؒ نے ان لوگوں کو الگ کر کے نہایت اچھا کیا کیونکہ واقعات وحالات کی کروٹیں بتاتی ہیں کہ لوگوں پر اور ان کی جائدادوں اور جاگیروں پر سلاطین اور لوگوں کی لائی ہوئی مصیبتیں اکثر مصاحبوں ہی کی طرف سے آتی ہیں، لیکن علماء کو آپ نے اپنے قریب رکھا بلکہ اگر کسی نے ان سے تعاون نہیں کیا تو اس کا شکوہ کیا۔ چنانچہ آپ ایک

Marfat.com

شامی عالم سے یوں شکوہ کرتے ہیں کہ "خیر وصلاح میں ہاتھ بٹانے والے حضرات مفقود ہو گئے ہیں لہذا مجھے آپ کی رائے سے مدد کی ضرورت ہے"۔ انہوں نے آپ کو جواب میں لکھا: "مجھے آپ کے والا نامہ سے مسائل خلافت میں آپ کی اُلجھنوں کا اور مخلص خیر خواہوں کے نہ ملنے کا علم ہوا۔ دیکھئے آپ ایک ایسی دنیا کے خلیفہ ہیں جو بوسیدہ ہے اور جس میں پہلوں کے مٹے ہوئے کھنڈرات باقی ہیں۔ آج علماء خاموش اور جہلاء اپنی جہالتوں پر اڑے ہوئے ہیں، لہذا خبردار آپ مجرموں کے معاون نہ بنیں۔ (کتاب الخراج لابی یوسف ص ۱۱۴)

عمرؒ جب علم کی قدر کرتے تھے اور اس کی نشر واشاعت کے لیے آپ نے ہر قسم کے حکومتی ذرائع استعمال کیے تو قدرتی بات ہے کہ آپ علم پڑھنے اور پڑھانے والوں یعنی علماء اور طلباء کی بھی بڑی عزت اور احترام کیا کرتے تھے۔ ان سے اپنی مجالس میں مدد لیتے جیسا کہ گذشتہ سطور میں ذکر کیا گیا ہے۔ پھر آپ نے بہت سے علماء کو علم کی تبلیغ اور نشر واشاعت کے لیے مقرر کر دیا تھا اور جو علماء اور طلباء قرآن وحدیث اور فقہ پڑھنے پڑھانے میں مشغول تھے ان کے بڑے بڑے وظائف مقرر فرما دیے تھے اور جو حضرات مساجد کی خدمت کرتے تھے ان کے لیے بیت المال سے سو سو دینار وظیفہ مقرر کر دیا تھا۔ چنانچہ نہ صرف دار الخلافہ میں بلکہ دوسرے شہروں کے گورنروں کو لکھا کہ جو لوگ علم دین کی خدمت کر رہے ہیں ان کو زیادہ سے زیادہ وظائف دیے جائیں تاکہ وہ نہایت دل جمعی سے علم دین کی نشر واشاعت کر سکیں۔ اس سلسلہ میں حمص کے گورنر کو بھی لکھا کہ قرآن وحدیث کی نشر واشاعت میں مشغول رہنے والے علماء کو غنی اور متمول بنا دیا جائے تاکہ وہ ضروریات زندگی سے مستغنی ہو کر قرآن وحدیث کی درس وتدریس میں مصروف رہیں۔ طلباء کے لیے بھاری وظیفے مقرر فرمائے۔ آپ نے جن حضرات کو تعلیم کے لیے مقرر فرمایا تھا ان میں ایک یزید بن حبیب بھی تھے۔ آپ نے انہیں قاضی اور معلم بنا کر مصر بھیج دیا اور دیہاتی لوگوں میں علم فقہ کی نشر واشاعت کے لیے یزید بن ابی مالک دمشقی اور حارث بن یمجد اشعری کو مقرر فرمایا تھا اور دونوں حضرات کے بھاری وظیفے مقرر فرما دیے۔ یزید بن ابی مالک نے تو اپنا عہدہ اور وظیفہ قبول کر لیا تھا لیکن حارث نے اس دینی کام پر وظیفہ قبول کرنے سے یک قلم انکار کر دیا تھا۔ عمرؒ نے انہیں لکھا کہ یزید نے جو کچھ کیا ہم اس میں کوئی حرج اور مضائقہ نہیں سمجھتے اور میں دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ حارث جیسے لوگ اس امت میں فراوانی

Marfat.com

سے پیدا کر دے۔ (طبعات ابن سعد جلد۲ ص۲۱۰، تاریخ العرب المطول ص۳۲۳)

عمرؒ نے اپنے عہد خلافت میں معلمین اور قاضیوں کے لیے فراخی اور وسعت رزق کے دروازے کھول دیے لیکن اپنے لیے اور اپنی اولاد کے لیے رزق کے دروازے تنگ کر دیے۔ چنانچہ ایک دن ابن ابی ذکریا نے آپ سے کہا: "مجھے پتہ چلا ہے کہ آپ اپنے ہر عامل کو تین سو دینار دیتے ہیں؟" آپ نے فرمایا ہاں۔ انہوں نے کہا: "امیر المومنین! آپ دوسروں کے مقابلہ میں مال کے زیادہ حق دار ہیں"۔ عمر بن عبدالعزیزؒ نے اپنے کرتے سے اپنا ہاتھ نکال کر فرمایا: "ابن ابی ذکریا! اس کی مال فے سے پرورش ہوئی ہے۔ اب میں اس کی طرف مال فے کا ایک پیسہ بھی نہ لوٹاؤں گا"۔ آپ کی نگاہ میں قاضی اور عامل کی تنخواہ کی یہ انتہائی حد نہ تھی بلکہ آپ نے اس سے بھی زیادہ تنخواہیں مقرر کی تھیں حتی کہ بعض لوگوں کو آپ نے دس لاکھ سالانہ بھی تنخواہ دی۔

(سیرۃ ابن جوزی ص۷۴، ص۹۵، ص۱۰۳، سیرۃ ابن عبدالحکم ص۴۳)

تعلیم میں معلم کا ایک بہت بڑا کردار ہوتا ہے۔ کیونکہ اس کی عادات اور اس کے طریقہ گفتگو کو طالب علم غیر شعوری طور پر اخذ کرتا ہے، اس لیے آپ معلمین کے انتخاب میں بڑی احتیاط سے کام لیتے تھے۔ آپ کے نزدیک عربی اور عجمی معلم میں کوئی فرق نہ تھا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ آپ نے کچھ پارسی دیکھے جو علم نحو کا مطالعہ کر رہے تھے۔ آپ نے انہیں دیکھ کر فرمایا: تمہیں زبان کی اصلاح کرنی چاہیے کیونکہ سب سے پہلے تمہیں نے زبان کو بگاڑا تھا۔ آپ نے ارباب علم ودانش کو منتخب کر کے ملک کے دور دراز علاقوں میں تعلیم کے لیے بھیجا۔ ان میں سے اکثر نے انہی شہروں میں مستقل رہائش اختیار کر کے اپنا وطن بنا لیا اور وہیں فوت ہوئے اور پھر ان کی والاد وہیں کی ہو کر رہ گئی۔ ان معلمین کو ہدایت دی گئی تھی کہ وہ روزانہ بچوں کو قرآن حکیم کا کچھ حصہ پڑھائیں۔ قرآن حکیم تجوید سے پڑھائیں تاکہ بچے صحیح مخرج ادا کر سکیں۔ مدرسوں سے چھٹی ہونے کے بعد تیر کمان کی مشق کریں اور ہدف پر اپنا نشانہ درست کریں اور روزانہ کم از کم سات تیر چلایا کریں اور پھر دوپہر کو گھر پر آرام کریں۔ (سیرۃ ابن جوزی ص۲۵۷) آپ علم کو زبانی پڑھانا ضروری نہیں سمجھتے تھے بلکہ آپ کے نزدیک یہ ضروری تھا کہ علم لکھ لیا جائے تاکہ ایک تو وہ مضبوط و مستحکم ہو اور دوسرے وہ ضائع نہ ہو۔ (الکامل للمبرد ص۹۶)

Marfat.com

ذاتی حالات

جیسا کہ ذکر کیا جا چکا ہے کہ سیدنا عمر بن عبدالعزیزؒ ماں کے پیٹ سے چاندی کا چمچہ لے کر پیدا ہوئے تھے۔ عنفوان شباب میں اس زمانہ کی ہر قسم کے عیش و نعم سے بھرپور زندگی گذاری لیکن خلافت کی گراں بار ذمہ داری کاندھوں پر پڑی تو زندگی کا تمام نقشہ ہی بدل گیا۔ اب عیش و نعم کے بجائے زہد و تقشف کی زندگی گذارنی شروع کر دی۔ وہ شخص جس کا لباس دیکھنے والوں کی ایک نگاہ پڑنے ہی سے پرانا ہو جاتا تھا اور پھر اس کو دوبارہ پہننے کی نوبت نہیں آتی تھی اب اس کے پاس صرف ایک جوڑا کپڑوں کا رہتا تھا اور اسی کو دھو دھو کر وہ پہنا کرتا تھا۔ مرض الموت میں ایک قمیض کے علاوہ دوسری قمیض نہ تھی کہ اس کو بدل کر دوسری پہنی جا سکے۔ علامہ ابن جوزیؒ نے لکھا ہے کہ آپ کی اہلیہ کے بھائی مسلمہ بن عبدالملک نے آپ کی اہلیہ اور اپنی بہن فاطمہ سے کہا کہ آپ کی قمیض چونکہ میلی ہو گئی ہے۔ بڑے بڑے لوگ آپ کی عیادت کے لیے آتے ہیں، لہذا دوسری قمیض بدل دیں۔ وہ خاموش ہو گئیں اور نمناک آنکھوں سے بھائی سے کہا: خدا کی قسم! اس قمیض کے علاوہ اور کوئی کپڑا نہیں ہے۔ (سیرت عمر بن عبدالعزیز ص ۱۹۷، البدایہ والنہایہ جلد ۹ ص) پھر جو کپڑے پہنے ہوئے تھے وہ بھی پیوند لگے ہوئے تھے آپ کا کوئی کپڑا بھی ایسا نہ تھا جس کو پیوند نہ لگے ہوں۔ (سیرت عمر بن عبدالعزیز ص ۸۰)

آپ کے اہل و عیال بھی اسی تنگ دستی سے زندگی گذارتے تھے۔ ایک مرتبہ آپ کی صاحبزادی کے پاس کپڑا نہ تھا۔ آپ نے حکم دیا کہ فرش پھاڑ کر کرتہ بنا دیا جائے۔ اس

Marfat.com

واقعہ کی خبر جب آپ کی بہن کو ہوئی تو انہوں نے کپڑے کا ایک تھان بھجوا دیا اور منع کر دیا کہ عمرؒ سے اب کپڑا نہ مانگنا۔ (سیرت عمر بن عبدالعزیز ص ۲۷۵) اسی طرح ایک مرتبہ آپ کے ایک صاحبزادے نے کپڑے مانگے تھے۔ آپ نے فرمایا: "میرے کپڑے خیار بن ریاح کے پاس پڑے ہیں ان سے جا کر لے لو۔ وہ ان کے پاس گئے انہوں نے گاڑھے کے کپڑے نکال کر دیے۔ عبداللہ نے کہا "یہ کپڑے ہمارے پہننے کے لائق نہیں ہیں۔" خیار نے کہا "میرے پاس تو امیرالمومنین نے یہی کپڑے رکھے ہیں، ان کے علاوہ اور کوئی کپڑے نہیں ہیں"۔ عبداللہ نے واپس جا کر اپنے ابا عمر بن عبدالعزیز سے بھی وہی کچھ کہا جو خیار سے کہا تھا۔ آپ نے جواب دیا: "بیٹا! میرے پاس تو یہی ہیں"۔ یہ جواب سُن کر وہ مایوس ہو کر لوٹنے لگے تو آپ نے واپس بلا کر کہا "اگر کپڑوں کے لیے اپنے وظیفہ سے پیشگی رقم لینا چاہو تو لے سکتے ہو۔ چنانچہ اسے سو درہم پیشگی وظیفہ کے دلوا دیے اور جب وظیفہ تقسیم ہوا تو وہ رقم کاٹ لی گئی۔ (سیرت عمر بن عبدالعزیز ص ۲۷۳)

بعض روایات میں ہے کہ آپ عیدالفطر سے ایک روز قبل حکومت کا کام کر رہے تھے کہ بیوی نے آ کر کہا "صبح عید ہے اور بچے نئے کپڑوں کی ضد کر رہے ہیں اور گھر میں ان کا کوئی نیا کپڑا نہیں ہے۔ اہلیہ کی بات سن کر ایک پریشانی لاحق ہو گئی۔ بیت المال کے انچارج کو ایک رقعہ لکھا کہ اگر مجھے آئندہ ماہ کی تنخواہ پیشگی دے دیں تو میں نہایت ممنون ہوں گا۔ خازن نے رقعہ کی پشت پر لکھ بھیجا کہ اگر امیرالمومنین آئندہ ماہ زندہ رہنے کی ضمانت دے دیں تو میں پیشگی تنخواہ دینے کو تیار ہوں، وگرنہ معذرت خواہ ہوں۔ جواب پڑھ کر اہلیہ سے فرمایا کہ رقم کا بندوبست نہیں ہو سکا، لہذا پرانے کپڑوں کو دھولو اور کل بچے وہی دُھلے ہوئے کپڑے پہن کر عید کریں گے۔

یہ تو لباس کا حال تھا۔ غذا کا حال بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ غذا نہایت معمولی اور سادہ ہوتی تھی۔ روٹی اور روغن زیتون یا پھر دال روٹی کھاتے تھے۔ (طبقات ابن سعد جلد ۵ ص ۲۷۴) جو خوراک آپ کی تھی وہی آپ کے غلاموں کی بھی تھی۔ ایک روز ایک غلام نے کہا۔ روز روز دال روٹی؟ آپ کی اہلیہ نے جواب دیا: امیرالمومنین کی یہی غذا ہے۔ (سیرت ص ۱۵۲) پھر یہ غذا بھی کبھی پیٹ بھر کر نہیں کھائی۔ آپ کے غلاموں کا بیان ہے کہ جب سے آپ نے مسند خلافت پر قدم رنجہ فرمایا اس وقت سے لے کر اپنی وفات تک کبھی

Marfat.com

پیٹ بھر کر کھانا نہیں کھایا۔ (سیرت عمر بن عبدالعزیز ص ۱۵۴) جب کبھی اچھی شے کھانے کی خواہش ہوتی تو وہ خواہش دل ہی میں گھٹ کر رہ جاتی کیونکہ اس کو پورا کرنے کی مقدرت نہ تھی۔ چنانچہ ایک مرتبہ انگور کھانے کو جی چاہا۔ اپنی اہلیہ سے پوچھا "تمہارے پاس ایک درہم ہے؟ میرا انگور کھانے کو جی چاہ رہا ہے"۔ انہوں نے جل بھن کر جواب دیا۔ "آپ اچھے امیرالمومنین ہیں کہ جیب میں ایک درہم بھی نہیں"۔ فرمایا "یہ جہنم کی ہتھکڑیوں سے میرے لیے زیادہ آسان ہے"۔ (تاریخ الخلفاء سیوطی ص ۲۳۵، البدایہ والنہایہ جلد ۹ ص ۲۰۲)

غذا اور لباس کی سادگی تو ایک طرف رہی آپ نے خلافت کا بارگراں اٹھانے کے بعد میاں بیوی کی فطری خواہشات کو بھی یک قلم ترک کر دیا تھا۔ (تاریخ الخلفاء ص ۲۳۵) ان کی زندگی کا یہ پہلو دیکھ کر ان کی اہلیہ فاطمہ بنت عبدالملک نے (جو چاندی کا چمچہ منہ میں لے کر پیدا ہوئی تھی) بھی اپنے آپ کو اسی رنگ میں رنگ لیا تھا۔ زیب و زینت کی تمام چیزیں ترک کر دی تھیں۔ چنانچہ ایک مرتبہ ایک متمول گھرانے کی ایک عورت نے ان کو اس حالت میں دیکھا اس سے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا "میرے میاں کو یہی پسند ہے"۔
(سیرت عمر بن عبدالعزیز ص ۱۵۴)

خوف آخرت

خلافت کا بار اٹھانے کے بعد تو سیدنا عمر بن عبدالعزیزؒ کا نقطہ نظر ہی بدل گیا تھا ہر وقت آخرت آنکھوں کے سامنے اپنا خوف لیے کھڑے رہتی تھی۔ حکومت اور سلطنت کے بارہ میں تو یہ معمول ہو گیا تھا کہ راتوں کو تنہائی میں بیٹھ کر رو رو کر اللہ تعالیٰ سے دعائیں کرتے رہتے۔ اسی حالت میں آنکھ اگر لگ جاتی تو جب بھی اٹھتے رونے کا مشغلہ جاری رہتا۔ اپنے جد امجد سیدنا فاروق اعظمؓ کی طرح ہر وقت رعایا کی فکر رہتی کہ کہیں روز قیامت ان کے بارہ میں باز پرس نہ ہو جائے۔ بعض لوگ آپ کے اس گریہ و بکا پر انہیں ملامت کرتے۔ آپ جواب میں انہیں فرماتے تم لوگ مجھے رونے پر ملامت کرتے ہو۔ یاد رکھو اگر فرات کے کنارے بکری کا ایک بچہ بھی ہلاک ہو جائے تو عمرؒ اس کے بدلہ میں پکڑا جائے گا۔ (سیرت عمر بن عبدالعزیز ص ۱۹۲)

یہی بات سیدنا فاروق اعظمؓ نے کئی مرتبہ فرمائی تھی کہ

لـومات جمل ضياعاً علىٰ شط الفرات فخشيت
ان يسئلنى الله عنه.

(طبقات ابن سعد جلد۳ ص ۳۰۵)

"اگر ساحل فرات پر کوئی اونٹ بے سہارا مر جائے تو مجھے ڈر ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے بارہ میں مجھ سے جواب طلب کرے گا۔"

اور یہ بات تو آپ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ

"اگر کسی نہر کے کنارے کوئی خارشتی بکری اس حال میں چھوڑ دی جائے کہ اسے علاج کے طور پر تیل کی مالش نہ کی جاسکے تو مجھے ڈر ہے کہ قیامت کے روز مجھ سے اس کے بارہ میں جواب طلب کیا جائے گا"۔ (البرالمہسوک ص ۱۷)

سیدنا عمر بن عبدالعزیزؒ بھی اسی طرح خوف آخرت سے ڈرتے تھے اور اسی خوف سے راتوں اور دن کے وقت تنہائیوں میں روتے رہتے تھے۔ ایک روز ان کی اہلیہ نے پوچھا کہ اس رونے کی کیا وجہ ہے؟ آپ نے پہلے تو اس کو ٹالا، لیکن جب اس نے اصرار کیا اور کہا کہ میں اس سے نصیحت حاصل کرنا چاہتی ہوں، اس وقت آپ نے بتایا کہ میں نے اپنے بارہ میں غور کیا تو پتہ چلا کہ میں اس امت کے سیاہ وسفید جملہ امور کا ذمہ دار ہوں۔ اس لیے جب میں بے کس وبے سہارا اور محتاج وفقیر، گم شدہ اور قیدی اور اس قبیل کے دوسرے لوگوں کو دیکھتا ہوں جو پوری مملکت اسلامیہ میں پھیلے ہوئے ہیں۔ جن کی پوری ذمہ داری مجھ ناتواں کے کندھوں پر ہے اور یہ بھی خیال آتا ہے کہ حق تعالیٰ شانہ ان کے بارہ میں قیامت کے روز مجھ سے پوچھے گا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے متعلق مجھ پر دعویٰ کریں گے۔ اگر میں اللہ اور اس کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کوئی دلیل نہ پیش کر سکا تو مجھے خوف پیدا ہو جاتا ہے اور میرے آنسو نکل آتے ہیں۔ یہی شے ہے جو مجھے ہر وقت رلاتی رہتی ہے۔ (سیرت عمر بن عبدالعزیز ص ۱۸۸)

ایک مرتبہ فاطمہ بنت عبدالملک سے آپ کی عبادت کے بارہ میں پوچھا گیا تو انہوں نے جواب میں فرمایا:

"اللہ کی قسم! آپ کثرت سے نمازیں اور روزے نہ رکھتے تھے لیکن میں نے عمرؒ سے زیادہ اللہ سے ڈرنے والا کسی کو نہیں دیکھا۔ جب آپ کو بستر پر اللہ اور

Marfat.com

آخرت کا تصور آجاتا تو شدت خوف سے مرغ بسمل کی طرح تڑپا کرتے تھے حتیٰ کہ ہمیں محسوس ہوتا کہ شاید صبح تک آپ ختم ہو جائیں گے"۔

(سیرت ابن عبدالحکم ص ۴۷)

یزید بن حوشب کا بیان ہے کہ میں نے حسن بصریؒ اور عمر بن عبدالعزیزؒ سے زیادہ کسی شخص کو قیامت سے ڈرنے والا نہیں دیکھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ شاید جہنم انہی کے لیے بنائی گئی ہے۔ (طبقات ابن سعد جلد ۵۵ ص ۲۹۴)

ایک مرتبہ آپ نے ایک فوجی افسر سلیمان بن ابی کریمہ کو لکھا:

"اللہ تعالیٰ کی عظمت وخشیت کا سب سے زیادہ مستحق وہ بندہ ہے جس کو اس نے اس آزمائش میں ڈالا جس میں میں ہوں۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک مجھ سے زیادہ سخت حساب دینے والا اور اگر اس کی نافرمانی کروں تو مجھ سے زیادہ ذلیل کوئی نہیں ہے۔ میں اپنی حالت سے سخت دل گرفتہ ہوں۔ مجھے اندیشہ ہے کہ میرے یہ حالات مجھے ہلاک نہ کر دیں۔ مجھے معلوم ہوا ہے۔ کہ تم جہاد فی سبیل اللہ کے لیے جانے والے ہو تو اے مرے بھائی! جب تم میدان جہاد میں پہنچ جاؤ تو اللہ تعالیٰ سے دعا کرو کہ وہ مجھے شہادت عطا فرمائے اس لیے کہ میری حالت نہایت سخت اور میرا خطرہ نہایت عظیم ہے"۔ (طبقات ابن سعد جلد ۵۵ ص ۲۹۲)

ایک روز آپ کو خلافت سے پہلے کا اطمینان وفراغت کا زمانہ یاد آ گیا۔ آپ نے اہلیہ سے کہا "ہمارا گزشتہ زمانہ کتنا راحت بخش اور خوش آئند تھا"۔ اہلیہ نے کہا "آج تو آپ کو اس زمانہ سے کہیں زیادہ اقتدار و اختیار حاصل ہے۔ اس وقت آپ صرف ایک صوبے کے حاکم تھے اور آج پوری مملکت اسلامیہ آپ کے زیر اقتدار ہے۔ کوئی شخص روک ٹوک کرنے والا نہیں"۔ اہلیہ کے منہ سے یہ الفاظ سُن کر آپ نے بڑے پُر درد لہجے میں فرمایا: "فاطمہ! تم صرف یہ دیکھ رہی ہو کہ میں ساری سلطنت کا فرماں روا ہوں۔ ذرا اس ذمہ داری کا بھی خیال کرو جو اس فرماں روائی کی وجہ سے میرے نازک کندھوں پر آن پڑی ہے"۔ میں آخرت کے خوف سے لرزہ براندام ہوتا ہوں۔ "انی اخاف ان عصیت ربی عذاب یوم عظیم"۔ "اگر میں اپنے رب کی نافرمانی کروں تو (اس کی پاداش میں) ایک بڑے دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں"۔ اس جواب میں ایسا درد اور سوز تھا کہ

Marfat.com

فاطمہ بھی بے اختیار رونے لگیں کہ "اے اللہ! ان کو جہنم کے عذاب سے محفوظ رکھیو"۔

ایک دفعہ خلیفہ عبدالملک بن مروانؒ کے ساتھ سفر میں تھے۔ کچھ ساتھیوں کے سامان پیچھے رہ گئے، اس وجہ سے شاہی سواری پیچھے ٹھہر گئی۔ جن کے سامان روانہ ہو چکے تھے وہ آرہے تھے۔ جن کے سامان روانہ نہیں ہوئے تھے ان کے پاس کوئی سامان نہیں تھا۔ بس اتنی سی بات پر سیدنا عمر بن عبدالعزیزؒ کو آخرت یاد آ گئی اور آپ فرط تاثر سے رو پڑے۔ عبدالملکؒ نے رونے کا سبب پوچھا تو فرمایا: "کل قیامت کے روز بھی ایسا ہوگا۔ جس نے یہاں سے کچھ بھیجا ہوگا اسے تو وہاں مل جائے گا اور جس نے نہ بھیجا ہوگا وہ محروم رہے گا"۔ بس اسی فکر نے آپ کے دنیا تبدیل کر دی اور پھر موت تک آخرت کی یاد سامنے رہی۔

موت اور قبر

سیدنا عمر بن عبدالعزیزؒ نہ صرف آخرت سے خوف کھاتے رہتے تھے بلکہ آخرت سے قبل قبر کی یاد بھی انہیں ہر وقت ستائے رکھتی تھی۔ چنانچہ ایک مرتبہ ایک جنازہ کے ساتھ تشریف لے گئے۔ قبرستان میں پہنچ کر ایک طرف بیٹھ گئے اور کچھ سوچنے لگے۔ کسی شخص نے عرض کی "امیرالمومنین! آپ اس جنازہ کے ولی تھے، آپ ہی علیحدہ بیٹھ گئے؟" فرمایا: "ہاں مجھے ایک قبر نے آواز دی اور مجھ سے یوں کہا اے عمر! تو مجھ سے یہ نہیں پوچھتا کہ میں ان آنے والوں کے ساتھ کیا کیا سلوک کرتی ہوں؟" میں نے کہا "بتا کہ تو ان کے ساتھ کیا کرتی ہے"۔

"قبر ہر ایک کو پکارتی ہے۔ ہر ایک کو سندیسہ دیتی ہے۔ ہر ایک کو ہر روز اپنے بارے میں بتاتی ہے۔ وہ نہایت فصیح اور صاف آواز کے ساتھ یہ اعلان کرتی ہے کہ اے آدم کے بیٹے تو مجھے بھول گیا، میں تنہائی کا گھر ہوں، میں اجنبیت کا گھر ہوں، میں دہشت کا گھر ہوں، میں کیڑوں کا گھر ہوں، میں نہایت تنگی کا گھر ہوں، مگر اس شخص کے لیے نہیں جس پر اللہ تعالیٰ مجھے وسیع بنا دے۔ لیکن ہم نے اس آواز کے لیے کانوں کو بہرا بنا لیا ہوا ہے۔ دنیا کی ریل پیل نے ہمیں اس آواز کو سننے کی فرصت ہی نہیں دی۔ لیکن عمر بن عبدالعزیزؒ اور ان جیسے کئی بزرگ اس آواز کو سنتے ہیں۔ چنانچہ جب عمر بن عبدالعزیزؒ نے قبر سے پوچھا کہ بتا تو کیا کرتی ہے۔ اس نے جواب دیا:

Marfat.com

"میں نئے آنے والوں کے کفن پھاڑ دیتی ہوں۔ بدن کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیتی ہوں۔ خون سارا چوس لیتی ہوں، گوشت کھا لیتی ہوں اور بتاؤں کہ آدمی کے جوڑوں کے ساتھ کیا کرتی ہوں؟ مونڈھوں کو باہوں سے جدا کر دیتی ہوں اور سرینوں سے رانوں کو جدا کر دیتی ہوں اور رانوں کو گھٹنوں سے اور گھٹنوں کو پنڈلیوں سے اور پنڈلیوں کو پاؤں سے جدا کر دیتی ہوں"۔

(البدایہ والنہایہ جلد ۹ ص ۲۰۴)

یہ فرما کر سیدنا عمر بن عبدالعزیزؒ رونے لگے اور فرمایا:

"دنیا کا قیام بہت ہی تھوڑا ہے اور اس کا دھوکہ بہت زیادہ ہے۔ اس میں جو عزیز ہے وہ آخرت میں ذلیل ہے۔ اس میں جو دولت والا ہے وہ آخرت میں فقیر ہے۔ اس کا جوان بہت جلد بوڑھا ہو جائے گا۔ اس کا زندہ بہت جلد مر جائے گا۔ اس کا تمہاری طرف متوجہ ہونا تم کو دھوکہ میں نہ ڈال دے حالانکہ تم دیکھ رہے ہو کہ یہ کتنی جلدی منہ پھیر لیتی ہے۔ اور بے وقوف وہ ہے جو اس کے دھوکہ میں پھنس جائے"۔

کہاں گئے اس کے وہ دلدادہ جنہوں نے بڑے بڑے شہر آباد کئے۔ بڑی بڑی نہریں نکالیں۔ بڑے بڑے باغ لگائے اور بہت تھوڑے دن رہ کر سب کو چھوڑ کر چل دیے۔ وہ اپنی صحت و تندرستی سے دھوکہ میں پڑے کہ صحت کے بہتر ہونے سے ان میں نشاط پیدا ہوا اور اس سے گناہوں میں مبتلا ہوئے۔ بخدا! وہ لوگ دنیا میں مال کی کثرت سے قابل رشک تھے باوجودیکہ مال کے کھانے میں ان کو رکاوٹیں پیش آتی تھیں مگر پھر بھی خوب کماتے تھے۔ ان پر لوگ حسد کرتے تھے لیکن وہ بے فکر ہو کر مال کو جمع کرتے رہتے تھے اور اس کو جمع کرنے میں ہر قسم کی تکلیف کو خوشی سے برداشت کرتے تھے لیکن اب دیکھ لو مٹی نے ان کے بدنوں کا کیا حال کر دیا ہے اور خاک نے ان کے بدنوں کو کیا بنا دیا ہے؟ کیڑوں نے ان کے جوڑوں کا کیا حال بنایا؟ وہ لوگ دنیا میں اونچی اونچی مسہریوں میں اونچے اونچے فرش اور نرم نرم گدوں پر نوکروں اور خادموں کے درمیان آرام کرتے تھے۔ اعزاء واقرباء، رشتہ دار اور پڑوسی ہر وقت دل داری کو تیار رہتے تھے، لیکن اب کیا ہو رہا ہے؟ ان سے آواز دے کر پوچھ لو کہ کیا گزر رہی ہے؟ غریب اور امیر سب ایک میدان میں

Marfat.com

پڑے ہوئے ہیں۔ ان کے مال دار سے پوچھ کہ اس کے مال نے کہاں کام دیا؟ اس کے فقیر سے پوچھ کہ اس کے فقر نے کیا نقصان کیا؟ کہاں ہیں ان کے وہ خیمے اور کمرے جن میں وہ آرام کرتے تھے؟ کہاں ہیں ان کے وہ مال اور خزانے جن کو جوڑ جوڑ کر رکھتے تھے۔ ان کے خدام نے ان کو قبر میں کھانے کے لیے کوئی توشہ بھی نہ دیا اور ان کی قبر میں کوئی بستر بھی نہ بچھایا، کوئی تکیہ بھی نہ دیا۔ زمین ہی پر ڈال دیا۔ آہ! اب وہ بالکل اکیلے پڑے ہیں۔ اندھیرے میں پڑے ہیں۔ ان کے لیے اب رات دن برابر ہیں۔ دوستوں سے مل نہیں سکتے اور کسی کو اپنے پاس بلا نہیں سکتے۔ کتنے نازک اندام مرد اور نازک اندام عورتیں، آج ان کے بدن بوسیدہ ہیں، ان کے اعضاء ایک دوسرے سے جدا ہیں، آنکھیں نکل کر منہ پر آ گئی ہیں، گردن جدا ہو گئی ہے۔ منہ میں پانی اور پیپ وغیرہ بھری ہوئی ہے اور سارے بدن میں کیڑے چل رہے ہیں۔ وہ اس حال میں ہیں کہ ان کی بیویوں نے دوسرے نکاح کر لیے اور وہ مزے اڑا رہی ہیں۔ بیٹوں نے مکانوں پر قبضہ کر لیا۔ وارثوں نے مال تقسیم کر لیا۔ مگر بعض خوش نصیب ایسے بھی ہیں جو اپنی قبروں میں بھی لذتیں اڑا رہے ہیں۔ تر و تازہ چہروں کے ساتھ راحت و آرام میں ہیں"۔

"اے انسان! اس دنیا کے ساتھ آخر کس شے نے تجھے دھوکے میں ڈال رکھا ہے۔ تجھے امید ہے کہ یہ کم بخت دنیا تیرے ساتھ رہے گی؟ کیا تجھے یہ امید ہے کہ اس کوچ کے گھر میں تو ہمیشہ رہے گا۔ تیرے یہ وسیع و عریض مکان، تیرے باغوں کے پکے ہوئے پھل، تیرے نرم و گداز بستر، تیرے گرمی و سردی کے جوڑے، یہ سب کے سب ایک دم رکھے رہ جائیں گے۔ جب ملک الموت آ کر مسلط ہو جائے گا تو تیری کوئی شے اس کو نہ ہٹا سکے گی۔ پسینوں پر پسینے آنے لگیں گے۔ پیاس کی شدت بڑھ جائے گی اور ان کی سختی میں تو کروٹیں بدلتا رہ جائے گا"۔

"افسوس صد افسوس! اے وہ شخص جو باپ کی آنکھ بند کر رہا ہے۔ آج مرتے وقت اپنے بھائی کی آنکھ بند کر رہا ہے۔ اپنے بیٹے کی آنکھ بند کر رہا ہے۔ ان میں سے کسی کو نہلا رہا ہے۔ کسی کو کفن دے رہا ہے۔ کسی کے جنازے کے ساتھ جا رہا ہے اور کسی کو گڑھے میں ڈال رہا ہے۔ کل کو تجھے بھی یہ سب کچھ پیش آنا ہے"۔

کہتے ہیں کہ قبرستان کے اس واقعہ کے بعد ایک ہفتہ بھی نہ گزرا تھا کہ سیدنا عمر

بن عبدالعزیزؒ کا انتقال ہوگیا۔ رضی اللہ عنہ وارضاہ

چھوٹے چھوٹے سلاطین کی بزم عیش و طرب میں موت اور قبر کے ذکر اور خوف کا گزر نہیں ہوتا لیکن اسلامی حکومت کے اتنے بڑے سربراہ مملکت کی مجلس "مجلس عزا" ہوتی تھی۔ رات کو علماء اکٹھے ہو کر موت اور عذاب قبر اور قیامت کے سوال وجواب کا تذکرہ کر کے اس طرح روتے جیسے ان کے سامنے جنازہ رکھا ہوا ہے۔ (تاریخ الخلفاء ص ۲۳۷)

ایک مرتبہ خطبہ دیتے ہوئے فرمایا:

"لوگو! تمہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ تمہارے باپ ایک غلطی کی وجہ سے جنت سے نکلے اور تمہارے رب نے توبہ پر جنت کا وعدہ فرمایا ہے۔ اس وجہ سے تمہیں گناہوں سے احتراز کرنا چاہیے اور اپنے رب سے اچھی امید رکھنی چاہیے۔ لوگو! دنیا کی ایک مقرر مدت ہے جو ختم ہو جانے والی ہے اور دنیا ایک ایسی امید ہے جس میں دن بدن نقص پیدا ہو رہا ہے اور تم کو دنیا کے علاوہ ایک دوسرے گھر میں جانا ہے اور تم ناک کی سیدھ میں موت کی طرف جا رہے ہو۔ اللہ اس پر رحم فرمائے جو اپنے معاملہ پر غور وفکر کرتا رہے اور اپنے نفس کا خیر خواہ بن جائے اور اپنے اللہ کے قانون کا پابند ہو جائے اور اپنے گناہ معاف کرا لے اور اپنا دل روشن کر لے"۔ (الکامل للمبرد جلد ۲ ص ۳۱۷)

رات رات بھر جاگ کر موت پر غور کیا کرتے تھے کہ یہ کس طرح تمام لذتوں کو ختم کر دیتی ہے اور قبر کی ہولناکیوں کا ذکر کر کے بے ہوش ہو جاتے تھے۔ ایک مرتبہ اپنے ہم جلیس سے فرمایا کہ میں تمام رات غور وفکر میں جاگتا رہا۔ اس نے پوچھا کس شے کے بارہ میں؟ فرمایا: "قبر اور اہل قبر کے متعلق۔ اگر تم مردے کو تین روز کے بعد قبر میں دیکھو تو انس ومحبت کے باوجود اس کے پاس جاتے ہوئے خوف زدہ ہو گے۔ پیپ بہہ رہی ہو گی اور اس میں کیڑے تیر رہے ہوں گے۔ بدبو پھیلی ہو گی۔ کفن بوسیدہ ہو چکا ہو گا۔ یہ کہہ کر روتے روتے ہچکی بندھ گئی اور بے ہوش ہو کر گر پڑے۔ ان کی اہلیہ پانی چھڑک کر ہوش میں لائیں۔

آپ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ جس نے موت کو اکثر یاد کیا اور تھوڑی دنیا پر راضی ہو گیا وہ کامیاب ہے۔ (سیر اعلام النبلاء جلد ۵ ص ۱۳۳)

Marfat.com

روایات میں ہے کہ آپ کو بچپن ہی سے موت کا خوف دامن گیر رہتا تھا۔ کم سنی میں بھی جب آپ کو موت کا خیال آتا تو زار و قطار رو پڑتے۔ ایک روز آپ کی والدہ کو پتہ چلا کہ آپ رو رہے ہیں اس وقت آپ قرآن حکیم کو سینے سے لگائے ہوئے تھے۔ آپ کی والدہ نے رونے کا سبب معلوم کرایا تو پتہ چلا کہ آپ موت یاد آنے سے رو رہے ہیں۔ یہ سُن کر والدہ بھی رونے لگی کیونکہ ان کو بھی موت یاد آ گئی اور اس لیے بھی کہ آپ کے بیٹے کو بچپنے ہی میں یہ خیال آ رہا ہے کہ موت سر پہ کھڑی ہے۔ (سیرۃ بن الجوزی ص ۱۹) شاید اس وجہ سے آپ کو ہر وقت موت کا خوف رہتا تھا کہ آپ نے اپنے ہاتھوں سے اپنے خاندانی خلفاء عبدالملک اور ولید اور سلیمان کو قبر میں اُتارا تھا۔ ان کے ناز و نعمت میں پلے ہوئے جسموں پر اپنے ہاتھوں سے مٹی ڈالی تھی۔ آپ اکثر خلوت میں رویا کرتے تھے اور آپ کی آہوں کی آواز سُنائی دیتی تھی اور آپ فرمایا کرتے تھے !ان تینوں خلفاء کے (عبدالملک، ولید اور سلیمان) بعد جن کو میں نے خود اپنے ہاتھوں سے مٹی میں چھپایا ہے۔ اس دفعہ میری باری ہے۔ ان تینوں کے علاوہ آپ نے اپنے بھائی سہیل، غلام مزاحم اور اپنے صاحبزادے عبدالملک کو بھی قبر کی آغوش میں اُتارا تھا۔ لیکن ان موتوں کے مصائب سے آپ شکستہ خاطر نہیں ہوئے تھے بلکہ ان موتوں نے آپ کے دل میں موت کے متعلق ایمان میں اضافہ کر دیا تھا اور آپ کو موت سے ایک قسم کی انسیت پیدا ہو گئی تھی اور اس کے ہر وقت منتظر رہنے لگے تھے۔ (سیرۃ ابن الجوزی ص ۱۸۳، ص ۱۹۱) موت سے انسیت کی وجہ سے آپ نے ہوس کا گرد و غبار جھاڑ دیا تھا۔ چونکہ آپ مصائب برداشت کرنے کے عادی بن گئے تھے اس لیے آپ نے اپنی ذاتی لذتوں اور خواہشوں کو عوام کو خوش حال اور فارغ البال بنانے کے لیے اور ان کے غصب شدہ حقوق ان کو واپس دلانے کے لیے قربان کر دیا تھا۔ آپ پر سوتے جاگتے ہر وقت ایمان ہی مستولی رہتا تھا۔ آپ کی نگاہ میں گوشہء قبر محض ایک زیارت گاہ تھا جس کے بعد مرنے والا جلد ہی اپنے اصلی گھر (جنت یا جہنم) کی طرف لوٹا دیا جاتا ہے۔ آپ کے شباب کی تازگی کو ختم کرنے والی چیز قبرستان کی زیارت سے بڑھ کر اور کوئی دوسری چیز نہ تھی۔ چنانچہ میمون بن مہران فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں آپ کے ساتھ قبرستان گیا۔ آپ قبریں دیکھ کر رونے لگے۔ پھر آپ نے میری طرف دیکھ کر فرمایا: یہ میرے خاندان کے بزرگوں کی قبریں ہیں۔ گویا انہوں نے دنیا میں عیش و آرام

Marfat.com

کیا ہی نہ تھا۔ ان پر بوسیدگی نے اپنے پنجے گاڑ دیے ہیں اور ان کے جسموں میں کیڑے مکوڑے تیر گئے ہیں۔ پھر آپ دیر تک روتے رہے۔

ہم بھی روز تلاوت قرآن حکیم کرتے ہیں لیکن ہم پر اس کی تلاوت کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ آپ تلاوت کرتے تو ان آیات پر جن میں قیامت کا ذکر ہے، پڑھ کر تڑپ اٹھتے۔ چنانچہ ایک بار گھر والوں نے دیکھا کہ ان کی اہلیہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی ہیں۔ بھائیوں نے رونے کی وجہ پوچھی۔ کہا: رات میں نے امیرالمومنین کو بڑی دل گداز حالت میں دیکھا۔ وہ نماز پڑھ رہے تھے۔ جب انہوں نے یہ آیت پڑھی کہ:

یوم یکون الناس کالفراش المبثوت ، وتکون الجبال کالعھن المنفوش

"جس روز انسان پراگندہ پتنگوں کی طرح ہو جائیں گے اور پہاڑ دھنی ہوئی اون کی طرح ہو جائیں گے۔"

تو چیخے پھر اچھلے اور اچھل کر اس طرح گرے کہ معلوم ہوا کہ دم توڑ رہے ہیں۔ پھر ایسے ساکن وساکت ہوئے، میں سمجھی کہ دم نکل گیا۔ ہوش میں آئے تو پھر نعرہ مارا۔ پھر اچھلے اور تمام گھر میں پھر پھر کر کہنے لگے "ہائے وہ دن جس روز انسان پراگندہ پتنگوں کی طرح اور پہاڑ دھنی ہوئی اون کی طرح ہو جائیں گے"۔ پھر گرے اور ایسی حالت ہو گئی کہ میں نے سمجھا کہ کام تمام ہو گیا۔ یہاں تک کہ موذن نے اذان دی تو ہوش میں آئے۔

(سیرت عمر بن عبدالعزیز ص ۱۹۰)

توکل

توکل ایک ایسا ملکہ ہے جو انسان کو ہر قسم کے خطرات سے بے پروا کر دیتا ہے۔ سیدنا عمر بن عبدالعزیزؒ مجسم توکل تھے اور اس توکل اور اعتماد علی اللہ نے ان کو ہر قسم کے خطرات سے یک قلم بے پروا کر دیا تھا۔ سیدنا معاویہؓ پر جب سے حملہ ہوا تھا اس وقت سے خلفاء نے اپنی حفاظت کے لیے بڑا اہتمام کیا تھا اور حالات کا تقاضا بھی یہ تھا، کیونکہ مختلف فرقوں کے پیدا ہونے سے خلفاء کے خلاف دشمنی کی ایک لہر دلوں میں پیدا ہو گئی تھی اس وجہ سے خلفاء کے لیے کئی سپاہی متعین رہتے تھے۔ سیدنا عمر بن عبدالعزیزؒ نے ان تمام خطرات

Marfat.com

سے بے پروا ہو کر ان تمام سپاہیوں کو اپنی حفاظت سے فارغ کر دیا تھا اور اللہ کی رضا پر صابر و شاکر ہو گئے تھے۔ چنانچہ ایک موقع پر آپ کے بہی خواہوں نے آپ سے عرض کیا کہ گذشتہ خلفاء کی طرح آپ بھی دیکھ بھال کر کھانا کھایا کریں اور دشمنوں اور مخالفین کے حملہ کی حفاظت کے لیے نماز میں پہرہ کا اہتمام کیا کریں۔ آپ نے ان حضرات کا یہ مشورہ سن کر فرمایا! ''ان لوگوں نے اپنی اتنی حفاظت کی پھر بھی ان کا کیا ہوا؟ کیا وہ مرے نہیں؟''۔ جب لوگوں نے زیادہ اصرار کیا تو فرمایا: ''اے اللہ! اگر میں تیرے علم میں روز قیامت کے علاوہ اور کسی دن سے ڈروں تو تو میرے خوف کو اطمینان نہ دلا''۔ (طبقات ابن سعد جلد ۵ ص ۲۹۴) اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو اللہ تعالیٰ پر کس قدر اعتماد تھا اور یوم آخرت کا کس قدر خوف۔ اس خوف نے آپ کو ہر قسم کے خوف سے بے نیاز کر دیا ہوا تھا۔

امام ذہبیؒ نے نقل کیا ہے کہ آپ کا روزانہ کا خرچ صرف دو درہم تھا۔ (سیر اعلام النبلاء جلد ۵ ص ۱۳۴) حالانکہ آپ اتنی بڑی سلطنت کے مالک تھے اور دنیا کا زہد اور بے رغبتی اتنی تھی کہ مالک ابن دینار کا قول ہے کہ لوگ میرے بارے میں کہتے ہیں کہ میں بڑا زاہد ہوں۔ فرمایا:

انما الزاهدعمر بن عبدالعزيز الذى اتته الدنيا فتركها

(سیر اعلام النبلاء جلد ۵ ص ۱۳۴)

''زاہد تو عمر بن عبدالعزیزؒ تھے کہ دنیا خود ان کے پاس آئی لیکن آپ نے اسے چھوڑ دیا۔''

دیانت وامانت

دیانت وامانت روزمرہ کے انفرادی لین دین میں بھی ہوتی ہے اور مسند اقتدار پر بیٹھ کر بھی دیانتداری سے کام لیا جاتا ہے۔ جب یہ صفت کسی شخص سے مفقود ہو جائے تو پھر اس کے انفرادی اور اجتماعی معاملات بھی مخدوش ہو جاتے ہیں۔ سیدنا عمر بن عبدالعزیزؒ کے فضائل اخلاق میں دیانت کا وصف نہایت اہم تھا۔ آپ سے پہلے خلفاء مسند اقتدار پر بیٹھ کر نظام حکومت کو دیانتداری سے نہیں چلاتے تھے اور قومی خزانہ پر اپنے آپ کو امین نہیں بلکہ مالک سمجھتے تھے۔ اس لیے قومی خزانہ کو اپنی خواہشات کی تکمیل کے لیے استعمال کرتے تھے۔

Marfat.com

آپ نے مسند خلافت پر بیٹھتے ہی مسلمانوں کے مال کی حفاظت میں وہی نمونہ پیش کیا جو سیدنا فاروق اعظمؓ اور سیدنا ابوبکرؓ وغیرہ نے پیش کیا تھا اور یہ ایسا نمونہ تھا کہ کسی قوم کی تاریخ میں ایسا نمونہ ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملے گا۔ اپنے پورے زمانہ خلافت میں آپ نے مسلمانوں کے بیت المال سے ایک حبہ کا بھی فائدہ اٹھانا گوارا نہ کیا۔ بلکہ اپنے آپ کو بیت المال کا مالک سمجھنے کی بجائے کسٹوڈین سمجھتے تھے اور اس کی پائی پائی کی حفاظت فرماتے تھے۔ روایات میں ہے کہ رات کو جب تک امور خلافت انجام دیتے تھے تو چراغ میں بیت المال کا تیل جلاتے تھے جب حکومت کا کام ختم ہو جاتا تو سرکاری چراغ گل کر کے اپنا ذاتی چراغ جلاتے تھے۔ (تاریخ الخلفاء ص ۲۳۷، طبقات ابن سعد جلد ۵ ص ۲۹۵)

بیت المال کی طرف سے فقراء اور مساکین کے لیے جو مہمان خانہ (دار الضیوف) تھا اس کے باورچی خانہ سے اپنے لیے پانی بھی گرم نہ کراتے تھے۔ ایک مرتبہ غفلت میں آپ کا ملازم ایک ماہ تک اس باورچی خانہ سے آپ کے وضو کے لے پانی گرم کرتا رہا۔ آپ کو جب معلوم ہوا تو اتنی لکڑی خرید کر اس باورچی خانہ میں داخل کرا دی۔ (طبقات ابن سعد جلد ۵ ص ۲۹۵) ایک دفعہ ایک غلام کو گوشت کا ٹکڑا بھوننے کا حکم دیا۔ وہ اسی مطبخ سے بھون لایا آپ کو پتہ چلا تو آپ نے اسے ہاتھ نہ لگایا اور غلام سے فرمایا! ''تم ہی کھالو یہ میری قسمت کا نہ تھا''۔ (سیرت عمر بن عبدالعزیز ص ۶)

یہ تو عمر بن عبدالعزیزؒ کی بات ہے جن کا تعلق خیرالقرون سے تھا، لیکن اس زمانہ میں بھی اللہ کے کچھ بندے ایسے ہیں جن میں اللہ تعالیٰ نے دیانت وامانت کی خصلت رکھی ہے۔ جی چاہتا ہے کہ ان حضرات کے بھی ایک دو واقعات یہاں نقل کر دوں اگرچہ یہ ایک جملہ معترضہ کے طور پر ہوگا۔ حضرت شیخ الحدیث مولانا ذکریا صاحب قدس سرہ اپنی آپ بیتی میں لکھتے ہیں۔ کہ حضرت سہارنپوریؒ (حضرت مولانا خلیل احمد صاحبؒ) کی خدمت میں ایک صاحب عزیزوں میں سے جو بڑے آدمیوں میں سے تھے، ملاقات کے لیے تشریف لائے۔ حضرت سبق پڑھا رہے تھے۔ اختتام سبق تک تو حضرت نے توجہ نہ فرمائی۔ سبق کے ختم کے بعد حضرتؒ اس کے پاس تشریف لائے۔ انہوں نے اصرار کیا کہ حضرت اسی جگہ تشریف رکھیں۔ حضرتؒ نے ارشاد فرمایا کہ مدرسہ نے یہ قالین اسباق پڑھانے کے لیے دیا ہے، ذاتی استعمال کے لیے نہیں۔ اس لیے اس قالین سے علیحدہ بیٹھ گئے۔

Marfat.com

مولانا ظہور الحق صاحب مدرس مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور اس زمانہ میں باورچی خانہ کے کھانے کے منتظم تھے اور چوبیس گھنٹے باورچی خانہ کے اندر ہی رہتے تھے۔ لیکن سالن چاول وغیرہ کا نمک کسی طالب علم سے چکھواتے تھے خود نہیں چکھتے تھے۔ جب وقت ملتا تو گھر جا کر کھانا کھا آتے۔ اسی طرح سے دیگر اکابر مدرسین کو میں نے کوئی شے مدرسہ کی چکھتے نہیں دیکھا۔

میرے والد محترم قدس سرہ (حضرت مولانا محمد یحییٰ کاندھلویؒ) کے زمانے میں مدرسہ کا باورچی خانہ جاری نہیں ہوا تھا۔ نہ مدرسہ کے قریب کسی نانبائی کی دوکان تھی۔ گھر والوں کے نہ ہونے کے زمانے میں جامع مسجد کے قریب ایک نانبائی کی دوکان تھی جس کا نام اسماعیل تھا۔ اس کے یہاں سے کھانا آیا کرتا تھا۔ سردی کے زمانے میں وہاں سے آتے آتے خصوصاً شام کو ٹھنڈا ہو جاتا تھا۔ تو سالن کے برتن کو مدرسہ کے حمام کے سامنے اندر نہیں بلکہ باہر رکھوا دیتے تھے۔ اس کی تپش سے وہ تھوڑی دیر میں گرم ہو جاتا تھا۔ تو یہ فرما کر دو تین روپے ہر ماہ چندہ کے اندر داخل فرمایا کرتے تھے کہ مدرسہ کی آگ سے فائدہ اٹھایا ہے۔

(آپ بیتی حصہ اول ص ۳۶۔۳۷)

یہ دو تین واقعات ہم نے اس لیے نقل کیے ہیں۔ کہ بعض دنیا کی لذات میں مگن لوگ کہتے ہیں کہ اتنی احتیاط کیسے ہو سکتی ہے۔ حالانکہ اگر کوئی احتیاط کرنا چاہے تو ہو سکتی ہے۔ لیکن یہ احتیاط اس وقت ہوتی ہے جب دل میں خوف آخرت ہو۔ آج کل کے مہتممین مدارس کو بھی ان واقعات پر غور کرنا چاہیے۔

ایک مرتبہ کہیں سے سیب آئے۔ سیدنا عمر بن عبدالعزیزؒ انہیں عام مسلمانوں میں تقسیم فرما رہے تھے۔ آپ کا چھوٹا بچہ ڈھیر میں سے سیب اٹھا کر کھانے لگا۔ آپ نے اس کے ہاتھ سے وہ سیب چھین لیا۔ وہ رونے لگا اور جا کر اپنی والدہ سے شکایت کی۔ ماں نے بازار سے سیب منگا دیے۔ سیدنا عمر بن عبدالعزیزؒ گھر آئے تو انہیں سیب کی خوشبو محسوس ہوئی۔ فوراً پوچھا: "فاطمہ! کوئی سرکاری سیب تو تمہارے پاس نہیں آیا؟" انہوں نے سارا واقعہ بیان کر دیا۔ کہ آپ نے ایک معصوم بچہ سے سیب چھینا۔ فرمایا: "خدا کی قسم! میں نے سیب ان کے منہ سے نہیں چھینا تھا اپنے دل سے چھینا تھا۔ لیکن یہ بات پسند نہ تھی کہ مسلمانوں کے حصہ کے ایک سیب کے بدلہ میں اللہ تعالیٰ کے حضور میں اپنے نفس کو برباد

Marfat.com

کروں"۔

روایات میں ہے کہ آپ کو لبنان کا شہد بہت پسند تھا۔ ایک مرتبہ آپ نے اس کی خواہش ظاہر کی۔ وفا شعار اہلیہ نے وہاں کے حاکم ابن معدی کرب کے پاس کہلا بھیجا۔ انہوں نے آپ کے لیے بہت سا شہد بھجوا دیا۔ فاطمہؒ نے اسے امیرالمومنین کو دیا کہ لیں یہ آپ کو بہت مرغوب ہے۔ آپ نے شہد دیکھ کر فرمایا! معلوم ہوتا ہے کہ تم نے ابن معدی کرب کے پاس کہلا بھیجا تھا۔ انہوں نے ہی یہ بھیجا ہے۔ میں اس کو ہرگز نہیں کھاؤں گا۔ چنانچہ کل شہد فروخت کر کے اس کے قیمت بیت المال میں داخل کر دی اور ابن معدی کرب کو لکھ بھیجا کہ تم نے فاطمہ کے کہلانے پر شہد بھیجا ہے۔ خدا کی قسم! اگر آئندہ تم نے ایسا کیا تو یاد رکھو تم اپنے عہدہ پر نہیں رہ سکتے اور میں تمہارے چہرہ پر نگاہ نہیں ڈالوں گا۔

(سیرت عمر بن عبدالعزیز ص ۱۵۸)

ایک مرتبہ آپ کی حاملہ اہلیہ کے لیے دودھ کی ضرورت تھی۔ خادمہ مہمان خانہ سے تھوڑا سا دودھ لے آئی۔ آپ نے پوچھا: یہ کیا ہے؟ اس نے کہا: "بی بی کے لیے دودھ کی ضرورت تھی۔ اگر انہیں دودھ نہ دیا گیا تو اسقاط کا اندیشہ ہے، اس لیے یہ دودھ مہمان خانہ سے لائی ہوں۔ یہ سُن کر خادمہ کا ہاتھ پکڑا اور چلاتے ہوئے اہلیہ کے پاس لائے اور کہا: حمل فقراء اور مساکین کے کھانے کے علاوہ اور کسی شے سے قائم نہیں رہ سکتا تو خدا اس کو قائم نہ رکھے۔ آپ کی یہ برہمی اور ناراضگی دیکھ کر اہلیہ نے دودھ واپس کر دیا۔

(طبقات ابن سعد جلد ۵ ص ۲۷۹)

عمرؒ نے جیسا سلوک اپنی اہلیہ سے کیا ویسا ہی اپنی والادہ سے بھی کیا۔ چنانچہ ایک مرتبہ آپ کی ایک بچی نے آپ کو ایک موتی بھیجا اور درخواست کی کہ میرے لیے اس جیسا ایک موتی بھیج دیں تاکہ میں اپنے دونوں کانوں میں ایک جیسے موتی پہن سکوں۔ آپ نے اس کے پاس دو انگارے بھیج دیے اور فرمایا: اگر تم یہ دونوں انگارے اپنے کانوں میں پہن سکتی ہو تو تمہارے لیے اس موتی جیسا دوسرا موتی بھیج دوں۔ (سیرۃ ابن عبدالحکم ص ۱۶۳)

اسی طرح آپ کے ایک صاحبزادے نے انگوٹھی کا ایک نگینہ ایک ہزار درہم میں خریدا۔ آپ کو پتہ چلا تو اسے لکھا: "تمہیں اللہ کی قسم! اس انگوٹھی کو جسے تم نے ایک ہزار میں خریدا ہے فوراً فروخت کر دو اور اس کی قیمت اللہ کے راستے میں دے دو اور ایک درہم کی

Marfat.com

دوسری انگوٹھی خرید لو جس پر یہ کندہ ہو:

"اللہ اس پر رحم فرمائے جو اپنا مرتبہ پہچانے"۔

والسلام

خلیفہ ہونے کے بعد آپ نے ایک مرتبہ اپنے غلام سے جس کا نام درہم تھا پوچھا: "لوگ کیا کہہ رہے ہیں؟" اس نے کہا: "لوگ کیا کہیں گے۔ عوام اور خواص سب مزے میں ہیں البتہ آپ سخت تکلیف میں ہیں"۔ عمرؒ نے پوچھا: کیوں۔ غلام درہم نے جواب دیا: آپ کو خلافت سے قبل معطر لباس میں عمدہ گھوڑوں پر بہترین لباس اور خوشگوار طعام سے دیکھا تھا لیکن خلافت کے بعد مجھے امید تھی کہ مجھے آرام ملے گا لیکن مجھ پر کام بڑھ گیا اور آپ بھی تکلیف میں ہو گئے۔

یہ جواب سُن کر عمرؒ نے اسے آزاد کر دیا اور فرمایا: "جاؤ جہاں تمہارا دل چاہے اور مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔ میں اسی حال میں خوش ہوں۔ امید ہے کہ اللہ تعالیٰ میرے لیے کوئی اور فراخ راہ کھول دے گا"۔

(سیرۃ ابن جوزی ص ۱۷۵، العقد الفرید جلد ۴ ص ۴۳۵)

عموماً ایسا ہوتا تھا کہ لوگ خلفاء اور امراء کو ہدایا اور تحائف بھیجا کرتے تھے اور اس کے بدلہ میں پھر ان سے جائز اور ناجائز کام لیتے تھے۔ اسی لیے بعض ہدیے رشوت ہوتے ہیں۔ چنانچہ ایک مرتبہ کسی شخص نے آپ کو سیب اور دوسرے کئی میوہ جات ہدیہ میں بھیجے۔ آپ نے واپس کر دیے۔ بھیجنے والے نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو ہدیہ قبول کر لیا کرتے تھے۔ آپ نے جواب دیا:

انّ الهدية كانت له هدية ، وهي اليوم لنا رشوة

(سیرت عمر بن عبدالعزیز ص ۱۲۰، سیر اعلام النبلاء جلد ۵ ص ۱۴۰)

"ہدیہ تو آپؐ کے لیے ہدیہ ہوتا تھا لیکن آج یہ ہمارے لیے رشوت ہے۔"

احتیاط کا آخری نمونہ آپ کا یہ واقعہ ہے۔ کہ اک دفعہ بیت المال کا مشک آپ کے سامنے لایا گیا۔ آپ نے ناک بند فرما لی تاکہ اس کی خوشبو نہ جانے پائے۔ لوگوں نے عرض کیا: "امیر المومنین! اس کی خوشبو سونگھ لینے میں کیا حرج ہے؟ فرمایا: مشک کا انتفاع یہی ہے"۔

(سیر اعلام النبلاء جلد ۵ ص ۱۳۶، سیرۃ عمر بن عبدالعزیز ص ۱۶۳، البدایہ والنہایہ جلد ۹ ص ۲۱۴)

Marfat.com

تکبر

علماء نے لکھا ہے۔ کہ نفس انسانی میں اکبر الرذائل تکبر ہے جو ایک اعتبار سے کفر سے بھی اشد ہے، اس لیے کہ کفر بھی دراصل تکبر ہی سے پیدا ہوا ہے، کیونکہ شیطان بھی شیطان اس تکبر ہی کی بدولت بنا۔ "وابیٰ واستکبر وکان من الکافرین"۔ کبر نام ہے صفات کمال میں اپنے کو دوسرے سے بڑھ کر سمجھنا اور بقول حکیم الامت تھانوی قدس سرہ قبول حق میں سب سے بڑا مانع تکبر ہی ہے (الرفیق ص ۸۵) اور حدیث میں اس کی بڑی مذمت آئی ہے۔ کہ رائی کے برابر بھی جس کے قلب میں تکبر ہوگا وہ جنت میں نہیں جائے گا۔ لیکن ترفع، تکبر، خودنمائی، خودرائی اور عدم مساوات وغیرہ امارت کے لوازمات میں سے ہیں۔ خود سیدنا عمر بن عبدالعزیز میں بھی مسند خلافت پر بیٹھنے سے قبل تمکنت تھی، خودرائی تھی اور ترفع تھا لیکن خلافت حاصل ہونے کے بعد وہ سراپا عجز و انکسار اور مساوات کا مجسمہ بن گئے تھے۔

جونہی آپ مسند خلافت پر براجمان ہوئے انہوں نے تمام شاہی امتیازات یک قلم ختم کر دیے اور فرمایا: "میں بھی عام مسلمان کی طرح ایک مسلمان ہوں"۔ آپ نے سرکاری پہرہ داروں کو تعظیم کے لیے اٹھنے کی مخالفت کر دی اور لوگوں نے دیکھا کہ وہ ان کے ساتھ برابر بیٹھتے تھے اور ان کی نشست و برخاست میں کوئی عدم مساوات کا پہلو نظر نہیں آتا تھا۔ (سیرۃ عمر بن عبدالعزیز ص ۶۸) عام دستور یہ تھا کہ خلیفہ وقت کو اگر کسی جنازہ میں شرکت کرنا ہوتی تو اس کے لیے الگ چادر بچھائی جاتی تھی۔ جب پہلی مرتبہ معمول کے مطابق آپ کے لیے بھی چادر بچھائی گئی تو آپ نے اس پر بیٹھنے یا کھڑے ہونے کے بجائے اس کو اپنے پاؤں تلے سے ہٹا دیا۔

لونڈی اور غلاموں سے اس زمانہ میں وہ سلوک نہیں کیا جاتا تھا جو عام آزاد لوگوں سے کیا جاتا۔ آپ نے ان سے یہ غیر مساویانہ سلوک ختم کر دیا اور آپ ان سے اتنا مساویانہ سلوک اور برتاؤ کرتے تھے کہ کبھی کبھی خود بھی ملازمین کی خدمت کرتے تھے جس طرح کہ ملازمین ان کی خدمت کرتے۔ روایات میں ہے کہ ایک مرتبہ ایک خادمہ آپ کو پنکھا جھل رہی تھی۔ پنکھا جھلتے جھلتے اس کی آنکھ لگ گئی۔ آپ نے جونہی اس کو سوتے دیکھا

Marfat.com

اس کے ہاتھ سے پنکھا لے کر اس کو جھلنا شروع کر دیا۔ اس کی آنکھ کھلی تو گھبرا کر چلائی آپ نے اس کو فرمایا: کوئی بات نہیں آخر تم بھی میری طرح ایک انسان ہو۔ تم کو بھی گرمی لگتی ہے۔ جس طرح تم مجھ کو پنکھا جھل رہی تھی میں نے بھی جھلنا مناسب سمجھا۔ (سیرت عمر بن عبدالعزیز ص ۱۷۲، البدایہ والنہایہ جلد ۹ ص ۲۰۸) آج ہے کوئی ایسا فرمانروا اس جمہوری دور میں جو اپنے ملازموں کے ساتھ یہ سلوک کرے۔

ملازمین کے آرام میں بھی خلل انداز ہونا آپ کو اچھا نہیں لگتا تھا کیونکہ ان کے لیے آرام کرنا بھی اتنا ہی ضروری ہے جتنا دوسروں کے لیے ضروری ہے۔ جب دیکھتے کہ کوئی ملازم سویا ہوا ہے یا آرام کر رہا ہے۔ تو ان اوقات میں آپ اپنا کام خود کر لیتے۔ چنانچہ ایک مرتبہ رجاء بن حیوہ سے ملاقات کچھ طویل ہو گئی اور رات زیادہ گذر گئی اور چراغ جھلملانے لگا۔ آپ کے پاس ہی ملازم سویا ہوا تھا۔ رجاء نے کہا: "امیر المومنین! اسے جگا دوں تا کہ یہ چراغ میں تیل ڈال دے"۔ آپ نے فرمایا "نہیں۔ اسے سونے دو سارے دن کا تھکا ماندہ ہے"۔ رجاء نے اب خود چراغ درست کرنے کا ارادہ کیا۔ آپ نے روک دیا کہ مہمان سے کام لینا مروت اور انسانیت کے خلاف ہے، اور خود اٹھ کر زیتون کا تیل لیا اور چراغ میں ڈال کر اس کو درست کیا۔ پھر آ کر فرمایا! "جب میں اٹھا تھا تب بھی امیر المومنین عمر بن عبدالعزیز تھا اور اب بھی امیر المومنین ہوں۔ میرے اس کام کرنے سے میری شخصیت میں کوئی فرق نہیں پڑا۔

(سیرت عمر بن عبدالعزیز ص ۱۷۳، البدایہ والنہایہ جلد ۹ ص ۲۰۳)

اس تواضع اور عجز و انکساری اور جذبہ مساوات کی وجہ سے ان لوگوں کو جو خلیفہ کے جاہ و جلال اور شان و شکوہ کے عادی تھے، آپ کو پہچاننے میں دقت ہوئی تھی۔ چنانچہ حکم بن عمرو الرعینی کا بیان ہے کہ سیدنا عمر بن عبدالعزیزؒ ایک حلقہ سے اٹھ کر جب دوسرے حلقہ میں بیٹھ جاتے تھے۔ تو اجنبی لوگ آپ کو پہچانتے نہ تھے۔ انہیں جب تک اشارہ یا کسی اور طریق سے بتایا نہ جاتا اس وقت تک وہ آپ کو پہچان نہ سکتے تھے۔

(سیرت عمر بن عبدالعزیز ص ۱۷۳، ۱۷۴)

ایک عام مغالطہ اور اس کا جواب

حافظ ابن تیمیہ نے ایک سوال اٹھایا ہے۔ کہ صحابہ کرامؓ اگرچہ مغفور اور غیر ماخوذ

Marfat.com

تھے لیکن ان کے بعد آنے والے حضرات مثلاً تابعین یا تبع تابعین بھی کسی صحابی رسولؐ سے افضل ہو سکتے ہیں؟ اس سوال کا جواب دیتے ہوئے آپ نے لکھا ہے کہ تمام علماء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ تمام صحابہ کرامؓ تمام تابعین عظامؒ سے افضل ہیں لیکن ان کی یہ افضیلت طبقاتی واجتماعی ہے یا انفرادی یعنی کیا طبقہ صحابہ طبقہ تابعین سے افضل ہیں یا صحابہ کرامؓ کا ہر ہر فرد تابعین کے ہر ہر فرد سے افضل ہے؟ اس سلسلہ میں حافظ ابن تیمیہؒ نے قاضی عیاضؒ کے دو قول نقل فرمائے ہیں۔ ان میں سے ایک قول یہ ہے کہ صحابہ کرامؓ کا ہر ہر فرد تابعین کے ہر ہر فرد سے افضل ہے۔ یہی بات عبداللہ بن مبارکؒ اور امام احمد بن حنبلؒ سے منقول ہے اور حافظ ابن حجرؒ اسی کو جمہور کا قول بتا رہے ہیں۔ (فتح الباری جلد ۷ ص ۶)

حافظ ابن تیمیہؒ جمہور کے اس قول کی دلیل ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ فضائل کا دارو مدار اعمال کی عددی قلت وکثرت پر نہیں بلکہ دلوں میں جاگزین ایمانی حقائق پر ہے اور ایمانی حقائق میں چونکہ صحابہ کرامؓ کا ہر ہر فرد بعد والے لوگوں کے ہر ہر فرد سے بڑھ کر ہے لہذا ان کا ہر ہر فرد بعد والے ہر ہر فرد سے افضل ہے۔ اس سلسلہ میں انہوں نے سیدنا عمر بن عبدالعزیزؒ اور سیدنا معاویہ بن ابی سفیانؓ کے زہد وعدل کی مثال دے کر یہ بات سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ اگرچہ عمر بن عبدالعزیز، سیدنا معاویہ سے زہد وعدل میں اعلیٰ تھے۔ لیکن اس کے باوجود افضل سیدنا معاویہ ہی ہیں اور سیدنا معاویہؓ کی افضلیت تو رہی ایک طرف بعض سلف نے تو یہاں تک کہا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جہاد کرتے ہوئے جو غبار سیدنا معاویہؓ کی ناک میں پڑا وہ بھی عمرؒ بن عبدالعزیز سے افضل ہے۔ (منہاج السنہ جلد ۳ ص ۱۸۳)

ہمارے نزدیک یہ بات خلاف واقعہ ہے۔ سیدنا عمر بن عبدالعزیزؒ لاکھ زاہد وعادل سہی لیکن وہ زہد وعدل میں سیدنا معاویہؓ سے بڑھ کر نہیں ہیں۔ البتہ یہ بات بعض حلقوں سے شہرت حاصل کر گئی ہے اور اس میں زیادہ تر ہاتھ سبائیوں کا ہے۔ اس بات کے خلاف واقع ہونے کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ سیدنا عمر بن عبدالعزیزؒ کا زہد وعدل میں سیدنا معاویہؓ سے بڑھ کر ہونا تو بہت دور کی بات ہے سیدنا عبداللہ بن مبارکؒ تو فرماتے ہیں کہ سیدنا معاویہؓ کے ناک کا غبار بھی عمر بن عبدالعزیزؒ سے افضل ہے۔

(البدایہ والنہایہ جلد ۸ ص ۱۳۹)

Marfat.com

۲۔ دوسری بات اس سلسلہ میں یہ ہے کہ مفضول کو اپنے سے کسی افضل پر جزوی فضیلت حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ دونوں ایک جنس سے ہوں، مثال کے طور پر ایک صحابی اگر دوسرے صحابی سے جزوی طور پر افضل ہے تو یہ بات مانی جاسکتی ہے، کیونکہ دونوں جنس صحابہ میں سے ہیں۔ لیکن اگر ایک غیر صحابی پر جزوی فضیلت ثابت کی جائے تو یہ درست نہیں اس لیے کہ ان دونوں کی جنس مختلف ہے۔ صحابی کو تو غیر صحابی پر فضیلت کلی حاصل ہے، لہذا اس کی جزوی فضیلت ثابت نہیں کی جاسکتی۔ ہاں ایک صحابی کی دوسرے صحابی پر ایک تابعی کی دوسرے تابعی پر جزوی فضیلت ثابت کی جاسکتی ہے، لیکن صحابی پر غیر صحابی کی جزوی فضیلت کسی طور بھی ثابت نہیں کی جاسکتی۔ کیونکہ جنس فضیلت میں جو افضل ہے وہی کلی طور پر افضل ہوگا اور جزوی طور پر بھی اسی کی فضیلت ثابت ہوگی۔ صحابیت فضیلت کی ایک جنس ہے اور تابعیت فضیلت کی دوسری جنس اور پہلی جنس دوسری جنس سے افضل ہے جیسا کہ قرآن وسنت سے ثابت ہے، لہذا یہ ہرگز نہیں ہوسکتا کہ ایک تابعی کسی صحابی پر کسی نوع فضیلت میں جزوی فضیلت حاصل کرلے کیونکہ صحابیت کی جنس فضیلت بھی بلاشک وشبہ تابعیت کی انواع فضیلت سے افضل ہیں۔ چنانچہ جس طرح ایک صحابی ایک تابعی سے افضل ہے ایسے ہی ایک صحابی کا نماز، روزہ، حج اور زکواۃ اور انفاق فی سبیل اللہ ایک تابعی کے انہی اعمال سے افضل ہے۔ اسی شے کو حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہ نے اپنے الفاظ میں بیان فرمایا ہے: ''صحابہ کرامؓ کا ہر فرد کل عالم کے مسلمانوں سے افضل ہے۔ کوئی غیر صحابی مسلمان کسی صحابی سے کسی کمال علمی میں اکمل تو ہوسکتا ہے لیکن افضل نہیں ہوسکتا کیونکہ افضلیت کا دار ومدار قبول عنداللہ پر ہے اور کمالات کی تحصیل اکتسابی اور اختیاری چیز ہے''۔ (ماہنامہ البلاغ، کراچی، بابت جمادی الاخریٰ ۱۳۹۱ھ)

سیدنا معاویہؓ بھی زاہد وعادل تھے لیکن ان کا زہد وعدل جنس صحابیت والا تھا۔ جب کہ عمر بن عبدالعزیزؒ تابعی تھے اور ان کا زہد وعدل جنس تابعیت سے تھا۔ جب دونوں کی جنس الگ الگ ہوگئی تو ان دونوں میں فضیلت کے اعتبار سے کوئی تقابل اور نسبت نہ رہی۔ اسی وجہ سے سیدنا عبداللہ بن مبارکؒ نے اس سوال کے جواب میں کہ سیدنا معاویہؓ اور عمر بن عبدالعزیزؒ میں سے کون افضل ہے؟ تو انہوں نے سیدنا عمر بن عبدالعزیز کی کسی جزوی فضیلت کو بیان کرنا تو ایک طرف رہا، یہ جواب دیا کہ'' سیدنا عمر بن عبدالعزیز تو سیدنا

Marfat.com

معاویہؓ کی خاک ناکؒ کے برابر بھی نہیں"۔ (البدایہ والنہایہ جلد ۸ ص ۱۳۹) چنانچہ یہی سوال جب عبداللہ بن مبارکؒ کے استاذ یا استاذ جیسے شخص سے پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا:

اتجعل رجلاً من الصحابة مثل رجل من التابعين

(البدایہ والنہایہ جلد ۸ ص ۱۳۹)

کیا تو ایک صحابی کو تابعی کے درجہ میں لانا چاہتا ہے۔

اور یہ جملہ انہوں نے غضبناک حالت میں کہا کیونکہ اس سوال سے انہیں بڑا تعجب ہوا کہ ایک تابعی اور ایک صحابی رسول کا تقابل کیا جا رہا ہے۔ پھر فرمایا: "معاویہؓ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی، آپؐ کے برادر نسبتی، آپؐ کے کاتب وحی اور آپ کی وحی کے امین تھے" اور اس تقابل کو انہوں نے ایک سب قرار دیتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث سنائی کہ

فمن سبهم فعليه لعنة الله والملائكة والناس اجمعين (البدایہ اولنہایہ جلد ۸ ص ۱۳۹)

"پس جو میرے صحابہؓ کو سب کرے اس پر اللہ، فرشتوں اور تمام انسانوں کی لعنت ہو۔"

اندازہ فرمائیں کہ وہ ایک صحابی اور تابعی کے تقابل کو صحابی کے حق میں سب قرار دے رہے ہیں۔ لہذا سیدنا عمر بن عبدالعزیز کو سیدنا معاویہؓ پر فضیلت قرار دینا صحابہ کے بارہ میں ایک سب کی حیثیت رکھتا ہے۔

۳۔ تیسری بات اس سلسلہ میں یہ ہے کہ سیدنا عمر بن عبدالعزیزؒ اگرچہ نہایت زاہد اور عادل تھے لیکن وہ سیدنا معاویہؓ سے کسی اعتبار سے بھی زیادہ عادل اور زاہد نہ تھے۔ نہ کمیت کے لحاظ سے اور نہ ہی کیفیت کے لحاظ سے۔ کمیت کے لحاظ سے تو اس طرح کہ سیدنا عمر بن العزیزؒ کو عدل کرنے کا موقع کتنے سال ملا؟ ان کی خلافت کی کل مدت اڑھائی سال ہے۔ مسند خلافت پر بیٹھنے سے قبل ان کی زندگی ایک عام انسانوں کی طرح تھی بلکہ ان کی زندگی عیش و نعم سے بھرپور اور مسرفانہ زندگی تھی۔ وہ ایک شاہی خاندان کے فرد تھے۔ ان کے والد ۲۱ سال مصر کے گورنر رہے تھے۔ وہ چاندی کا چمچہ منہ میں لے کر پیدا ہوئے۔ خلافت سے قبل ان کی زندگی نہایت مسرفانہ اور تمول و نعم والی زندگی تھی۔ جب وہ مدینہ

Marfat.com

کے گورنر ہوئے تو تیس اونٹوں پر ان کا ذاتی سامان گیا۔ لباس نہایت مسرفانہ ہوتا تھا۔ جس لباس پر ایک مرتبہ کسی کی نگاہ پڑ جاتی تھی پھر اسے نہ پہنتے تھے۔ خوشبو کا استعمال بھی وافر مقدار میں کرتے تھے۔ چنانچہ ڈاڑھی پر عنبر کو سفوف بنا کر چھڑکتے تھے اور رجاء بن حیوہ کا بیان ہے۔ کہ عمر بن عبدالعزیز اپنے زمانہ کے سب سے زیادہ خوش لباس، معطر اور تبختر کی چال چلنے والے تھے۔ لیکن جونہی خلافت کا بارگراں ان کے کاندھوں پر پڑا ان کی زندگی کا رُخ اور نقشہ بدل گیا۔ اب ان کو اپنی فکر نہ تھی بلکہ دوسروں کی فکر ہو گئی۔ اب اپنے عیش وآرام کا خیال نہ رہا بلکہ رعایا کے عیش وآرام کا خیال دل میں موجزن ہو گیا۔ اب وہ لباس، عطر، لونڈی، غلام اور تمام شاہی امتیازات سے دست کش ہو گئے۔ ایک دن کئی کئی مرتبہ لباس بدلنے والے کے پاس اب صرف ایک جوڑا تھا یہاں تک کہ مرض الموت میں بھی ایک قمیض کے علاوہ اور دوسری کوئی قمیض نہ تھی۔ نرم وملائم کپڑے پہننے والے کے پاس اب صرف ایک موٹا جھوٹا، میلا کچیلا، کھردرا اور پیوند زدہ لباس تھا اور اگر کبھی ملائم اور نرم لباس دیکھ لیتے تو فرماتے "مااحسنه لولالينة" یعنی کتنا اچھا ہے اگر یہ نرم وملائم نہ ہوتا۔

لیکن یہ کیفیت کتنے سال رہی؟ صرف اڑھائی سال اس کے برعکس سیدنا معاویہؓ ۸ھ میں دامن اسلام سے وابستہ ہوئے (مشہور روایات کے مطابق، لیکن اصل میں وہ صلح حدیبیہ کے موقع پر مسلمان ہوئے تھے) اور سنہ ۶۰ھ میں داعی اجل کو لبیک کہا۔ یعنی باون سال اسلام کے زیر سایہ زندگی گذاری۔ اس لحاظ سے باون سال اور سیدنا عمر بن عبدالعزیزؒ کا ۲ سال ۵ ماہ یعنی اڑھائی سال۔ اور اگر سیدنا معاویہؓ کا صرف دور اقتدار کا زہد وعدل ہی لیا جائے تو وہ بھی بیالیس سال بنتا ہے۔ یعنی ۱۸ھ سے ۶۰ھ تک۔ اس لحاظ سے سیدنا معاویہؓ کا عدل وزہد عمر بن عبدالعزیز سے سولہ گنا زیادہ بنتا ہے۔

اگر کیفیت کے لحاظ سے دیکھا جائے تو پھر بھی سیدنا معاویہؓ کا زہد عمر بن عبدالعزیزؒ سے زیادہ ہے۔ کیونکہ ایک تو آپ صحابی رسول تھے اور صحابہ کرامؓ کے بارہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔

لوان احدكم انفق مثل احد ذهباً مابلغ مد احدهم ولانصيفه

(مشکواۃ ص ۵۵۳، رواہ البخاری ومسلم)

"یعنی تم میں سے کسی کا احد پہاڑ جتنا سونا اللہ کی راہ میں خرچ کرنا صحابہ کرامؓ

Marfat.com

میں سے کسی کے ایک آدھ مد سونے کے برابر نہیں ہوسکتا۔"

اس کی وجہ یہ تھی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں اعمال کا حساب گنتی سے نہیں بلکہ وزن سے ہوتا ہے اور صحابہ کرامؓ کے اعمال اگرچہ تعداد میں تھوڑے ہوں لیکن کمال ایمان اور کمال اخلاص کی وجہ سے وزن میں تمام امت سے زیادہ ہیں۔ سیدنا معاویہؓ چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جلیل القدر صحابی ہیں، لہذا ان کے کمال ایمان اور کمال اخلاص کی وجہ سے ان کے چھوٹے اعمال بھی باقی امت کے بڑے بڑے اعمال سے بھاری ہیں۔ اسی حقیقت کو سیدنا عبداللہ بن مبارکؒ نے ان لفظوں میں فرمایا تھا:

تراب انف معاوية خير و افضل من عمر بن عبدالعزيز

(البدایہ والنہایہ جلد ۸ ص ۱۳۹)

سیدنا معاویہؓ کے ناک کی مٹی عمر بن عبدالعزیزؒ سے بہتر اور افضل ہے۔

اور حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی قدس سرہ صحبت نبوی کی فضیلت بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔ کہ صحبت کے برابر کوئی شے نہیں۔

فلا جرم صار خطاء معاوية خير من صوا بهما ببركة الصحبة وسهو عمرو بن العاص افضل من صوا بهما

(مکتوبات مجدد دفتر اول ص ۱۲۰)

"یعنی بے شک سیدنا معاویہؓ کی خطا بھی صحبت نبوی کی برکت سے اویس قرنیؒ اور عمر بن عبدالعزیزؒ کے صواب سے بہتر ہے اور سیدنا عمرو بن العاصؓ کا سہو بھی ان کے صواب سے افضل ہے۔"

۴۔ چوتھی بات اس سلسلہ میں یہ ہے۔ کہ سیدنا عمر بن عبدالعزیزؒ کا زہد وعدل کیا تھا؟ وہ یہ کہ انہوں نے بیت المال کو اپنا ذاتی خزانہ نہ سمجھا بلکہ اس کو اپنی رعایا کا حق قرار دیا۔ یہ زہد تو سیدنا معاویہؓ میں بھی تھا اور ان کا یہ خطبہ کتابوں کے اوراق میں آج تک محفوظ ہے کہ انہوں نے فرمایا:

"لوگو! سنو، تمہارے وظائف کی ادائیگی کے بعد بیت المال میں کچھ مال بچ گیا ہے۔ میں وہ بھی تم میں تقسیم کرنے لگا ہوں۔ اگر آئندہ سال بھی کچھ زائد مال آیا تو وہ بھی میں تم میں تقسیم کر دوں گا اور اگر نہ آیا تو مجھ پر ناراض نہ ہونا، کیونکہ

Marfat.com

یہ مال میرا مال نہیں ہے، بلکہ تمہارا ہی مال ہے جو اللہ تعالیٰ نے تم کو دلوایا ہے۔
(منہاج السنہ جلد ۳ ص ۱۸۵)

۵۔ پانچویں بات یہ کہ سیدنا عمر بن عبدالعزیزؒ بڑے زاہد ہیں۔ اس وجہ سے کہ انہوں نے اپنے اور اپنے اعزاء واقرباء کے قبضہ میں تمام اموال اور جاگیریں بیت المال میں واپس جمع کروا دیں۔ یہ کوئی اتنا بڑا کام نہیں ہے۔ وہ اموال اور جاگیریں تو پہلے ہی بیت المال اور مسلمانوں کی تھیں۔ ان اموال اور جاگیروں کو انہوں نے اگر بیت المال میں جمع کروایا تو اپنا ناجائز قبضہ انہوں نے چھوڑا گویا حق حق دار تک پہنچایا۔ یہ اگر زہد ہے تو میرے خیال میں ایسا کرنا تو ان پر شرعی طور پر واجب تھا۔ یہ ان کا زہد نہیں بلکہ عوام کا زہد تھا۔ لیکن اس کے برعکس سیدنا معاویہؓ نے اپنے ذاتی مال میں سے نصف مال بیت المال میں جمع کرانے کی وصیت فرمائی تاکہ بیت المال کا کوئی روپیہ پیسہ اگر ان کی طرف رہ گیا ہو تو اس کا حساب بے باق ہو جائے۔ چنانچہ حافظ ابن کثیرؒ نے لکھا ہے کہ:

ان معاوية لما احتضر اوصى بنصف ماله ان يرد الىٰ بيت المال (البدایہ والنہایہ جلد ۸ ص ۱۴۱)

"یعنی سیدنا معاویہؓ نے وفات کے وقت یہ وصیت فرمائی کہ ان کا نصف مال بیت المال میں جمع کرا دیا جائے۔ تاکہ ان پر مسلمانوں اور بیت المال کا کوئی استحقاق نہ رہ جائے۔ سیدنا معاویہؓ کا یہ زہد عمر بن عبدالعزیزؒ سے بدرجہا افضل اور بہتر ہے"۔

یہ تو زہد کا معاملہ تھا۔ جہاں تک عدل کا تعلق ہے۔ سیدنا معاویہؓ کا عدل بھی عمر بن عبدالعزیز کے عدل سے بہتر تھا۔ چنانچہ ایک مرتبہ امام اعمشؒ کی مجلس میں سیدنا عمر بن عبدالعزیزؒ کے عدل کا ذکر ہوا کہ وہ بہت عادل تھے۔ انہوں نے نظام عدل وانصاف رائج کیا۔ آقا وغلام کی تفریق مٹا دی اور لوگوں کے سامنے مساوات کا ایک نمونہ پیش کیا۔ یہ سن کر امام اعمشؒ نے فرمایا! "فکیف لو ادرکتم معاویة" یعنی تم لوگ عمر بن عبدالعزیزؒ کے عدل وانصاف کے بارہ میں رطب اللسان ہو اگر تم سیدنا معاویہؓ کا زمانہ پالیتے تو معلوم نہیں تمہارا کیا حال ہوتا؟ لوگوں نے کہا: آپ شاید ان کے حلم کی بابت فرما رہے ہیں۔ (کیونکہ سیدنا معاویہؓ کا حلم بھی بہت مشہور تھا) امام اعمشؒ نے فرمایا: "لا واللہ، بل

فی عدل نہیں، اللہ کی قسم! میں ان کے حلم کی نہیں بلکہ ان کے عدل کی بات کر رہا ہوں۔ (منہاج السنہ جلد ۳ ص ۱۸۵)

سیدنا عمر بن عبدالعزیزؒ اگر عادل ہیں کہ انہوں نے رعایا کی بلا امتیاز خیر گیری کی اور ظلم وجور کا ایسا انسداد کیا کہ ان کے زمانہ میں لوگ بڑے خوش حال ہو گئے اور ملک کے طول وعرض سے غربت وافلاس کا نام ونشان مٹ گیا۔ لوگوں کے لیے لنگر خانے جاری کیے۔ مجبور لوگوں کے لیے وظائف مقرر کیے، تو اس سے کہیں بڑھ کر سیدنا معاویہؓ کے عہد خلافت میں ہوا۔ آپ روزانہ مسجد میں تشریف لے جا کر رعایا کی شکایات سننے کے لیے بیٹھتے اور آپ کے پاس کمزور وناتواں، عورتیں اور بوڑھے غرضیکہ ہر طبقہ کے لوگ آتے اور اپنی اپنی شکایات بیان کرتے۔ آپ اسی وقت ان کی شکایات کے تدارک کا حکم فرماتے۔ بارگاہ خلافت میں تشریف لے جا کر آپ اشراف سے فرماتے کہ جو لوگ اپنی بعض وجوہات کی بنا پر مجھ تک نہیں پہنچ سکتے ان کی ضرورت مجھ سے بیان کیا کرو۔ (مروج الذہب جلد ۴ ص ۴۲۳)

آپ اتنی دور دور کے صوبوں پر قیام عدل اور رعایا کی دادرسی کی بدولت ہی کنٹرول کرتے تھے۔ چنانچہ مورخین نے لکھا ہے۔ کہ سیدنا معاویہؓ جب کرسی خلافت پر بیٹھتے تو کمزور، ناتواں، بدو، بچے، بوڑھے، عورتیں اور لاوارث لوگ آتے اور کہتے کہ مجھ پر ظلم کیا گیا ہے۔ آپ فرماتے کہ ان کی عزت کرو، کوئی کہتا کہ مجھ پر دست درازی کی گئی ہے تو آپ فرماتے کہ اس کی مدد کے لیے بھیجو اور اگر کوئی کہتا کہ مجھ پر زیادتی ہوئی ہے تو آپ فرماتے کہ اس کے معاملہ پر غور کرو۔

جب سردار ان قبائل اور اشراف کے ساتھ آپ تشریف فرما ہوتے اور معاملات پیش کیے جاتے تو بس اسی قسم کے جملے فرماتے کہ فلاں کو دے دو۔ ان سے معاہدہ کرو۔ انہیں دو۔ ان کی ضرورت پوری کرو۔ ان کی خدمت کرو وغیرہ وغیرہ۔ اس لیے کسی نے آپ کا برا نہیں چاہا۔ (مسعودی جلد ۲ ص ۵۱، ۵۲)

آپ کے قلب وذہن میں مخلوق خدا کی خدمت کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ آپ اپنی رعایا کو ہر لحاظ سے خوش حال دیکھنا چاہتے تھے۔ چنانچہ شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ اور ان کے شاگرد حافظ ابن کثیرؒ فرماتے ہیں:

"سیدنا معاویہؓ نے اپنے دور خلافت میں ہر قبیلہ کے لیے ایک ایک آدمی مقرر

Marfat.com

کیا ہوا تھا جو مختلف قبیلوں میں جا کر یہ معلوم کرتا کہ اس قبیلہ میں کوئی بچہ پیدا ہوا ہے کہ نہیں؟ کیا اس رات کوئی نیا واقعہ پیش آیا ہے یا نہیں؟ کیا کوئی مہمان قبیلہ فروکش ہوا ہے یا نہیں؟ وہ یہ اور اس قسم کی دوسری معلومات اکھٹی کر کے اپنے دفتر میں پہنچتا اور ان کے نام رجسٹر میں درج کرتا تا کہ حکومت کی طرف سے ان کا انتظام کیا جا سکے۔ (منہاج السنہ جلد ۳ ص ۱۸۵، البدایہ والنہایہ جلد ۸ ص ۱۳۴)

مختصر یہ کہ سیدنا عمر بن عبدالعزیزؒ کے زمانے میں جس قدر لوگ اور عوام وخواص خوش حالی کی زندگی بسر کر رہے تھے اس سے کہیں زیادہ سیدنا معاویہؓ کے دور خلافت میں لوگ خوش حالی کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ چنانچہ حافظ ابن کثیر نے سیدنا معاویہؓ کے دور خلافت کی تصویر ان الفاظ میں کھینچی ہے:

الجهاد فی بلاد عدو قائم، وكلمة الله عالية، والغنائم ترد اليه من اطراف الارض والمسلمون معه فی راحة وعدل وصفح وعفو (البدایہ والنہایہ جلد ۸ ص ۱۱۹)

(سیدنا معاویہؓ کے عہد خلافت میں) دشمن کے ممالک میں جہاد کا سلسلہ جاری تھا اور اللہ کا کلمہ بلند تھا اور غنیمتیں سلطنت کے طول وعرض سے سمٹ کر آپ کے پاس آتی تھیں اور مسلمان آپ کے دور خلافت میں عدل وانصاف اور راحت وآرام کے ساتھ اپنی زندگی کے دن گذارتے تھے۔

اور حافظ ابن تیمیہؒ نے لکھا ہے کہ:

"سیدنا معاویہؓ کا رعایا سے سلوک بہترین حکمرانوں کی طرح تھا اور آپ کی رعایا کو آپ سے انتہائی محبت تھی اور صحیحین کی حدیث سے ثابت ہوتا ہے۔ کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: کہ تمہارے بہترین امام اور حاکم وہ ہیں جن سے تم محبت کرو اور وہ تم سے محبت کریں، تم اس کے لیے دعائیں کرو اور وہ تمہارے لیے دعائیں کریں، اور تمہارے بدترین امام وہ ہیں جن سے تم بغض رکھو اور وہ تم سے بغض رکھیں اور تم ان پر لعنتیں بھیجو اور وہ تم پر لعنتیں بھیجیں"۔

(منہاج السنہ جلد ۳ ص ۱۸۹)

اور امیر علی نے اپنے تعصب کے باوجود لکھا ہے:

Marfat.com

On the whole Muawiyah's rule was prosperous and peaceful at home and successful abroad.

''مجموعی طور پر سیدنا معاویہؓ کی حکومت اندرون ملک بڑی خوش حال اور پُر امن تھی اور خارجی پالیسی کے لحاظ سے بڑی کامیاب وکامران تھی۔''

لہذا یہ کہنا کہ سیدنا عمر بن عبدالعزیزؒ کو زہد وعدل کے لحاظ سے سیدنا معاویہؓ پر ایک جزوی فضیلت حاصل ہے، سراسر غلط ہے اور سیدنا معاویہؓ کے مقام سے نا آشنائی ہے۔ یہ بات سبائیوں کی وضع کردہ ہے جس کا شکار کئی اہل سُنت بھی ہو گئے ہیں۔

☆☆☆
☆☆
☆

Marfat.com

سیدنا عمر بن عبدالعزیز

تاریخ کی روشنی میں

حکیم محمود احمد ظفر

Marfat.com